بسم الله الرحمن الرحيم

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

اکرم التفاسیر

وَقَالَ الَّذِيْنَ

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

19

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ

اکرم التفاسیر

وَقَالَ الَّذِينَ

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

بے شمار لوگوں کی اصلاح کا سبب بننے والی حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کی سمجھنے میں انتہائی آسان، فرقہ پرستی سے پاک اور موجودہ زمانہ کے مطابق لکھی ہوئی قرآن اردو تفسیر وٹس ایپ پر فری حاصل کریں۔

یاد رکھیں گناہ جہالت کا پھل ہوتا ہے اور یہ بڑی شرم اور بد بختی کی بات ہے اگر ہم ساری زندگی میں اتنا بھی نہ جان سکیں کہ قرآن میں لکھا کیا ہے۔ لیکن اب آپ کے پاس آسان طریقہ موجود ہے۔ قرآن کی تفسیر ہر وقت آپ کی جیب میں ہو گی اور آپ کو جب بھی دن میں فارغ وقت جہاں بھی حاصل ہو آپ کچھ صفحے روزانہ پڑھتے رہیں اس طرح کچھ ہی وقت میں آپ پورے قرآن کی تفسیر سمجھ سکتے ہیں جس سے آپ کے ہزاروں عقائد و اعمال کی اصلاح ہو کر شریعت کے مطابق ہو جائیں گے اور آپ کی دنیا اور آخرت دونوں جہاں بہترین ہو جائیں گے۔ ہر پارہ کی علیحدہ علیحدہ تفسیر موجود ہے۔

www.QuranTafseer.net

0092 323 520 5255

اپنے وٹس ایپ سے اوپر دیئے گے نمبر پر میسج کریں کہ آپ کو لکھی ہوئی تفسیر چاہیے۔ جبکہ ویب سائیٹ سے بھی آپ یہی تفسیر آڈیو، وڈیو اور تحریر کردہ حاصل کر سکتے ہیں۔

اپنے دوستوں رشتہ داروں سے یہ پوسٹ شئیر کر کے ڈھیروں ثواب حاصل کریں

از دلِ خیزد بر دلِ ریزد

اکثر احباب سوچتے ہوں گے اسرار التنزیل کے ہوتے ہوئے اکرم التفاسیر کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس بارے میں عرض کر دوں کہ نہ تو خود ثنائی کی پہلے کوئی تمنا تھی نہ اب ہے اور نہ ان شاء اللہ آئندہ ہوگی۔ نہ ہی یہ خیال دل میں آیا کہ مجھے کوئی بڑا عالم یا مفتی یا مفسرِ قرآن کہے نہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر کبھی اپنا وقت قربان کیا۔ ہاں! یہ خواہش ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم اور استاد المکرم حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی خصوصی توجہ سے جو علوم و معارف عطا فرمائے انہیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق تک پہنچاؤں اور اپنا فریضہ ادا کروں۔

ایک اور بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اپنے وقتِ نزول سے تا حال اور آئندہ تا قیامت بلکہ اس سے بھی آگے حساب و کتاب، جنت و دوزخ کی بات کرتا ہے اور تمام انسانیت کو راہنمائی اور ہدایت فراہم کرتا آیا ہے اور ان شاء اللہ کرتا رہے گا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اب اس کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ رسول اور نہ ہی کوئی کتاب یا صحیفہ اس لیے کہ تمام مخلوق کے مسائل کا حل اس میں موجود ہے۔ ہر زمانے کے لوگ اپنے اپنے حالات کے مطابق استفادہ کرتے آئے ہیں، آئندہ بھی کرتے رہیں گے اور یہ خصوصیت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے کلام ہی کی ہو سکتی ہے۔ پہلے وقتوں میں آج کی طرح نقل و حمل و رسل و رسائل کے مواقع اتنے نہیں تھے اس لیے ایک سے دوسری جگہ علوم و ایجادات پہنچنے میں سالہا سال لگ جاتے تھے۔

زمانہ حال کی جدید ایجادات اور خصوصاً الیکٹرانک ایجادات نے تو پوری دنیا کو ایک گھر کی صورت میں یکجا کر دیا یعنی Global Village اور سالوں کی مسافت سمٹ کر سیکنڈ کے ہزارویں حصہ تک آ گئی ہے اس لیے زمانے اور وقت کی رفتار بھی اتنی ہی تیزی سے تبدیل ہو

رہی ہے۔ آنے والے وقتوں میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی، ان کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی پر ایمان لانے والوں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ خصوصاً جدید علوم کے ماہرین اور سائنسدانوں کی کثیر تعداد اسلام کی حقانیت کا اعتراف کرتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہو رہی ہے اور یورپ میں تو بہت ہی اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔

بات کہاں سے کہاں تک چلی گئی! بات تو ہو رہی تھی اسرار التنزیل کے ہوتے ہوئے اکرم التفاسیر کے منظر عام پر آنے کی لہٰذا اسرار التنزیل کی اپنی ایک افادیت ہے۔ یہ 1971ء کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی معیت میں اپنے گھر کی حاضری کا شرف بخشا جس میں ساتھیوں کی کثیر تعداد بھی مقامِ ملتزم پر حاضر تھی۔ جس دربار سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹا' عطا و کرم کی اس بارش میں اہلِ بصیرت نے دیکھا کہ فہمِ قرآن کا پیغام قلب پر وجدان کی صورت میں نازل ہوا۔ اسی پیغام کو اہل دل کی امانت سمجھتے ہوئے سپردِ قلم کر دیا کہ شاید اپنے اہل تک پہنچ جائے۔

اسرار التنزیل کا انداز عام فہم اور اجمالی ہے جبکہ اکرم التفاسیر میں حالاتِ حاضرہ کے مطابق ذرا بحث کو وسیع کیا گیا ہے۔ یہ بات اہلِ علم پر عیاں ہے اور پڑھنے والوں کے لیے رشد و ہدایت کا موجب بنے گی۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے' نجاتِ اخروی کا سبب بنائے اور رضائے الٰہی نصیب فرمائے (آمین)

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

محمد اکرم

مولانا محمد اکرم اعوان
شیخ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ
دارلعرفان منارہ ضلع چکوال

امیر المکرم بحیثیت مفکرِ قرآن

یہ اعجازِ قرآن ہے کہ بدلتے ہوئے حالات و واقعات اور علوم میں ارتقاء کے باعث مفسرینِ کرام قرآنی علوم کی وہ جہتیں بھی آشکار کر رہے ہیں جو پہلے مفسرین کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔ اگر یہ قرآن وحدیث کی معین کردہ حدود کے اندر اور اللہ کے دین اور شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں تو یہ بھی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کا ہی پرتو ہے جو بطور علم لدُنّی ان علمائے ربّانی کو عطا ہوئے۔ امیر المکرم کے خطابات سے ماخوذ اکرم التفاسیر بھی فی زمانہ حالات و واقعات اور علوم جدیدہ کا احاطہ کرتے ہوئے علم لدُنّی کی ایسی روشن مثال ہے جس میں نہ صرف علوم مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ضیاء نظر آتی ہے بلکہ برکاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قلوب کو تحریک بخشتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

قرآن کے مضامین میں اس قدر وسعت اور تنوع ہے کہ ان کی کسی فہرست کو حتمی قرار دینا ممکن ہی نہیں لیکن قرآن حکیم کا ہر مضمون ایک نظریہ اور فکر کی بات کرتا ہے۔ امیر المکرم سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ قران میں کثرت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تذکرہ نظر آتا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ موسیٰ اور فرعون ہر زمانہ، ہر دور اور ہر معاشرے کے دو مرکزی کردار بھی ہیں جن کے مابین حق و باطل کا معرکہ مسلسل بپا ہے اور قرآن میں جا بجا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے حوالے سے حق و باطل کے اسی معرکے کا تذکرہ ہے۔ حق و باطل کا یہی معرکہ قرآن کا مرکزی مضمون ہے۔ گرانقدر علمی مباحث قرآن کی معروف تفاسیر کی زینت تو نظر آتے ہیں لیکن قرآن کے اس مرکزی مضمون یا بالفاظ دیگر ''فکرِ قرآنی'' پر بہت کم بات کی گئی۔

دشمنانِ اسلام آج کھل کر قرآن کی مخالفت پر تل گئے اور اس کے پیغام کو دبانے کے

لیے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں لیکن کیا وہ قرآن کے عائلی قوانین سے خائف ہیں، قانون وراثت سے پریشان ہیں، جنت ودوزخ یا ثواب وعذاب سے گھبرا رہے ہیں؟ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کفار کا تو ان پر ایمان ہی نہیں۔ آج ساری کی ساری طاغوتی قوتیں اس قرآنی فکر سے لرزہ براندام ہیں جو دائمی غلبہ حق کی نوید دیتی ہے اور امیر المکرم اسی قرآنی فکر کے نقیب ہیں۔ اکرم التفاسیر میں آپ نے اسی فکرِ قرآنی کو اجاگر کیا ہے' جو اس تفسیر کا طرہ امتیاز ہے۔

امیر المکرم کفار کے لیے اللہ تعالیٰ کے اٹل قانون قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ کی روشنی میں طاغوتی قوتوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ تمہارے لیے دائمی شکست کا فیصلہ فرما دیا گیا ہے اور ذلت ورسوائی تمہارا مقدر ہے۔ غلبۂ حق کو روکنا اب تمہارے بس کی بات نہیں۔ اپنے خطابات میں آپ بکھری ہوئی ملت کو دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ آؤ پھر کسی یکتائی سے عہد غلامی کرلو۔ تمہاری ذمہ داری کوئی ایک معاشرہ، قوم یا ملک نہیں بلکہ پوری انسانیت ہے۔ قرآن نے انقلاب دشمن سازشوں سے آگاہ کرتے ہوئے یہود کی طویل فردِ جرم بیان کی ہے جس میں انبیاء علیہم السلام سمیت اہلِ حق کے قتل کے جرائم بھی ہیں۔ امیر المکرم نے قرآنی فرمودات کی روشنی میں عالمی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے عصرِ حاضر میں یہود کے سازشی کردار کو اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ صیہونیت صرف عالمِ اسلام ہی کی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی دشمن نظر آتی ہے۔

یہ دور اسی فکرِ قرآنی کی پہچان کا دور ہے اور امیر المکرم نے بھرپور انداز میں اسے اجاگر کیا ہے۔ کفر اپنے لیے اس خطرے کو اس حد تک پہچان چکا ہے کہ عملی اقدام پر اتر آیا ہے لیکن حضرت امیر المکرم قرآن کی روشنی میں حالات وواقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے غزوۃ الہند کی نوید دے رہے ہیں۔ آپ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 12 کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''کفار کے لیے یہ آیۂ کریمہ قیامت تک کے لیے نوید شکست ہے اور میں بڑی بے باکی سے کہتا ہوں، پورے یقین، پورے ایمان سے منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بیٹھ کر کہہ رہا ہوں کہ دنیا کی کافر سپر طاقتیں پھر شکست سے دوچار ہوں گی اور ان شاء اللہ پھر غلبۂ اسلام ہوگا۔''

چونکہ تفسیر کا انداز بیانیہ ہے، تو امیر المکرم کے زوردار اندازِ بیان میں فکرِ قرآنی جب قاری تک پہنچتی ہے تو اس کے دل میں ایک تحریک بپا کر دیتی ہے، یہاں تک کہ اسے آنے والے انقلاب کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے۔

امیر المکرم نے فکرِ قرآنی کی بات کرتے ہوئے امت میں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھیلائی گئی اس غلط فہمی کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ حالات کو بدلنے کے لیے کسی امام مہدی کا انتظار کیا جائے۔ یہ موہوم امید افیون سے کم نہیں جس نے امت کو سلا دیا کہ اب کفر سے نبٹنا ہمارے بس کی بات نہیں اور یہ کام امام مہدی ہی کریں گے۔ حضرت کے خطبات بے عملی کی اس کیفیت سے بیداری کا پیغام ہیں کہ اُمت پہ ابھی بے بسی کا دور نہیں آیا۔ ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ ہے اور ہر فرد کو امام مہدی کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ امیر المکرم امام مہدی کی آمد کی بجائے غلبۂ حق کو بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔ یہی قرآنی فکر ہے جو ہر عہد میں حق و باطل کے معرکے کو مہمیز کرتی ہے' جو ہر دور میں خونِ مسلم کو گرم اور اُمتِ مسلمہ کو متحرک رکھتی ہے۔ امیر المکرم نے اکرم التفاسیر میں یہ فکر اس قدر نمایاں طور پر پیش کی ہے کہ وہ مفسرِ قرآن سے آگے مفکرِ قران نظر آتے ہیں اور یاد رہے! ہر انقلاب کے پیچھے کوئی مفکر ہوتا ہے۔

چھ جلدوں پر محیط تفسیر ''اسرار التنزیل'' کے حوالے سے امیر المکرم کی پہچان بطور مفسرِ قرآن تو مسلمہ ہے لیکن اب ''اکرم التفاسیر'' کی صورت آپ نے جس طرح قرآنی فکر کو اجاگر کیا ہے، آپ کا تعارف بطور ''مفکرِ قرآن'' حاوی نظر آتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مفکرِ قرآن امیر المکرم کو صحت اور عمر دراز عطا فرمائے کہ یہ بیانیہ تفسیر نہ صرف مکمل ہو بلکہ آپ انقلاب بپا ہوتا ہوا بھی دیکھیں۔

ابوالاحمدین

ابوالاحمدین

فہرست مندرجات

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
1	سورۃ الفرقان رکوع 3 آیات 21 تا 34	15
2	تفسیر و معارف	17
3	منکرینِ آخرت کا کردار:	17
4	وہ دن جب کفار کو بھی فرشتے نظر آئیں گے:	18
5	نیکی کا معیار:	19
6	کافر کے اچھے کاموں کی وقعت:	19
7	یومِ حشر کے چند احوال:	20
8	بُری رفاقت کا وبال:	21
9	ایک توجہ طلب نکتہ:	23
10	قرآنِ کریم سے لاتعلقی کا انجام:	24
11	قرآن سے دور ہونا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے عداوت ہے:	26
12	قرآنِ کریم کا تدریجی نزول اور حکمت:	27
13	ایک نکتہ:	28
14	جہالت کا جواب علم سے:	28
15	سزا از جنسِ اعمال:	29
16	حاصلِ کلام:	30
17	سورۃ الفرقان رکوع 4 آیات 35 تا 44	31
18	تفسیر و معارف	32
19	معترضین کا وطیرہ اور انجام:	32
20	قرآن کریم کی نظر میں گمراہی کا اصل سبب:	35
21	آخرت پر کمزور ایمان، ہر جرم کی بنیاد ہے:	36
22	کفار کا اندھا پن:	37
23	اچھائی کا معیار:	38
24	ہر دور کے گمراہ کا رویہ ایک سا:	39
25	حق اور گمراہی کا فیصلہ ہو جائے گا:	39
26	خواہش کی پیروی دراصل خواہش کو معبود کا درجہ دینا ہے:	40
27	آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ذمہ زبردستی منوانا نہیں ہے:	41
28	منکرینِ رسالت دراصل انسانی اوصاف ضائع کر چکے ہیں:	42
29	مغربی معاشرے کی اک جھلک:	43
30	ہمارا المیہ:	44
31	سورۃ الفرقان رکوع 5 آیات 45 تا 60	45
32	تفسیر و معارف	47
33	رشتوں کا توازن، نظامِ زندگی کی روانی کا سبب ہے:	47
34	نزولِ قرآن، رشتۂ زندگی نبھانے کے لیے ہے:	50
35	معلمِ انسانی (صلی اللہ علیہ وسلّم):	51
36	کفار کی پیروی کی ممانعت:	52

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
37	جہاد:	53
38	اللہ کریم کی قدرتِ کاملہ:	54
39	تخلیقِ انسانی اور رشتے:	55
40	ترتیب اور تدریج کائنات کا حُسن ہے:	56
41	کفار کی بدنصیبی:	56
42	آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا منصبِ عالی:	56
43	اجر کی امید صرف اللہ سے رکھنی چاہیے:	58
44	اللہ کی ذات ہی بھروسے کے لائق ہے:	59
45	اللہ کی تسبیح اور حمد کی حقیقی صورت:	59
46	اللہ کریم بندوں سے خود آگاہ ہیں:	60
47	نظامِ کائنات کی تخلیق میں حسنِ ترتیب:	60
48	'استوٰی عَلَی الْعَرْشِ' کا مفہوم:	61
49	معرفت رکھنے والوں سے پوچھو:	61
50	ناشکری فاصلے بڑھا دیتی ہے:	62
51	سورۃ الفرقان رکوع 6 آیات 61 تا 77	63
52	تفسیر و معارف	65
53	اجرامِ فلکی انسان کی خدمت پر مامور ہیں:	65
54	عِبَادُ الرَّحْمٰن اور اُن کے اوصاف:	67
55	پہلا وصف:	67
56	دوسرا وصف:	68
57	تیسرا وصف:	68
58	چوتھا وصف:	69
59	پانچواں وصف:	70
60	چھٹا وصف:	70
61	ساتواں وصف:	71
62	آٹھواں وصف:	72
63	نوواں وصف:	75
64	دسواں وصف:	76
65	گیارھواں وصف:	77
66	امام:	78
67	لمحہ فکریہ:	78
68	عِبَادُ الرَّحْمٰن کے لیے انعامات:	79
69	اللہ بے نیاز ہے:	80
70	سورۃ الشعرآء رکوع 1 آیات 1 تا 9	82
71	تفسیر و معارف	83
72	برائی کرنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو دکھ پہنچانا ہے:	83
73	اُمتیوں کے لیے مقامِ فکر:	85
74	ماننا وہی ہے جو اپنے اختیار سے مانا جائے:	86
75	رحمانیت ایمان سے مشروط ہے:	86
76	نظامِ کائنات توحیدِ باری پر گواہ ہے:	88
77	اسلام کے دعویداروں کے لیے مقامِ غور:	88
78	سورۃ الشعرآء رکوع 2 آیات 10 تا 32	91
79	تفسیر و معارف	93
80	واقعہ موسیٰ علیہ السلام:	93

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
81	اصل طاقت معیتِ باری ہے:	95
82	مناظرہ:	96
83	پیغمبرؑ کے دلائل:	97
84	موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ:	100
85	سورۃ الشعرآء رکوع 3 آیات 33 تا 51	101
86	تفسیر ومعارف	103
87	موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کا تسلسل:	103
88	انبیاؑ کے معجزات۔۔۔:	104
89	جادوگروں کا اندھیروں سے روشنی کا سفر:	105
90	نبیؐ سے خلوص کا تعلق، علم لدنی کا سبب:	108
91	سورۃ الشعرآء رکوع 4 آیات 52 تا 68	110
92	تفسیر ومعارف	111
93	نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مستقل نافرمانی پر عذاب کی ایک صورت:	112
94	برزخ کا عذاب:	115
95	رحمتِ رب العالمین بطفیل رحمۃ للعالمین:	116
96	سورۃ الشعرآء رکوع 5 آیات 69 تا 104	118
97	تفسیر ومعارف	120
98	قصہ ٔ ابراہیم علیہ السلام:	120
99	توحیدِ باری یہ ہے۔۔۔:	122
100	ربوبیتِ باری تعالیٰ:	123
101	خطاکاروں کے لیے نوید:	123
102	تمنائیں دعاؤں میں ڈھل گئیں:	123
103	ایمان وہ نعمت۔۔۔:	125
104	حقیقی رسوائی۔۔۔:	125
105	برکات نبوت سے ہی قلب سلیم ہوتا ہے:	126
106	سورۃ الشعرآء رکوع 6 آیات 105 تا 122	136
107	تفسیر ومعارف	137
108	حصول تقویٰ کی شرط، نبیؐ سے تعلق:	138
109	ایک فقہی مسئلہ:	140
110	خوش نصیبی اللہ کے تعلق پر منحصر ہے:	141
111	معیتِ رسالت، اتباعِ رسالت سے نصیب ہوتی ہے:	143
112	سورۃ الشعرآء رکوع 7 آیات 123 تا 140	146
113	تفسیر ومعارف	147
114	لفظ 'ارم' کا استعمال:	149
115	دنیوی شان وشوکت کی نمائش دل کو سخت کر دیتی ہے:	149
116	دل کی سختی کا علاج:	149
117	ترغیب کا ایک انداز:	150
118	قرآن کا ہر قصہ روشن دلیل ہے:	151
119	اجتماعی عذاب نہیں آتے لیکن۔۔۔:	151
120	سورۃ الشعرآء رکوع 8 آیات 141 تا 159	153
121	تفسیر ومعارف	154
122	قرآنِ کریم کا اندازِ نصیحت:	154
123	بعثتِ انبیاءؑ، اللہ کریم کا احسانِ عظیم ہے:	155

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
124	سب انبیاؑ کی دعوت ایک سی رہی:	156
125	دنیا کی نعمتیں عارضی ہیں:	157
126	گزشتہ اقوام اور ٹیکنالوجی:	158
127	ٹیکنالوجی کا حصول:	158
128	نبیؐ کی اطاعت کرو اور سرکشوں کی راہ پر نہ چلو:	159
129	آج کا المیہ:	160
130	لاجواب ہونے پر ثمود کی ہرزہ سرائی:	161
131	قومِ ثمود کا عجیب وغریب مطالبہ:	163
132	معجزے کی عظمت اور حرمت:	164
133	عذاب کو دعوت:	165
134	حاصل کلام:	165
135	سورۃ الشعرآء رکوع 9 آیات 160 تا 175	167
136	تفسیر ومعارف	168
137	انبیاء مقصدِ حیات سمجھاتے ہیں:	168
138	حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت اور قوم کا جواب:	169
139	حاصلِ کلام:	173
140	سورۃ الشعرآء رکوع 10 آیات 176 تا 191	174
141	تفسیر ومعارف	175
142	حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم:	175
143	لین دین میں بددیانتی فساد فی الارض کا سبب ہے:	177
144	وطنِ عزیز میں فساد اور اس کا حل:	178
145	قوم کا حضرت شعیب علیہ السلام سے مطالبہ:	179
146	سورۃ الشعرآء رکوع 11 آیات 192 تا 227	183
147	تفسیر ومعارف	185
148	عظمتِ قرآن:	185
149	دماغ اور عقل کا دائرہ کار:	187
150	روح کا دائرہ کار:	188
151	صرف عربی مقدس زبان ہے:	188
152	سورۃ النمل رکوع 1 آیات 1 تا 14	200
153	تفسیر ومعارف	202
154	کتابِ مبین:	202
155	خوشخبری کن کے لیے؟	203
156	ایک عجیب سزا:	205
157	قرآن کی عظمت:	206
158	حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ:	207
159	معجزاتِ موسیٰ علیہ السلام:	210
160	کفرِ جحودی:	211
161	سورۃ النمل رکوع 2 آیات 15 تا 31	213
162	تفسیر ومعارف	215
163	انبیاؑ کی دولت علم:	215
164	وراثتِ انبیاؑ:	218
165	جانوروں میں بھی شعور ہے:	220
166	اللہ کریم کا نظام:	221

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
167	چیونٹیوں سے بچاؤ کے لیے:	221
168	ادائے شکر کا سلیقہ:	222
169	لمحہ فکریہ:	224
170	مخلوق پر اللہ کی عطا:	225
171	رعایا کی خبر گیری:	225
172	ہُدہُد کی لائی ہوئی خبر:	226
173	قدرت باری کے مظاہر:	227
174	عورت کی حکومت:	228
175	سب سے بڑی بات:	228
176	خبر کی تصدیق کرنی چاہیے:	229
177	خط کے آداب:	230
178	سورۃ النمل رکوع 3 آیات 32 تا 44	232
179	تفسیر ومعارف	234
180	ملکۂ سبا کے حالات:	234
181	مشورہ کی اہمیت:	235
182	ملکہ کا حکیمانہ جواب:	236
183	معجزہ، کرامت، تصرف:	238
184	کتاب اللہ کا علم:	239
185	نعمتیں امتحان بھی ہیں:	241
186	اللہ بے نیاز ہے:	241
187	ملکہ سبا کی ذہانت:	241
188	انبیاؑ کا اصل کام:	242
189	ملکہ کا قبولِ اسلام:	243
190	اسلام کیا ہے:	244
191	اصل دین زندگی کے امور ہیں:	244
192	اسرائیلیات:	246
193	سورۃ النمل رکوع 4 آیات 45 تا 59	247
194	تفسیر ومعارف	249
195	حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت پر قوم کا جواب:	249
196	برائی پر اتفاق تباہ کن ہے:	250
197	ہر گمراہ ایک طرح سوچتا ہے:	251
198	فساد کرنے والوں کی تدبیر:	251
199	ایک قابلِ غور بات:	252
200	اللہ کی تدبیر:	253
201	عذاب اور نجات کا سبب:	253
202	قومِ لوط کی بے حیائی اور آج کا مغربی معاشرہ:	254
203	قومِ لوط کا جواب:	255
204	آج بھی یہی جواب دہرایا جاتا ہے:	256
205	نازک مقام:	256
206	قومِ لوط کا انجام:	257
207	حاصلِ کلام:	258
208	اللہ کا کوئی ہمسر نہیں:	258

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ط
اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (البقرہ:32)

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ مَنْ زَانَتْ بِهِ الْعُصُرُوْا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى حَبِيْبِهٖ

مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

پارہ 19 وقال الذین

سورۃ الفرقان رکوع 3 آیات 21 تا 34

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِىْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِىٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿۳۱﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا

جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿۳۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۳۴﴾

اور جولوگ ہمارے سامنے پیش ہونے کی امید نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نازل نہیں کیے گئے یا ہم (اپنی آنکھ سے) اپنے پروردگار کو دیکھ لیں یقیناً یہ اپنے خیال میں اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں اور اسی وجہ سے بڑے سرکش ہو رہے ہیں ﴿۲۱﴾ جس روز یہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس روز مجرموں کے لیے کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی اور کہیں گے (کاش تم لوگ) روک (بند کر) دیے جاؤ ﴿۲۲﴾ اور (اس دن) ہم ان (کفار) کے (اچھے) کاموں کی طرف (جو کبھی دنیا میں کیے ہوں گے) متوجہ ہوں گے تو ان کو اڑتی خاک کر دیں گے ﴿۲۳﴾ اس دن اہلِ جنت قیام گاہ میں بھی اچھے رہیں گے اور آرام گاہ میں بھی خوب اچھے ہوں گے ﴿۲۴﴾ اور جس دن آسمان ایک بدلی پر سے پھٹ جائے گا اور فرشتے بکثرت اتارے جائیں گے ﴿۲۵﴾ اس دن حقیقی حکومت رحمٰن (اللہ، ہی) کی ہوگی اور وہ کافروں پر بڑا سخت دن ہوگا ﴿۲۶﴾ اور جس دن ظالم (کافر) اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے گا کہے گا اے کاش! میں پیغمبر کے ساتھ (دین کی) راہ پر لگ گیا ہوتا ﴿۲۷﴾ ہائے شامت! کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا ﴿۲۸﴾ بے شک اس نے مجھے میرے پاس نصیحت (کتاب) کے آنے کے بعد اس سے بہکا دیا اور شیطان انسان کو (وقت پر) دغا دینے والا ہے ﴿۲۹﴾ اور (اس دن) پیغمبر عرض کریں گے کہ اے میرے پروردگار! بے شک میری قوم نے اس قرآن کو نظر انداز کر رکھا تھا ﴿۳۰﴾ اور اسی طرح ہم نے گناہگاروں میں سے ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا اور آپ کا پروردگار ہدایت دینے اور مدد فرمانے کے لیے کافی ہے ﴿۳۱﴾ اور کافر لوگ یوں کہتے ہیں کہ ان پر یہ قرآن ایک ہی بار کیوں نازل نہیں کیا گیا اس طرح (آہستہ آہستہ اس لیے نازل فرمایا گیا) کہ اس سے ہم آپ کے دل کو قائم رکھیں اور (اسی لیے) ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر اتارا ہے ﴿۳۲﴾ اور یہ

لوگ آپ کے پاس جو اعتراض کی بات لاتے ہیں، ہم آپ کے پاس (اس کا) معقول اور خوب وضاحت سے جواب بھیج دیتے ہیں ﴿۳۳﴾ جو لوگ اپنے مونہوں کے بل دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے ان ہی لوگوں کا ٹھکانہ بھی بُرا ہے اور وہ راستے سے بھی بھٹکے ہوئے ہیں ﴿۳۴﴾

تفسیر ومعارف

منکرینِ آخرت کا کردار:

فرمایا: وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾ اور جو لوگ ہمارے سامنے پیش ہونے کی امید نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نازل نہیں کیے گئے یا ہم (اپنی آنکھ سے) اپنے پروردگار کو دیکھ لیں، یقیناً یہ اپنے خیال میں اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں اور اسی وجہ سے سرکش ہو رہے ہیں۔

یہاں کفار کی بات ہو رہی ہے کہ یہ ایسے جاہل ہے کہ آخرت کے محاسبے کا یقین ہی نہیں رکھتے۔ انہیں اللہ کے حضور پیش ہونے پر اعتبار ہی نہیں ہے۔ یاد رہے کہ آخرت سے غفلت گناہ کا بہت بڑا سبب ہے اور اس سے ناامیدی کفر میں لے جاتی ہے۔

کفار کہتے ہیں: لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ۔۔۔ ہم پر فرشتہ کیوں نازل نہیں ہوتا، بھلا یہ کیا بات ہے کہ ان پر فرشتہ وحی لاتا ہے، ان سے بات کرتا ہے، آخر ہم بھی انسان ہیں۔ ہم پر فرشتہ کیوں نہیں نازل ہوتا؟ یا پھر: اَوْ نَرٰى رَبَّنَا۔۔۔ اللہ ہمارے سامنے آجائے کہ ہم اللہ کو دیکھ لیں، ہم اللہ کی بات سُن لیں وہ ہمارے ساتھ کیوں بات نہیں کرتا؟

فرمایا: لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾ ان کے دلوں میں تکبر سما گیا، اپنی بڑائی میں مبتلا ہو گئے ہیں، دوسروں سے خود کو بہت بڑا سمجھنے لگے ہیں۔ اسی زعم کی وجہ سے انہوں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا ہے کہتے ہیں کہ اگر ان پر فرشتہ نازل ہوتا ہے تو ہمارے پاس کیوں نہیں آتا۔ ہم بھی تو ویسے ہی ہیں، خاندانی ہیں بڑے دانشمند، معتبر اور امیر کبیر لوگ ہیں ہم پر بھی فرشتہ نازل

ہونا چاہیے تھا۔اپنے تکبر کے باعث یہ کہتے ہیں کہ اللہ کریم ہمارے سامنے کیوں نہیں آجاتے۔

نبوت بہت بڑا، نہایت اعلیٰ اَوْلیٰ مقام ہے۔انبیاؑ کو ایک خاص درجے کا تزکیہ، طہارت اور نفاست حاصل ہوتی ہے۔اُنؑ کے وجودِ عالی بھی نہایت پاکیزہ طیّب اور طاہر ہوتے ہیں اور اُنؑ کی ارواحِ مبارکہ بھی نہایت لطیف بہت ہی منوّر اور نورانی ہوتی ہیں۔اس لطافتِ قلبی کے باعث انہیں فرشتہ نظر آتا ہے یا فرشتہ ان سے ہمکلام ہوتا ہے، ان پر القائے الٰہی ہوتا ہے لیکن اس لطافت اور پاکیزگی کے باوجود اس دنیا میں انہیں دیدارِ باری نہیں ہوتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی درخواست کی تھی: رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ۔۔۔اے میرے پروردگار! مجھے اپنا دیدار کرا دیجیے کہ میں آپ کو دیکھ لوں، فرمایا: قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ (الاعراف:143) ارشاد ہوا، آپ مجھے ہرگز نہ دیکھ سکیں گے۔اس دنیا میں اس عالمِ آب وگِل میں اس نگاہ سے آپؑ مجھے نہیں دیکھ سکتے۔

یہ کفار اپنے آپ کو اتنا بڑا سمجھتے ہیں، ان میں اتنا تکبر ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کریم ہمارے سامنے کیوں نہیں آجاتے یا فرشتہ ہم سے بات نہیں کرتا صرف اِنؑ سے کرتا ہے، ہمیں کچھ نہیں سمجھتا! فرمایا: لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ۔۔۔یہ ان کے اپنے دل اور نفس میں تکبر کے باعث ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں ہے ان کا اپنے آپ کو بڑا سمجھنے سے یہ بڑے ہو نہیں جاتے۔تکبر دل کے امراض میں سے ہے اور اس کا حقیقی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔متکبر اپنے طور پر اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتا رہتا ہے حالانکہ دارِ دنیا میں شاید اس کی کوئی حیثیت بھی نہ ہو۔ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِیْرًا ﴿۲۱﴾ اس تکبر کی وجہ سے یہ سرکش ہو رہے ہیں، انکار اور گناہ کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

وہ دن جب کفار کو بھی فرشتے نظر آئیں گے:

آج تو کفار سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑی حیثیت رکھتے ہیں اور اُن کی بڑی شان ہے لیکن وہ وقت بھی آرہا ہے جب یہ فرشتوں کو دیکھیں گے۔فرمایا: یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ۔۔۔جس روز یہ فرشتوں کو دیکھیں گے۔

ایک دن آئے گا جب یہ فرشتے دیکھ لیں گے۔عندالموت بھی جب مرنے والے کی توجہ دنیا سے ہٹ کر برزخ کی طرف ہو جاتی ہے تو اسے فرشتے نظر آنے لگ جاتے ہیں۔روح قبض ہونے کے بعد سب کو نظر آنے لگ جاتے ہیں تو برزخ اور میدانِ حشر میں سب دیکھ سکیں گے البتہ جس دن دیکھیں گے فرمایا: لَا بُشْرٰى یَوْمَىِٕذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ۔۔۔اس روز مجرموں کے لیے کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی۔یہ جو گھبرا رہے ہیں کہ ان کے سامنے فرشتہ کیوں نہیں آتا، جس دن ان کے سامنے فرشتے آئیں گے تو دارِ عمل ختم ہو چکا ہوگا، اعمال کرنے کا موقع ختم ہو چکا ہوگا اور جزا و سزا کا لمحہ آن پہنچا ہوگا۔فرشتوں کو دیکھ کر انہیں کوئی خوشی نہ ہوگی بلکہ یہی لوگ تب کہیں گے، وَیَقُوْلُوْنَ حِجْرًا

مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾ (کاش تم لوگ) روک (بند کر) دیے جاؤ۔

اس دن یہ لوگ کہیں گے کاش یہ فرشتے ہمارے سامنے نہ آئیں، دور ہٹ جائیں اور اللہ انہیں دور لے جائیں۔ عندالموت بھی جب فرشتہ نظر آتا ہے تو ان کے لیے پھر کوئی خوشی کی خبر نہیں رہتی۔ کافر کے لیے یہ خوشی کا موقع نہیں ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۔۔۔ (الانفال:50) اور اگر آپ (اس وقت) دیکھیں جب فرشتے کافروں کی جان قبض کرتے جاتے ہیں تو اُن کے مونہوں پر اور اُن کی پشتوں پر مارتے جاتے ہیں۔ اور انہیں دوزخ کے لباسوں میں لپیٹ کر مار پیٹ کر گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔ سو فرمایا، فرشتے تو تمہارے سامنے آجائیں گے لیکن اس دن تمہارے لیے یہ خوشخبری نہیں ہوگی بلکہ تم چلاؤ گے کہ اللہ انہیں ہم سے بہت دور کردے۔

نیکی کا معیار:

دنیا میں بعض اوقات کافر اور بدکار بھی اچھے کام کر گزرتے ہیں۔ رفاہِ عامہ کے کام کردیتے ہیں، غریبوں کی مدد کردیتے ہیں۔ وطنِ عزیز میں ہندوؤں کے بنائے ہوئے اسپتال اب تک چل رہے ہیں جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ حق یہ ہے کہ کافر جو کام کرتا ہے اپنی پسند سے، خواہشِ نفس سے کرتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر دنیوی مفادات ہی ہوتے ہیں اس لیے کہ آخرت کا تو وہ قائل ہی نہیں ہے چنانچہ وہ آخرت کے لیے تو عمل نہیں کرے گا۔

دراصل نیکی تب نیکی بنتی ہے جب اُسے اللہ اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت سمجھ کر کیا جائے اور مقصد رضائے باری کا حصول ہو۔ وہی کام اگر اپنی مرضی یا نفس کی خواہش سے کیا جائے تو وہ نیکی نہیں بنتا کیونکہ نفس کی خواہش آخرت یا رضائے باری کی نہیں ہوتی۔

کافر کے اچھے کاموں کی وقعت:

فرمایا: وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾ اور (اُس دن) ہم ان (کفار) کے (اچھے) کاموں کی طرف (جو کبھی دنیا میں کیے ہوں گے) متوجہ ہوں گے تو اُن کو اُڑتی خاک کردیں گے۔

جن کاموں پر کافروں کو بڑا فخر ہوگا جب اللہ کریم اُن کی طرف متوجہ ہوں گے تو اُن کاموں کو خاک کی طرح اڑا دیا جائے گا۔ یہ اس لیے کہ اُن کاموں میں اللہ کی اطاعت نہیں ہوگی، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع نہیں ہوگا۔ کافر اگر کوئی نیکی کرتا ہے تو کسی دنیوی مقصد کے لیے کرتا ہے، حصولِ زر کے لیے، حصولِ شہرت کے لیے یا حصولِ اقتدار کے لیے کرتا ہے۔ اللہ کریم جتنا چاہتے ہیں اتنا اس نیکی کے بدلے میں دولت، شہرت یا اقتدار دنیا میں

اُسے لوٹا دیتے ہیں۔ نیکی بہر حال ضائع نہیں جاتی اور کافر کی نیکی اُسے دنیا میں ضرور لوٹا دی جاتی ہے۔ کافروں کے ایسے کام ہوں گے جن پر انہیں بڑا فخر اور بھروسہ ہوگا لیکن یومِ آخرت اُن کی وقعت یہ ہوگی کہ جب ذاتِ باری اُن کی طرف متوجہ ہوگی تو وہ دھول کی طرح اڑا دیے جائیں گے۔

یومِ حشر کے چند احوال:

کفار کے مقابلے میں وہ لوگ جنہیں جنت نصیب ہوگی بہت عیش میں ہوں گے۔ فرمایا: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾ اس دن اہلِ جنت قیام گاہ میں بھی اچھے رہیں گے اور آرام گاہ میں بھی خوب اچھے ہوں گے۔ کفار کے مقابلے میں اہلِ جنت کو بہت اچھے گھر، اچھی آرام گاہیں نصیب ہوں گی۔ انہیں عمدہ کھانے نصیب ہوں گے اور وہ ان آرام گاہوں میں مزے سے آرام کر رہے ہوں گے۔

فرمایا: وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾ اور جس دن آسمان ایک بدلی پر سے پھٹ جائے گا اور فرشتے بکثرت اتارے جائیں گے۔

اس دن آسمان ایک بدلی پر سے یا بدلی کی طرح پھٹ جائے گا اور فرشتوں کا نزول ہوگا۔ آج تو کافر اعتراض کر رہے ہیں کہ وحی لانے والا فرشتہ اُن کے پاس کیوں نہیں آتا اُن سے بات کیوں نہیں کرتا لیکن میدانِ حشر میں اُن کی یہ تمنا بھی پوری ہو جائے گی۔ اس روز ایک نہیں بلکہ بے شمار فرشتے نازل ہوں گے اور یہ دیکھ رہے ہوں گے۔ سب اقرار کر لیں گے: اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾ اس دن حقیقی حکومت رحمٰن (اللہ ہی) کی ہوگی اور وہ کافروں پر بڑا بھاری دن ہوگا۔

اس روز سب اقرار کریں گے کہ حقیقی بادشاہی صرف اللہ کی ہے جو بہت بڑا مہربان ہے۔ جس کی رحمت کے صدقے دنیا کی بے پناہ نعمتیں کفار نے بھی پائیں، زندگی، صحت، اولاد، اقتدار پایا، اتنی نعمتیں پائیں جو شمار میں نہیں لائی جا سکتیں لیکن آج پتا چلا کہ باقی ساری حکومتیں سارے اقتدار عارضی، وقتی اور محدود تھے۔ ہمیشہ ہر چیز پر ہر طرح کا اختیار رکھنا یہ شان اُسی کو سزاوار ہے جو دنیا میں رحمٰن تھا۔ رحمٰن اور رحیم کا مادّہ ایک ہے یعنی رحمت لیکن مفہوم الگ الگ ہیں۔ رحمانیت کا اظہار اس عارضی مقامِ دارِ دنیا میں ہے جس کے طفیل انسان، حیوان مومن کافر، نیک و بد سب دنیوی نعمتوں سے یکساں مستفید ہوتے ہیں۔ اس صفت کا اظہار جب تک دنیا قائم ہے، ہوتا رہے گا۔ رحیمیت کا ظہور ازلی، ابدی اور دائمی ہے جنہیں اس سے حصّہ نصیب ہوتا ہے انہیں دنیا میں نورِ ایمان نصیب ہوتا ہے نیک اعمال کرنے کی توفیق نصیب ہوتی ہے اور آخرت میں بھی عزت، عظمت اور مغفرت نصیب

ہوگی، اللہ کریم کا قرب نصیب ہوگا۔

اس وقت کافروں کو یاد آئے گا کہ اللہ تو رحمٰن بھی ہے جس کی رحمانیت سے انہوں نے دنیا میں بڑی نعمتیں پائی تھیں اور آج اُسی رحمٰن کی بادشاہی ہے تو اُسے پکاریں گے کہ تُو تو رحمٰن تھا۔ اللہ کریم فرمائیں گے کہ جب رحمٰن تھا تو تم نے فکر نہیں کی رحیمیت کا دامن نہیں تھاما، تم نے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلّم کا دامن نہیں تھاما تو آج رحمانیت تمہارے لیے ختم ہوگئی۔ اب تم محروم رہ گئے۔ چنانچہ وہ دن کافروں پر بہت بھاری ہوگا اُن کے لیے بہت مشکل بن جائے گا۔

بُری رفاقت کا وبال:

فرمایا: وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾ اور جس دن ظالم (کافر) اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے گا، کہے گا اے کاش! میں پیغمبر کے ساتھ (دین کی) راہ پر لگ گیا ہوتا۔

جب میدانِ حشر قائم ہوگا فرشتے نظر آ رہے ہوں گے اور حقائق سامنے آجائیں گے سورج سوا نیزے پر ہوگا اور زمین تانبے کی طرح تپ رہی ہوگی اور کفار دیکھیں گے کہ اس عالم میں بھی کچھ لوگ بڑے مزے سے ٹھنڈی چھاؤں میں ہیں۔ یہ لوگ خوبصورت تختوں پر بیٹھے ہیں اور انہیں مشروبات پیش کیے جا رہے ہیں، اُنہیں دیکھ کر کفار حسرت سے اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کر کہیں گے کہ کاش ہم نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کا دامن تھاما ہوتا اور اُن کا بتایا ہوا راستہ اختیار کیا ہوتا۔ کفار اپنی اس بدبختی کا سبب بتائے گا اور کہے گا، يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ ہائے شامت! کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا۔

انسان جیسے لوگوں کی صحبت میں رہتا ہے، جن کے ساتھ رہتا ہے اُن لوگوں کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ اس وقت کفار خیال کریں گے کہ کاش! ہم نے بھی دنیا میں نیک لوگوں کی صحبت اختیار کی ہوتی! کاش! ہم نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا۔

جس شخص کی دوستی نے گمراہی کے راستے پر ڈالا ہوگا، اس کے بارے حسرت سے کہے گا کہ کاش! اس سے دوستی نہ کی ہوتی کہ اس کے ساتھ رہنے سے میرا ایمان بھی خراب ہوا اور اعمال بھی خراب ہو گئے۔ گویا بدکار کی دوستی برائی کی طرف لے جاتی ہے، فرمایا: لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ۔۔۔ بے شک اس نے مجھے میرے پاس نصیحت (کتاب) کے آنے کے بعد اس سے بہکا دیا۔

برے دوست سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہے گا کہ اس نے نزولِ قرآن کے بعد بھی، کلامِ الٰہی کے موجود ہوتے ہوئے بھی مجھے اس سے محروم کر دیا، سیدھی راہ سے بھٹکا دیا۔ قرآن کچھ کہتا رہا، میں کچھ اور کرتا رہا اور زندگی بھر اس سے بیگانہ رہا، غرض وہ برے دوست کی دوستی پر پچھتائے گا اور کہے گا کہ اس نے تو مجھے اللہ کے کلام سے دور کر دیا حالانکہ اللہ کا کلام موجود تھا۔ اللہ کریم نے ایسا انتظام بھی فرمایا ہے کہ روئے زمین پر قرآن کی طرف دعوت دینے والے موجود ہیں۔ مساجد میں علماء قرآن بیان فرما رہے ہیں، لوگ گھر گھر جا کر تبلیغ کر رہے ہیں۔ بے شمار ذرائع سے قرآن کی تعلیمات کا چشمہ فیض جاری رہتا ہے رکتا ہی نہیں، انسان ہی اس سے غافل ہو جاتا ہے اس کی بات نہیں سنتا جس کا بہت بڑا سبب بدکار کی صحبت ہے جس کا اقرار کافر کرتا ہے۔

علمائے حق نے یہاں تفصیل سے بحث فرمائی ہے اور لکھتے ہیں کہ یہ صرف کافروں کے لیے نہیں ہے بلکہ مومنوں سے، مسلمانوں سے بھی جواب طلبی ہوگی کہ تم نے قرآن کو دیکھا تھا، کیا اس کے احکام کے بارے جاننے کی کوشش کی، اسے سیکھنے کی کوشش کی اور عمل کرنے کی سعی کی؟

عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ بچپن میں والدین یا مسجد میں مولوی صاحب سے قرآن پڑھ لیا جائے ختم کر لیا جائے پھر اسے غلاف میں لپیٹ کر رکھ دینا ہے۔ اب تو یہ بھی قِصّہ پرانا ہو گیا آج تو پڑھنے کا تکلف بھی کم ہی کیا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں یہ اہتمام کیا جاتا تھا کہ بچوں کو پہلے دنیوی تعلیم کے ساتھ قرآن بھی پڑھایا جائے لیکن اب صرف وہی بچے پڑھتے ہیں جو دینی مدارس میں جاتے ہیں۔ سکول، کالج جانے والے اِلا ماشاء اللہ، کم ہی پڑھتے ہیں۔ قرآن کو پڑھ کر رکھ دینا اور پھر ساری زندگی سمجھنے کی اور نہ ہی عمل کی کوشش کرنا، سب سے بڑی محرومی ہے۔ مومن کو چاہیے کہ وہ ہر روز قرآن سے اپنے دل کو زندہ رکھے۔ بے شک کم پڑھے مگر روزانہ پڑھے، سمجھنے کی کوشش کرے البتہ زیادہ پڑھے تو اچھا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے: عن عبداللہ بن عمرو، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اقْرَأِ الْقُرْآنَ فِي شَهْرٍ. قَالَ: قُلْتُ: إِنِّي أَجِدُ قُوَّةً. قَالَ فَاقْرَأْهُ فِي عَشْرٍ. قَالَ: قُلْتُ: إِنِّي أَجِدُ قُوَّةً. قَالَ: فَاقْرَأْهُ فِي سَبْعٍ وَلَا تَزِدْ عَلَى ذَلِكَ (صحیح مسلم) ترجمہ: عبداللہ بن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، پورا قرآن ایک ماہ میں مکمل کرو۔ میں نے کہا مجھ میں اس سے زیادہ کی طاقت ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر دس دن میں تلاوت مکمل کرو۔ میں نے عرض کی مجھ میں اس سے زیادہ کی طاقت ہے۔ فرمایا سات دن میں مکمل کر لو اور سات دن سے کم میں نہیں۔

بات چل رہی تھی کہ کافر کہیں گے کہ اس برے دوست نے تو کہیں کا نہیں چھوڑا میرے پاس اللہ کا کلام، اللہ کا ذکر، اس کی یاد آئی اللہ کی باتیں آئیں لیکن اس نے مجھے اس سے محروم کر دیا۔ اللہ کریم فرماتے

ہیں: وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾ اور شیطان انسان کو (وقت پر) دغا دینے والا ہے۔

بات ہو رہی تھی بدکار کی دوستی کی لیکن اللہ کریم نے بات کو شیطان کی طرف موڑ دیا کہ بدکار بھی شیطان کا نمائندہ ہوتا ہے۔ جو شخص برائی کی دعوت دے، گناہ کی طرف راغب کرے، حرام کی طرف راغب کرے اور اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی نافرمانی کی طرف بلائے وہ نہ صرف شیطان کا نمائندہ ہے بلکہ شیطان ہی بن جاتا ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ ۔۔۔(الانعام:112) ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے شیطان (سیرت) انسانوں اور جنوں کو دشمن بنا دیا تھا۔

گویا جنّات میں سے بھی شیطان ہیں اور انسانوں میں سے بھی شیطان ہیں اور ہر شیطان کا مقصد صرف انسان کو ذلیل کرنا ہے، خواہ دوستی کر کے خواہ دشمنی سے۔

ایک توجہ طلب نکتہ:

اگر بدکار کی دوستی برائی کی طرف لے جاتی ہے تو نیک لوگوں سے تعلق نصیب ہو جائے تو یہ نیکی کی طرف لے جاتا ہے۔ روزِ قیامت جو خیال کریں گے کہ کاش ہم نے بھی نیک لوگوں کی صحبت اختیار کی ہوتی، ایسے لوگوں کے پاس بیٹھتے جو ہمیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے راستے پر لے جاتے۔ یہاں سے پیری مریدی کا مسئلہ سمجھ میں آتا ہے۔ اس آیۂ کریمہ سے یہ راہنمائی ملتی ہے کہ نیک لوگوں کے ساتھ تعلق جوڑا جائے تو وہ اس راستے پر لے جاتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بتایا ہے۔ پیری مریدی میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے شخص کے ہاتھ پر بیعت کی جائے جو خود اللہ کا نیک بندہ ہو، ہدایت یافتہ ہو، اللہ سے ڈرتا ہو اور راہنمائی کی اہلیت رکھتا ہو۔ روزمرہ کے معمولات سے آگاہ ہو، حلال حرام، جائز ناجائز سے آگاہ ہو۔ شیخ یا پیر کا کام یہ ہے کہ وہ ہمیں اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف لے جائے۔ پیر وہی ہے جو خود ہدایت پر قائم ہو اور ہمیں بھی راہِ ہدایت کی طرف لے جائے جو دنیا اور آخرت میں سرفرازی کا سبب ہے اور عزت و آرام کا باعث ہے۔ شیخ ایسا ہو جس کی صحبت اور تربیت سے اللہ کی رضا حاصل ہو اور جنت نصیب ہو، یہی مرید ہونے کا مقصد ہے۔ مرید کو چاہیے کہ پیر سے پوچھے کہ اللہ کی رضا کا راستہ کون سا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی خوشنودی کس میں ہے اور پیر یا شیخ اُسے یہ بتا سکے۔ اب جس شخص کی دوستی سے، راہنمائی سے اللہ کی رضا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع اور جنت نصیب ہو جائے تو اس سے بڑی کسی نعمت کا تصور ہے؟ اس سے زیادہ کوئی کیا چاہتا ہے!

دنیوی تعلقات قائم کرتے وقت بھی، رشتے جوڑتے وقت بھی دین ضرور دیکھنا چاہیے۔ عموماً شادی کے معاملے میں، بچوں یا بچیوں کے رشتے دیکھتے ہوئے ہر بندہ یہ دیکھتا ہے اس کے پاس دولت کتنی ہے، عہدہ کیا ہے،

جاگیر کتنی ہے؟ یہ بہت کم دیکھا جاتا ہے کہ اس میں دینداری بھی ہے یا نہیں حالانکہ بنیادی طور پر پہلے دین دیکھنا چاہیے اور پھر دنیوی حالت پرکھنی چاہیے۔

دوستی اور تعلق بناتے وقت بھی دیکھا جائے کہ کیا یہ بندہ اس قابل ہے کہ اس کی دوستی فائدہ دے گی۔ اگر وہ بدکار ہے، بے دین ہے، سود خور ہے، رشوت خور ہے تو پھر اس کی دوستی تو لے ڈوبے گی لہٰذا اس سے بچنے میں ہی عافیت ہے۔ ایک افسوس ناک روّیہ جو بہت رواج پا چکا ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے پیروں کو حاجت روا سمجھنا شروع کر دیا ہے، مشکل کشا سمجھتے ہیں۔ ہندوؤں کی طرح پیروں کی پوجا شروع کر دی ہے کوئی پاؤں چومتا ہے کوئی ہاتھ چومتا ہے۔ قبروں پر چراغ جلائے جا رہے ہیں پھولوں کے غلاف چڑھائے جا رہے ہیں۔ قبروں کو سجدے کیے جا رہے ہیں اور نہ جانے کیا کیا پکارا جا رہا ہے۔

پیر سے یہ امید رکھی جاتی ہے کہ فلاں میرا پیر ہے اس لیے میرا بیٹا پیدا ہوگا، میرا کاروبار چل جائے گا۔ فلاں میرا پیر ہے تو میں بیمار نہیں ہوں گا، مجھے عہدہ مل جائے گا۔ یہ سب تو اللہ کے کام ہیں۔ یہ پیر کا مصرف نہیں ہے کہ وہ حاجت براری کرے۔ اقتدار، دولت اولاد تو کافروں کے پاس بھی ہیں جن کو کلمہ تک نصیب نہیں اُن کا کون پیر ہے؟ یہ پیر فقیر کا کام نہیں بلکہ اللہ کریم کی اپنی تقسیم ہے۔

ایک دلچسپ واقعہ بتاتا چلوں ایک وزیر صاحب جو متعدد بار وزیر رہ چکے ہیں دارالعرفان ملاقات کے لیے آئے۔ اُن کی جیب میں ایک آیتِ مبارکہ تھی جو نہایت خوبصورتی سے لکھی گئی تھی اور وہ مشورہ لینے آئے تھے کہ کسی نے انہیں یہ دی تھی کہ اس کا وظیفہ کرنے سے وہ وزیر اعظم بن جائیں گے اور وہ پوچھنا چاہتے تھے کہ یہ درست ہے؟

میں نے کہا کہ کیا آپ نے یہ نہیں سوچا کہ وظیفہ بتانے والا خود وظیفہ کر کے وزیر اعظم کیوں نہیں بن جاتا آخر ملک کا سب سے بڑا عہدہ ہے آپ کو کیوں بتا رہا ہے؟ اگر اس آیت کے وظیفے سے وزارتِ عظمیٰ مل سکتی ہے تو وہ خود یہ وظیفہ کرتا آپ کو نہ بتاتا۔ وہ بھی جانتا ہے کہ اس نے پیسے لے کر آپ کو ایک کھیل پکڑا دیا ہے۔ یہ بات سمجھ لیں کہ یہ وزارت، عہدے سب اللہ کی تقسیم ہیں۔ وزیر ہونے پر شکر کریں اور کیا چاہتے ہیں لیکن یہ کھرا جواب انہیں پسند نہ آیا۔

قرآنِ کریم سے لاتعلقی کا انجام:

میدانِ حشر میں تو سب بے دین، بدکار، گناہگار مسلمان سب ہی عرش عظیم کا سایہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلّم پر دیکھیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا لوائے حمد دیکھیں گے جس کے سائے میں بادِ بہاری چل رہی ہوگی۔

میدانِ حشر میں بھی جن پر پھول برس رہے ہوں گے جبکہ دوسری طرف آگ برس رہی ہوگی تو جو برائے نام کلمہ گو تھے وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف بھاگیں گے کہ ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اُمتی ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کریم کی بارگاہ میں عرض پیش کریں گے کہ بارِالٰہا: وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ اور (اس دن) پیغمبر عرض کریں گے کہ اے میرے پروردگار! بے شک میری قوم نے اس قرآن کو نظر انداز کر رکھا تھا۔

عرصہ محشر میں لوگ بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف بھاگیں گے تو ارشاد ہوگا کہ انہیں میرے پاس نہ آنے دیا جائے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگیوں سے قرآن کو الگ کر دیا۔انہوں نے زندگی بھر قرآن کو پڑھا نہ قرآن کو سمجھا اور نہ ہی قرآن پر عمل کی تکلیف گوارا کی۔یہ بہت مشکل گھڑی ہوگی۔

آج تو ہمارے پاس فرصت نہیں ہے کہ ہم قرآن کو پڑھیں اس کے احکام پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ آج ہم مصروف ہیں اور یہ بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ اس آیہ کریمہ کا مفہوم کیا ہے لیکن ایک دن آئے گا جب قرآن سے لاتعلقی بہت مہنگی پڑے گی۔اس میں جہاں کافر و منکر کے لیے وعید ہے وہاں ان مسلمانوں کو بھی خبردار کیا گیا ہے جو قرآن کو مانتے تو ہیں لیکن اس پر عمل نہیں کرتے۔آدمی تھوڑی دیر کے لیے الگ بیٹھ کر اس نقشے کو سوچے، دل میں تصور کرے کہ قیامت قائم ہے ایک طرف سورج آگ برسا رہا ہے، جہنم چیخ اور گرج رہی ہے اور اس کی آگ جوش کھا رہی ہے۔زمین تانبے کی طرح تپ رہی ہے، لوگ بے حال ہیں انہیں گندھک کے لباس جن میں آگ بھڑک رہی ہے پہنائے جا رہے ہیں۔پانی پیتے ہیں تو کھولتا ہوا ہے، درد ہو رہا ہے۔فرشتے رسوا و ذلیل کر رہے ہیں مار رہے ہیں اور الٹے گھسیٹ کر دوزخ کی طرف لے جا رہے ہیں۔

دوسری طرف جنت ہے، اُس کی خوشبوئیں ہیں، ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں باد بہاری چل رہی ہے لوگ بہت خوش اور مطمئن ہیں۔آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلّم کا جھنڈا مبارک 'لوائے حمد' ہے جس پر رحمتِ الٰہی کا نزول ہو رہا ہے۔پھر ایسا کون ہوگا جو اس کی طرف نہیں بھاگے گا لیکن جب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے یہ ارشاد ہو جائے گا کہ اے پروردگار! ان لوگوں کو میری طرف بڑھنے سے روک دے اور دوسری طرف لے جا کہ انہوں نے اپنی زندگیوں سے قرآن کو خارج کر دیا تھا۔اس قوم نے قرآن سے جدائی اختیار کر لی تھی، اپنی زندگی سے نکال دیا تھا تو کتنی حسرت ناک بات ہوگی۔اگر اس پر آج غور کریں تو شاید ہمیں اندازہ ہو جائے کہ قرآن کو پڑھنا، سمجھنا اور اس پر عمل کرنا کس قدر ضروری ہے اور کرنا چاہیے۔

ہماری عجیب بدنصیبی ہے کہ ہم قرآن کو پڑھتے بھی ہیں تو عملیات کی کتاب سمجھ کر دنیا کے لیے پڑھتے ہیں۔یہ سورۃ پڑھو تو اولاد ملے گی، یہ سورۃ پڑھو تو کاروبار چمک اٹھے گا یہ سورۃ پڑھو تو ڈر نہیں لگے گا، قرآن تو عمل کی کتاب ہے،

ایمان وعقیدے کی کتاب ہے جو بندے کو اس کے ربّ سے جوڑ دیتی ہے تو پھر جس کام کے لیے ہے اس سے وہ کام کیوں نہیں لیتے ہو؟ اگر بندے کا اللہ سے تعلق قائم ہو جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے تعلق قائم ہو جائے تو اسے اور کیا چاہیے؟ قرآن زندگی کا نصاب ہے۔ جہاں تک دنیوی ضروریات کا تعلق ہے تو ہر ایک کی روزی مقرر ہے، صحت و بیماری بھی مقرر ہے، زندگی اور موت مقرر ہے اور اس سب سے ہم نے گزرنا ہے۔ صحت و بیماری، تنگی، فراخی، جوانی بڑھاپا، عروج وزوال یہ سب آئے گا، موت بھی آئے گی دیکھنا یہ کہ ہمارا تعلق ربّ کریم سے ہے یا نہیں۔ ہمیں اللہ کی اطاعت نصیب ہے یا ہم نافرمانی کرتے ہیں۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کر رہے ہیں یا ہم اس بارگاہ میں بھی گستاخیاں کر رہے ہیں۔

شاعری کی ایک صنف ہے جسے نعت کہتے ہیں، اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے اوصافِ حمیدہ اور عظمت بیان کی جاتی ہے۔ آج ہمارا یہ عالم ہے کہ نعتوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی عظمت کا بیان نہیں ہوتا بلکہ اپنی ضرورتوں کا تذکرہ ہوتا ہے کہ میری یہ مصیبت ٹل جائے، میرا وہ کام ہو جائے۔ حق یہ ہے کہ تم اطاعت کا دامن تو تھام کر دیکھو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع تو کرو، غلام بنو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اپنے عقیدے کی خبر لو کہ عقیدہ درست نہ ہو تو اعمال کی بنیاد نہیں ہوتی، انسان ہوا میں قلعے بناتا رہتا ہے۔ صحیح عقیدے کے ساتھ اعمال سنت کے مطابق کر لو تو دیکھو گے کہ دکھ میں بھی سکھ ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ مومن کے پاؤں میں اگر کانٹا بھی چبھ جائے تو اس کے صدقے میں اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں، درجات بلند ہوتے ہیں۔ (مفہوم)

اطاعتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلّم میں دکھ بھی سکھ کا باعث بن جاتے ہیں، بیماری اور تکلیف بھی تلافیٔ مافات اور ترقیٔ درجات کا سبب بن جاتی ہے لیکن اگر وہ دامن ہاتھ میں نہ ہو تو نہ صرف ہر مصیبت پریشانی کا باعث ہوتی ہے بلکہ دنیا کی خوشیاں بھی پریشان کر دیتی ہیں۔ اولاد راحت پہنچانے کی بجائے عذاب بن جاتی ہے۔ اللہ سے دوری میں اقتدار بھی ملے تو مصیبت بن جاتا ہے اور ہر طرف سے لعنتیں اور گالیاں پڑ رہی ہوتی ہیں۔ لوگوں کے دلوں سے احترام اٹھ جاتا ہے۔

سو قرآن سے دوری دنیا اور آخرت میں رسوائی کا سبب ہے اور بہت بڑی محرومی ہے کہ قیامت کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ایسے لوگوں سے لاتعلق ہو جائیں گے۔

قرآن سے دور ہونا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے عداوت ہے:

بات صرف اتنی نہیں ہے کہ لوگ قرآن کو مان کر اس پر عمل نہیں کرتے یا مان نہیں رہے محروم رہ جائیں گے، بات محرومی کی نہیں ہے بلکہ قرآن کو نہ ماننا نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ دشمنی ہے۔ اللہ کے دین کو نہ ماننا یہ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ دشمنی ہے۔ فرمایا اس طرح کے بدنصیب گستاخ اور متکبر ہر زمانے میں ہر نبیؑ کے دشمن پیدا ہوتے رہے ہیں۔ فرمایا: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ۔۔۔ اور اسی طرح ہم نے گناہگاروں میں سے ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا۔

ہر نبیؑ کے عہد میں بدکار لوگ نبیؑ کے دشمن ہوتے رہے۔ گویا برائی کرنا، بدکاری کرنا، دین سے دور ہونا، یہ محض گناہ نہیں ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے عداوت ہے، دشمنی ہے۔ اللہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلّم تو قرآن کا نفاذ چاہے اور کوئی اپنے عمل سے قرآن کے احکام کو مٹانا چاہے تو کیا یہ دشمنی کے مترادف نہیں ہے؟ قرآن سے اور اتباعِ قرآن سے دوری عنداللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے دشمنی شمار ہوگی اور ایسا شخص اللہ کریم کی بارگاہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا دشمن بن کر اٹھے گا۔ یہ بھی عذابِ الٰہی کی ایک صورت ہے کہ بندہ گناہ کرتے کرتے اتنا دور نکل جائے کہ اللہ کے نبیؑ کا دشمن بن جائے۔ فرمایا: وَ كَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿۳۱﴾ اور آپ کا پروردگار ہدایت دینے اور مدد فرمانے کے لیے کافی ہے۔

ہدایت دینا یہ پروردگار ہی کا کام ہے اور کوئی ایسا نہیں ہے جو ہدایت دے سکے۔ مدد کرنے کے لیے بھی وہی کافی ہے کہ وہ پروردگار ہے، باقی سب مخلوق ہے جو خود اپنی ذات میں محتاج ہے اور ایک محتاج دوسرے محتاج کو کیا دے گا! آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا پروردگار طالب کو ہدایت دینے والا بھی ہے اور منکرین کے خلاف مدد کرنا بھی اسی کا کام ہے۔

قرآنِ کریم کا تدریجی نزول اور حکمت:

کافروں کو اعتراض سوجھتا ہے کہتے ہیں: وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً۔۔۔ اور کافر لوگ یوں کہتے ہیں کہ ان پر یہ قرآن ایک ہی بار کیوں نازل نہیں کیا گیا۔

کفار اپنی جہالت سے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کبھی کسی سورہ کا کوئی حصہ نازل ہوتا ہے کبھی چند آیات نازل ہوتی ہیں سارا قرآن یکبارگی نازل کیوں نہیں ہوتا؟ فرمایا: كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾ اس طرح (آہستہ آہستہ اس لیے نازل فرمایا گیا) کہ اس سے ہم آپ کے دل کو قائم رکھیں اور (اسی لیے) ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر اتارا ہے۔

کافروں کو اس بات کا کیا پتا کہ قرآن اللہ کا ذاتی کلام ہے اور کتنی عظیم کتاب ہے، اس کے ایک ایک حرف میں کتنی تجلیات باری ہیں۔ اسے اللہ کریم نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے قلبِ اطہر پر نازل فرمایا اور

وہ بہتر جانتا ہے کہ کب کون سی بات نازل فرمانی ہے جس قلب پر نازل فرمائی جارہی ہیں اُن پر تجلیّاتِ باری کیا اثر کرتی ہیں۔

دل کے اندر ایک لطیفہ ربانی ہے جسے فُواد کہتے ہیں اس لطیفہ قلب یعنی فواد پر وہ تجلیات باری نازل ہوتی ہیں جو کلامِ الٰہی کے ساتھ ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے فوادِ اطہر پر قرآن کا آہستہ آہستہ نازل کیا جانا اس لیے ہے کہ قلبِ اطہر میں قوتِ برداشت آتی جائے اور وہ اس میں ثبت ہوتا جائے انوارات باری کے تدریجی نزول سے قلبِ اطہر کی قوت بڑھتی گئی وگرنہ انوارات یکبارگی آتے تو پاش پاش بھی کر سکتے تھے۔کلماتِ ذاتی جوں جوں نازل ہوتے اُن سے متعلق انوارات کا نزول ہوتا رہا پھر کچھ دیر کے لیے وقفہ آتا ہے تو ان کو برداشت کرنے کی طاقت لطیفہءقلب میں پیدا ہو جاتی ہے تو نیا نازل ہو جاتا۔کافروں کو بھلا ان باتوں کا کیا پتا کہ اللہ کے ذاتی کلام میں کتنی تجلیاتِ باری ہیں اور انسانی قلب کے لیے انہیں سہارنا کتنا مشکل ہے۔

ایک نکتہ:

صوفیاء بھی جب طالبان طریقت کو ذکر کی تعلیم دیتے ہیں، مراقبات کرواتے ہیں تو درجہ بدرجہ کروا کر آگے لے جاتے ہیں۔اگر کسی کی یکبارگی کھینچ کر منازل پر لے جایا جائے تو مجذوب ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔

وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾ اور اسے ٹھہر ٹھہر کر اتارا گیا تو یہ ترتیب تو اللہ کریم جانتے ہیں جنہوں نے اسے اپنے وقت اور ترتیب سے قلبِ اطہر پر نازل فرمایا اور جتنا نازل فرمایا اس سے اُسے قوت بخشی پھر ہر واقعہ کے ساتھ آیات کو جوڑ دیا۔جب کوئی سوال پیدا ہوتا تو اس کا جواب نازل ہو جاتا جو قیامت تک کے لیے اس کے معانی کے تعین اور یاد رکھنے کا سبب بن گیا۔

اب جو لوگ قرآن کو غلط معانی پہناتے ہیں وہ شانِ نزول سے ہٹ کر پہناتے ہیں چنانچہ اگر نزول کو دیکھا جائے کہ واقعہ کیا ہوا تھا تو معانی اور مفہوم متعین ہو جاتے ہیں۔

کفار کا یہ اعتراض کہ قرآن یکبارگی نازل کیوں نہیں ہوا ایسا ہی ہے جیسے اب کوئی کہہ دے کہ بچہ ایک رات میں پیدا کیوں نہیں ہو جاتا نو ماہ کیوں لگتے ہیں تو یہ تو کوئی سوال نہیں بنتا۔اسی طرح اگر کوئی کہے کہ فصل آج بوئی ہے تو کل کیوں نہیں پک جاتی چھ ماہ میں کیوں پکتی ہے۔یہ تو قادرِ مطلق کی حکمت ہے اور کاری گری ہے کسی کو سوال کرنے کا حق نہیں ہے۔

جہالت کا جواب علم سے:

کفار کے اعتراضات لایعنی اور فضول ہوتے ہیں جن میں کوئی دلیل نہیں ہوتی جیسے یہ سوال کہ قرآن

یکبارگی نازل کیوں نہیں ہوگیا۔ جن انبیاؑ کو صحیفے اور کتاب یکبارگی مل گئی جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لکھی لکھائی کتاب مل گئی تھی تو کیا ان لوگوں نے مان لی تھی۔

فرمایا: وَلَا يَأْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿۳۳﴾ اور یہ لوگ آپ کے پاس جو اعتراض کی بات لاتے ہیں ہم آپ کے پاس (اس کا) معقول اور خوب وضاحت سے جواب بھیج دیتے ہیں۔

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ کفار آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بارگاہ میں اپنے لایعنی اور جاہلانہ سوالات لاتے ہیں جن کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی لیکن ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر اس کا جو جواب نازل فرماتے ہیں وہ علم ہوتا ہے، حق ہوتا ہے بہت خوبصورت تفسیر و تفصیل ہوتی ہے اور بات سمجھ میں آجاتی ہے۔

حضرت مولانا اللہ یار خانؒ فرمایا کرتے تھے کہ سوال سے گھبرانا نہیں چاہیے کہ سوال از قسمِ جہالت ہوتا ہے اور جواب علم ہوتا ہے لہٰذا جواب علم سے دینا پڑتا ہے۔ اعتراض اور سوال تو کوئی بھی جاہل کر سکتا ہے۔

سزا از جنسِ اعمال:

فرمایا: اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۳۴﴾ جو لوگ اپنے مونہوں کے بل دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے ان ہی لوگوں کا ٹھکانہ بھی برا ہے اور وہ راستے سے بھی بھٹکے ہوئے ہیں۔

جس طرح دنیا میں یہ لوگ الٹے الٹے اعتراض کرتے ہیں، الٹے الٹے کام کرتے ہیں۔ جن کاموں سے روکا جائے وہ کرتے ہیں اور جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا جائے وہ نہیں کرتے انہیں روزِ حشر مونہوں کے بل الٹا کر کے گھسیٹا جائے گا۔ یاد رہے کہ سزا از جنسِ اعمال ہوتی ہے۔ جیسے اعمال ہوتے ہیں اسی طرح کی سزا مرتب ہوتی ہے۔ یہ لوگ دنیا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی عظمت پر، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی کتاب اور دین پر الٹے الٹے اعتراض کرتے ہیں اور جن کاموں کا حکم ملتا ہے وہ نہیں کرتے جبکہ جن سے روکا جاتا ہے وہ کرتے ہیں۔ گویا ان کے اعمال بھی الٹے ہیں اور اعتراضات بھی الٹے چنانچہ میدانِ حشر میں انہیں مونہوں کے بل الٹا گھسیٹ کر جہنم کی طرف لایا جائے گا۔ دنیا میں جتنا دین سے دور تھے اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم سے دور تھے، راہِ حق سے جتنے دور تھے اتنا ہی جہنم کے دور دراز گوشوں میں الٹا کر پھینکے جائیں گے جو بہت ہی بری جگہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ بھی بہت برا ہے اور جن کا راستہ بھی گمراہی کا راستہ ہے کسی منزل پر پہنچنے والا راستہ نہیں ہے۔

حاصلِ کلام:

آج ہمارے پاس فرصتِ عمل ہے، زندگی ہے تو ہمیں اپنا اپنا محاسبہ کرنا چاہیے کہ ہمیں قرآن کو پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کتنی توفیق نصیب ہے؟ ہماری زندگی سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے کتنے مطابق ہے۔ یہ دیکھنا چھوڑ دیں کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں اور آخرت میں اُن کا کیا ہوگا ہم نے کسی کا جواب نہیں دینا۔ آج توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے جسے مخلوق کے گناہ عاجز نہیں کر سکتے۔ آج سب کچھ بخشوایا جا سکتا ہے، موت کے بعد مشکل ہو جائے گا۔ سو زندگی میں موت کی تیاری کرو، صحت میں بیماری کے ایام کا ازالہ کرو۔ اللہ کریم نے اگر صحت دی ہے تو اللہ کی زیادہ عبادت کرو پھر اگر بیماری آ جائے اور عبادت چھوٹ بھی گئی تو اللہ کریم اتنا ثواب دیتے رہیں گے جتنا صحت میں دیتے تھے۔

اللہ کی یاد کو دلوں میں بسا لو۔ اللہ کے نام کی تکرار کرو۔ اتنا اللہ اللہ کیا کرو کہ دنیا و مافیہا ذہن سے محو ہو جائے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے: وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۔ (المزمل:8) اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کریں اور سب سے یکسو ہو کر اسی کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

اللہ کا اتنا ذکر کرو کہ صرف اللہ کی یاد رہ جائے دنیا ذہن سے نکل جائے۔ آج فرصت ہے عقبیٰ کی فکر کرو، کیا خبر اگلا لمحہ ہم ہیں یا نہیں ہیں۔ اللہ کریم ہماری خطائیں معاف فرمائیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع نصیب فرمائیں اور قرآن کے ساتھ وابستگی نصیب فرمائیں۔

سورۃ الفرقان رکوع 4 آیات 35 تا 44

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ﴿۳۵﴾ فَقُلْنَا
اذْهَبَاۤ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴿۳۶﴾ وَقَوْمَ
نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ وَاَعْتَدْنَا
لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۷﴾ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا۠ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ
كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۪ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿۳۹﴾ وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى
الْقَرْيَةِ الَّتِيْۤ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا
يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۰﴾ وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ
اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَاۤ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ وَسَوْفَ
يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ
هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ
اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۴﴾

اور یقیناً ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی تھی اور ہم نے ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو (ان کا) معاون بنایا تھا ﴿۳۵﴾ پھر ہم نے (ان دونوں کو) حکم دیا کہ دونوں ان لوگوں کے پاس جائیں جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا سو ہم نے ان کو بالکل ہی تباہ کر دیا ﴿۳۶﴾ اور قومِ نوحؑ کو جب انہوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں غرق کر دیا اور ان لوگوں کے لیے نشانی

(نشانِ عبرت) بنا دیا اور ظالموں کے لیے ہم نے دکھ دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۳۷﴾ اور عاد اور ثمود اور کنویں والے اور ان کے درمیان بہت سی امتوں کو بھی (ہم نے ہلاک کر دیا) ﴿۳۸﴾ اور سب کو (سمجھانے کے لیے) ہم نے مثالیں بیان فرمائیں اور (نہ ماننے پر) ہم نے سب کو تہس نہس کر دیا ﴿۳۹﴾ اور یہ (کفارِ مکہ) اس بستی پر ہو کر گزرے ہیں جس پر پتھر برسائے گئے تو کیا وہ اس کو دیکھتے نہ ہوں گے بلکہ ان کو (مرنے کے بعد) جی اٹھنے کی امید ہی نہیں ﴿۴۰﴾ اور جب یہ لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کا مذاق ہی اڑاتے ہیں (اور کہتے ہیں) کیا یہی شخص ہے جس کو اللہ نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے ﴿۴۱﴾ اس شخص نے تو ہم کو ہمارے معبودوں سے ہٹا ہی دیا ہوتا اگر ہم ان پر (مضبوطی سے) قائم نہ رہتے اور جلد ہی ان کو معلوم ہو جائے گا جب عذاب کو دیکھیں گے کہ کون گمراہ تھا؟ ﴿۴۲﴾ بھلا آپ نے اس شخص کا حال دیکھا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے تو کیا آپ اس کی نگرانی کر سکتے ہیں؟ ﴿۴۳﴾ یا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان میں سے اکثر سنتے سمجھتے ہیں؟ یہ تو محض چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں ﴿۴۴﴾

تفسیر و معارف

معترضین کا وطیرہ اور انجام:

پچھلی آیات میں کفار کا یہ اعتراض تھا کہ قرآنِ کریم آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یکبارگی نازل کیوں نہیں ہوا؟ اس کا خوبصورت جواب بھی گزر چکا ہے۔ یہاں پر اللہ کریم وہی بات ایک اور انداز میں ارشاد فرما رہے ہیں۔ فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ﴿۳۵﴾ اور یقیناً ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی تھی اور ہم نے اُن کے ساتھ ان کے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو (ان کا) معاون بنایا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کو تو کتابِ الٰہی یکبارگی عطا کر دی گئی تھی پھر کیا کفار نے قبول کر لی تھی، موسیٰ و ہارون علیہم السلام کو نبی مان لیا تھا؟

کفار کو جواب دیا جا رہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو یکبارگی کتاب دے دی گئی اور اُن کا بوجھ بانٹنے کے

لیے ہارون علیہ السلام کو اُن کا وزیر بنایا اور انہیں بھی وہ قوت و استعداد اور معرفتِ الٰہی کا وہ درجہ جو انبیاؑ کا ہوتا ہے، عطا کر دیا گیا تو کیا تم نے اُن کی بات مان لی تھی؟ وَزِیر، وِزْرٌ سے ہے جس کا معنی بوجھ ہے۔ یعنی بوجھ بانٹنے والا۔

قرآن کی رو سے وزیر ہونا ایک اہم منصب ہے اور وزیر کے لیے ضروری ہے کہ اس میں استعدادِ کار بھی ہو، وہ کام کو سمجھتا ہو، جانتا بھی ہو تا کہ وہ حکمران کا بوجھ بانٹے اور اپنی ذمہ داریاں پوری ایمان داری اور خوش دلی سے ادا کرے۔ فرمایا: فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا۔۔۔ پھر ہم نے (ان دونوں کو) حکم دیا کہ آپ دونوں ان لوگوں کے پاس جائیں جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔ دونوں انبیاؑ کو فرعون اور آلِ فرعون کی طرف بھیجا گیا جنہوں نے اللہ کی عظمت کے دلائل اور نشانیوں کو ماننے اور سمجھنے سے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے انبیاؑ کی بات کا حتیٰ کہ معجزات کا بھی انکار کر دیا۔ تکذیب یہ ہے کہ کسی بات کو جھوٹا کہا جائے۔ وہ قوم انبیاؑ سے کہتی تھی کہ آپؑ کا دعویٰ نبوت اور یہ کہنا کہ یہ احکامِ الٰہی ہیں جھوٹ ہے۔ آپؑ سچ نہیں کہتے۔

فرمایا، اگرچہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی پوری کوشش کی، ہارون علیہ السلام نے بھی بہت محنت کی اور اللہ کریم نے انہیں بہت سے معجزات بھی عطا فرمائے۔ ان کی قوم نے وہ سارے معجزات دیکھے لیکن عجیب بات ہے کہ وہ اپنے کفر پر قائم رہے۔ قرآن کریم میں یہ تذکرہ ملتا ہے کہ جب ان لوگوں پر کوئی مصیبت آتی تو موسیٰ علیہ السلام کے پاس دوڑتے اور منت سماجت کرتے کہ آپ دعا کریں کہ یہ مصیبت ہم پر سے ٹل جائے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ پھر جب اُنؑ کی دعا سے مصیبت ٹل جاتی تو پھر اکڑ جاتے اور انکار پر جمے رہتے، جب انہوں نے تمام معجزات کا بھی انکار کر دیا اور ان دونوں انبیاؑ کو بھی مان کر ہی نہ دیا تو فرمایا: فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ۝ ہم نے اُن کو بالکل ہی تباہ کر دیا۔

جب وہ قوم اپنے انکار پر ہی جمی رہی تو قہرِ الٰہی نے انہیں اس طرح برباد کیا کہ نام و نشان تک نہ چھوڑا اور وہ غرقِ دریا ہو گئے۔ جنہیں اپنی طاقت، اپنے لاؤ لشکر اور دولت پر بڑا ناز تھا، وہ محض عبرت کی داستان بن کر رہ گئے۔ اگرچہ فرعون نزولِ کتاب سے قبل ہلاک ہوا مگر صاحبِ کتاب یعنی نبی علیہ السلام کو جھٹلایا اور بعد کے کفار نے بھی تو تسلیم نہ کیا اور اللہ کی کتاب کو جھٹلایا۔

یہی ایک مثال تو نہیں، ان سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم کا حشر بھی دیکھ لو۔ فرمایا: وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً۔۔۔ اور قومِ نوحؑ کو جب انہوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں غرق کر دیا اور اُن کو لوگوں کے لیے نشانی (نشانِ عبرت) بنا دیا۔

فرعون اور اس کی قوم سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا حشر دیکھ لو۔ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ وہ بے حد ترقی یافتہ قوم تھی اور انہیں اپنی ایجادات پر بڑا فخر تھا۔ اُن کے غرق ہونے کا سبب بھی اُن کا اپنی مادّی

ترقی پر غرور تھا جس کے باعث وہ حق قول نہیں کرتے تھے۔قرآن کریم میں موجود ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام جب کشتی بنا رہے تھے جو اُن کی قوم کے رؤسا اور امراء جب پاس سے گزرتے تو مذاق اڑاتے کہ ہم نے کیا کیا بنا لیا اور بابا جی صحرا میں کشتی بنا رہے ہیں۔ یہ ریت پر کشتی چلائیں گے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ تم مذاق کر لو ایک وقت آئے گا ہم تمہارے ساتھ اسی طرح مذاق کریں گے اور تمہیں سمجھ آ جائے گی کہ کشتی کی ضرورت کیوں پیش آئی اور یہ کس پر چلے گی۔فرمایا: وَقَوْمَ نُوْحٍ ۔۔۔نوح علیہ السلام کی قوم جس کو ہم نے اتنی نعمتیں دیں، اتنا شعور دیا اور وافر علوم عطا فرمائے: لَمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ ۔۔۔اس سب کے باوجود انہوں نے انکار ہی کیا حالانکہ نوح علیہ السلام اپنی قوم میں ساڑھے نو سو سال تو تبلیغ ہی فرماتے رہے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ جب طوفان آیا تو اسّی یا بیاسی لوگ تھے جو نوح علیہ السلام پر ایمان لائے۔نوح علیہ السلام کی قوم نے اللہ کے تمام انبیاؑ کی دعوت کا انکار کیا کہ سارے نبیؑ عقائد تو ایک سے ہی بیان فرماتے ہیں لہٰذا ایک نبیؑ کا انکار درحقیقت تمام انبیاؑ کا انکار ہے۔ انبیاؑ تو راہنمائی فرماتے ہیں کہ انسان اللہ کے عطا کردہ شعور کو استعمال کرتے ہوئے دنیا کے کام ایسے کرے کہ اس کی ابدی زندگی بھی سنور جائے۔ اللہ کریم نے آخرت کی تعمیر کو اتنا آسان کر دیا ہے کہ اسی دنیا کے کام اللہ کی شریعت کے مطابق کرنے سے دنیا کے کام تو ہو ہی جاتے ہیں ساتھ میں آخرت بھی بن جاتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ شریعت کے احکام سہل ترین بھی ہیں۔ قرآنِ کریم میں 'دین' کو بار بار ھُدیٰ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ ھدیٰ کا مطلب ہے کسی بھی کام کے کرنے کا سب سے صحیح طریقہ اور جو صحیح طریقہ ہوتا ہے وہ سب سے آسان ہوتا ہے۔ جو کام بھی شریعت سے ہٹ کر کیا جائے اس میں خرابی بھی ہوتی ہے اور مشقت بھی۔ وہ کام معیاری بھی نہیں ہوتا۔

عقلمندی یہی ہے کہ دنیا کے کام شرعی حدود کے اندر کریں، اس میں آسانی بھی زیادہ ہے برکت بھی ہے، آرام بھی ہے اور اسی پر آخرت میں اجر بھی ہے۔ آخرت کے لیے کوئی الگ سے اہتمام نہیں کرنا پڑتا، یہی سونا جاگنا، کھانا پینا، خوشی غمی، خرید و فروخت، دوستی دشمنی، بزرگوں اور چھوٹوں سے تعلقات ہیں جن کو شریعت کی حدود کے اندر نبھانا ہے۔ شریعت نے تو ایسی راہنمائی کی ہے کہ دوستی تو دوستی دشمنی کی بھی حدود متعین کر دی ہیں۔ انسان چونکہ مادّی وجود رکھتا ہے اور وجود کی حسیات بھی مادّی ہیں۔ عناصرِ اربعہ کے ملنے سے نفس پیدا ہو جاتا ہے لہٰذا نفس کی اصل بھی مادّہ ہے اور دنیا مادّی ہے اور قریب ہے، سامنے ہے، محسوس کی جا سکتی ہے تو یہ سب مل کر انسان کو اسی دنیا میں دھکیل دیتی ہیں اور وہ حصولِ دنیا کے لالچ میں ہی مشغول ہو جاتا ہے۔ آخرت کے لیے نورِ ایمان شرط ہے ورنہ آخرت ان ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتی اور ظاہری کانوں سے آخرت کا کوئی پیغام سن کر بھی سنائی نہیں دیتا۔ اس نورِ ایمان کے لیے اللہ کریم نے انبیاؑ مبعوث فرمائے۔ جنہوں نے قلوب کو روشنی بخشی لیکن اگر کوئی آنکھوں پر پٹّی باندھ لے تو اس کے لیے

سورج کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ جن لوگوں نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت کا انکار کیا، انہوں نے مادّی نفس سے مغلوب ہو کر کیا کہ مادّی دنیا ہی کے حصول میں سرگرداں رہے، انہیں روحانیت، آخرت اور روح کی ضرورتوں کا احساس بھی نہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر اُن کے پاس یہ دنیا بھی نہ رہی۔ جب انبیاؑ کا انکار کیا تو یہ اتنا بڑا جرم بن گیا کہ اللہ کریم نے انہیں سزا دی: اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً۔۔۔تو ہم نے انہیں غرق کر دیا اور ان کو لوگوں کے لیے نشانِ عبرت بنا دیا۔ ایسی تباہی ہوئی کہ پچھلوں کے لیے عبرت کا سامان بن گئی لیکن بات اس پر ختم نہیں ہوئی: وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۷﴾ اور ظالموں کے لیے ہم نے دُکھ دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ان ظالموں کے لیے دنیا کی تباہی پر بات ختم نہیں ہوگی بلکہ دنیا کے دکھوں سے کروڑوں، اربوں گنا زیادہ دکھی ان کی اگلی زندگی ہوگی جو ہمیشہ کے دردناک عذاب کی نذر ہو جائے گی۔ فرمایا: وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾ اور عاد اور ثمود اور کنویں والے اور ان کے درمیان بہت سی امتوں کو بھی (ہم نے ہلاک کر دیا)۔

اسی طرح قومِ عاد، قومِ ثمود اور کچے کنویں پر رہنے والے لوگ اور اس کے درمیان بھی بہت سی اقوامِ عالم گزریں جو اسی جرم میں تباہ و برباد ہوئیں کہ انہوں نے دعوتِ انبیاؑ کا انکار کیا۔ کوئی غرق کر دی گئی، کسی پر آگ برسی، کسی پر پتھر برسے، کسی کو ہوا کے طوفان نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہوا، پانی زندگی کے اسباب تھے اُن کے لیے موت کا سبب بن گئے جس کی وجہ اُن کا کردار تھا۔ حالانکہ: وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۪ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿۳۹﴾ اور سب کو (سمجھانے کے لیے) ہم نے مثالیں بیان فرمائیں اور (نہ ماننے پر) ہم نے سب کو تہس نہس کر دیا۔

ان سب کے لیے اللہ کریم نے بہت مؤثر انداز میں مثالیں دے کر تعلیمات نازل فرمائیں۔ انبیاؑ مبعوث فرمائے جو منوّر القلوب تھے اور لوگوں کے قلوب کو بھی روشن کرنے کی استعداد رکھتے تھے اور معرفتِ الٰہی تقسیم کرتے تھے۔ انبیاؑ نے دعوت اور تبلیغ کا حق ادا کیا لیکن یہ ایسے بدبخت تھے کہ دنیا میں اتنے محو ہو گئے کہ انہیں آخرت یاد ہی نہ رہی اور انکار پر جمے رہے لہٰذا ہم نے انہیں تہس نہس کر دیا کہ اُن کا نشاں باقی نہ رہے۔

قرآن کریم کی نظر میں گمراہی کا اصل سبب:

فرمایا: وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۰﴾

اور یہ (کفارِ مکہ) اس بستی پر ہو کر گزرے ہیں جس پر پتھر برسائے گئے تو کیا وہ اس کو دیکھتے نہ ہوں گے

بلکہ ان کو تو مرنے کے بعد جی اٹھنے کی امید ہی نہیں۔

اہلِ مکہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے پہلے پہلے مخاطب ہیں، اُن کا گزر تو اُن شہروں سے ہوتا تھا جن پر پتھروں کی بارش برسی تھی اس لیے کہ لوط علیہ السلام کی قوم کے علاقے اور شہر ان لوگوں کے تجارتی راستوں میں پڑتے تھے۔ جب یہ اُن تباہ شدہ کھنڈروں سے گزرتے ہیں تو کیا یہ کبھی نہیں سوچتے کہ ان بستیوں کو کیوں الٹا کر زمین کے نیچے دبا دیا گیا، کیوں ان پر آسمان سے پتھر برسائے گئے، ان کو کیوں تباہ کر دیا گیا، آخر کیا وجہ تھی؟

آخرت پر کمزور ایمان، ہر جرم کی بنیاد ہے:

قرآن کریم کا اندازِ تخاطب بہت خوبصورت ہے بیماری کی نشاندہی بھی کرتا ہے، بیماری کے اسباب بھی بتاتا ہے اور علاج بھی تجویز کرتا ہے۔ فرمایا، ان کفارِ مکہ کی بیماری یہ ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات کا انکار کر رہے ہیں، کفر کر رہے ہیں۔ اس بیماری کا سبب کیا ہے، فرمایا: بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۰﴾ انہیں قیامت کا، حشر نشر کا، مرنے کے بعد زندہ ہونے کا یقین نہیں ہے اور یہی ان کی گمراہی کا سبب ہے۔ پہلی قومیں بھی اسی لیے تباہ ہوئیں کہ انہیں یقین نہیں تھا کہ ایک دن اللہ کے حضور پیش ہونا ہے اور اپنے کردار کا جواب دینا ہے۔ تمام انبیاؑ نے اتنی محنت کی لیکن اُن کی قومیں ایمان نہ لائیں۔ انہوں نے انبیاؑ کی عظمت اور صداقت کا انکار کر دیا اس لیے کہ انہیں قیامت کا، آخرت کا یقین نہیں تھا۔ انہیں امید ہی نہیں تھی کہ جوابدہ بھی ہونا ہے، ان کا خیال تھا کہ مر کر بات ختم ہو جائے گی۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہر گناہ کے پیچھے اسی یقین کی کمزوری ہوتی ہے اور یہی کمزوری ہر جرم کی بنیاد ہے۔

آج وطنِ عزیز میں اگر قتلِ عام، ڈاکے اور دہشت گردی ہو رہی ہے تو اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہر مجرم کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ مجھے کوئی نہیں پوچھے گا نہ پکڑے گا اور اگر پکڑا گیا تو رشوت یا سفارش سے چھوٹ جاؤں گا۔

جب ملک میں جزا اور سزا کا نظام کمزور ہو جاتا ہے تو جرائم کی شرح بڑھ جاتی ہے۔ الحمدللہ! ہم مسلمان ہیں، یہ اللہ کا احسان ہے اور اس مسلمانی کے ساتھ قرآن نے آخرت پر یقین کی دوبارہ تاکید فرمائی۔ ارشاد ہوا: وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (البقرہ:4) اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اس پر جو (کتاب) آپ پر نازل کی گئی اور جو آپ سے پہلے نازل کی گئی اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

مومن گویا پہلی کتابوں کو بھی اللہ کا کلام مانتے ہیں قرآن کو مانتے ہیں انبیاؑ کو مانا تو مسلمان تو ہو گئے لیکن فرمایا یہ آخرت کا پکا یقین رکھتے ہیں۔ یعنی کلمہ پڑھنے کے بعد بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ آخرت پر اعتماد اور یقین مکمل کیا جائے۔ اب جو لوگ چھوٹے چھوٹے جرائم بھی کرتے ہیں مثلاً دودھ میں پانی ملا دیتے ہیں اور تھوڑی سی منفعت

کے لیے ساری کمائی حرام کر دیتے ہیں۔ اگر ملاوٹ کرنے والے کو یہ خیال آئے کہ یہ جو پانی میں ملا رہا ہوں اس کا قبر میں پوچھا جائے گا، میدانِ حشر میں جواب دینا پڑے گا تو کیا وہ پانی ملائے گا؟ ہم کسی کا مال ناجائز طریقے سے حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر ہمیں پختہ یقین ہو کہ اللہ کریم اس کی جواب طلبی کریں گے اور سزا بھی دیں گے تو ہم ایسا کبھی نہ کریں۔ جرم کی بنیاد آخرت پر ایمان کی کمزوری کو قرار دیا ہے اور یہی حق ہے۔

کفار کا اندھا پن:

کفار کا اندھا پن دیکھیے، وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾

اور جب یہ لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کا مذاق ہی اڑاتے ہیں (اور کہتے ہیں) کیا یہی شخص ہے جس کو اللہ نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔

کفار نبوت کا، قیامت کا انکار تو کرتے ہی ہیں لیکن ایسے اندھے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے حسنِ ظاہر کا بھی انکار کر دیتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں کہ دیکھو انہیں اللہ نے رسول بنا دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ایک حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ جب سے عالمِ انسانیت وجود میں آئی ہے میں بہترین لوگوں میں رہا۔ آدم علیہ السلام سے ولادت باسعادت تک خاندانوں میں سے اچھے خاندانوں میں، گھرانوں میں سے اچھے گھرانوں میں، افراد میں سے اچھے افراد میں رہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خاندانی وجاہت بھی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا حسن ظاہر بھی لاجواب تھا۔ کائنات میں کوئی دوسرا آپ صلی اللہ علیہ وسلّم جیسا نہیں اللہ کریم نے پیدا ہی نہیں فرمایا۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ایک رباعی ہے:

وَ اَحْسَنُ مِنْكَ لَمْ تَرَقَطُّ عَيْنِیْ
وَ اَجْمَلُ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ

(ترجمہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے زیادہ خوبصورت میری آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے زیادہ خوبصورت فرزند کسی ماں نے پیدا ہی نہیں کیا۔

خُلِقْتَ مُبَرَّاً مِنْ كُلِّ عَيْبٍ
كَاَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

(ترجمہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ہر کمزوری ہر عیب سے مبرا پیدا فرمائے گئے گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی پسند کے مطابق پیدا فرمایا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی پسند بھی ہر کمال کو پسند کرتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی پسند میں بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ کفار تو گویا اندھے ہو گئے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے حسنِ ظاہر کو بھی دیکھ نہیں پا رہے اور انکار کر رہے ہیں۔ یہ مذاق اڑاتے ہیں کہ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم رسول بنایا ہے۔

اچھائی کا معیار:

کفار کے نزدیک اچھائی کا معیار ایمان، کردار یا خاندانی شرافت نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک اچھائی کا معیار محض دولتمندی ہے۔

ان کی نظر میں جن کے پاس دولت ہے وہی شریف ہیں، وہی سیانے اور سمجھ دار بھی ہیں لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ نبیؐ بھی کسی قبیلے کا رئیس ہوتا یا کسی مال دار شخص کو نبیؐ بنایا جاتا تا کہ کوئی اس کی بات بھی سنتا۔ یہ تو غریب سا گھرانہ ہے جو معزز تو ضرور ہے لیکن دولتمند نہیں ہے۔ کفار کے نزدیک جس کے پاس دولت نہیں ہے وہ نبی نہیں ہو سکتا لہٰذا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا مذاق اڑاتے ہیں کہ دیکھو یہ ہیں جنہیں اللہ نے رسول مبعوث کر دیا ہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے لوگ بھی آج اسی سوچ کے حامل ہیں جو اُن انتہائی تاریک دلوں کے مالک کفار کی تھی۔ آج معاشرے میں امراء ہی کو سمجھ دار اور سیانا سمجھا جاتا ہے اور حکومت کا حقدار بھی انہیں ہی سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی شریف آدمی یا غریب آدمی امیدوار ہو تو اسے کوئی ووٹ نہیں دیتا، کاش! ہمارا میعارِ شرافت اور انتخاب اس بنیاد پر ہوتا کہ جس میں نورِ ایمان ہے، اللہ کا خوف ہے، جس کا کردار شریعت کے مطابق ہے اور جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنت اور ارشادات پر جان فدا کرتا ہے، اسے ہم ووٹ دیتے۔ اگر ہم ایسا کرتے تو ہمارے حالات اتنے دگرگوں نہ ہوتے۔

کفار کہتے ہیں: اِنۡ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنۡ اٰلِهَتِنَا لَوۡلَاۤ اَنۡ صَبَرۡنَا عَلَيۡهَا ۔۔۔ اس شخص نے تو ہم کو ہمارے معبودوں سے ہٹا ہی دیا ہوتا اگر ہم ان پر (مضبوطی سے) قائم نہ رہتے۔ کفار کا حال دیکھیں کہ یہ خود کو حق پر سمجھ رہے ہیں اور (معاذ اللہ) اللہ کے نبیؐ کو غلطی پر سمجھ رہے ہیں کہہ رہے ہیں کہ اگر ان کا بس چلتا تو یہ ہمیں معبودوں سے گمراہ کر دیتے لیکن ہم نے بہت اچھا کیا جو ہم اپنے معبودوں کے ساتھ صبر سے جمے رہے۔

گویا کفار اتنے اندھے ہو چکے ہیں کہ ہدایت اور نورِ نبوت انہیں گمراہی نظر آتا ہے، ان کا معیار اتنا بدل چکا ہے۔ ان کا اپنا حال تو یہ ہے کہ خود شرک میں مبتلا ہیں، بتوں کی پوجا کر رہے ہیں لیکن اسے حق سمجھے ہوئے ہیں۔ جبکہ بتوں کے انکار اور توحیدِ باری کے اقرار کو کفر کہہ رہے ہیں، گمراہی کہہ رہے ہیں اسی لیے تو کہہ رہے ہیں کہ اگر ہم اپنے بتوں کی پوجا پر صبر نہ کرتے، جم کر نہ رہتے تو یہ تو ہمیں ان سے گمراہ کر دیتے۔

ہر دور کے گمراہ کا رویہ ایک سا:

ہر گناہگار، بدکار کا یہی رویہ ہے کہ وہ دین دار کا مذاق اڑاتا ہے، اُسے بیوقوف سمجھتا ہے اور غلط راستے پر سمجھتا ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں دیکھا جا سکتا ہے کہ نمازیوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے، داڑھی والوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں ''ہم نے بہت دیکھے ہیں نمازی اور داڑھیوں والے کہ یہ کیا کرتے ہیں''۔ ان کو سوچنا چاہیے کہ داڑھی والا بھی انسان ہے اگر اس سے غلطی ہو جاتی ہے تو داڑھی پر طنز کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ داڑھی رکھنا تو نیکی ہے اور نیکی پر طنز کرنا تو مناسب نہیں ہے۔ اگر اس سے غلطی ہو جاتی ہے تو تلافی کرے کہ وہ بھی انسان ہے۔ اسی طرح دینی شعائر کا، عبادات کا، مذاق اڑایا جاتا ہے، حاجیوں، نمازیوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔

دوسری بات گناہگاروں کے رویے میں یہ ہوتی ہے کہ یہ گمراہ ہونے کے باوجود خود کو حق پر سمجھتے ہیں۔ گویا ہر گمراہ شخص خود کو ہدایت پر سمجھتا ہے۔ دینِ حق کو چھوڑ کر من مانی کرنا اور اُسے صحیح سمجھنا یہ وہی کافرانہ رویہ ہے۔ یاد رہے گناہ کو جرم سمجھتے ہوئے گناہ کرنا فسق ہے، یہ گناہ ہے۔ حرام کو حرام سمجھتا ہے اور کھاتا ہے تو گناہگار ہے لیکن اگر حرام کو حلال سمجھتا ہے تو کافر ہے۔ گناہ کو ثواب سمجھنا کفر ہے۔ آج ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہر بندہ بے دریغ سود کھائے جا رہا ہے اور اس کا نام بدل دیا جاتا ہے۔ کبھی منافع کہلاتا ہے کبھی مارک اپ اور پورا ملک اس پر کاربند ہے۔ بھلا کتے کا نام بکرا رکھنے سے وہ حلال ہو جائے گا؟ اگر سود ہی کھا رہے ہیں تو کم از کم حرام سمجھ کر تو کھائیں کہ اس سے گناہ ہو گا لیکن اگر جائز سمجھ لیں گے تو کفر ہو جائے گا۔ اللہ کریم معاف فرمائیں اور ہدایت نصیب فرمائیں۔

حق اور گمراہی کا فیصلہ ہو جائے گا:

اللہ کریم فرماتے ہیں: وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾

اور جلد ہی ان کو معلوم ہو جائے گا جب عذاب کو دیکھیں گے کہ کون گمراہ تھا۔

یہ زندگی بہت مختصر ہے۔ آج تو زندگی کا پردہ ہے لیکن جب یہ پردہ ہٹے گا جب موت آئے گی تو دیکھ لیں گے کہ گمراہ کون تھا اور حق پر کون تھا اس لیے کہ حقائق سامنے آ جائیں گے۔

اس ضمن میں استاذ المکرمؒ کا ایک واقعہ یاد آ گیا ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جب تعلیم سے فارغ ہو کر چکڑالہ واپس آئے تو وہاں ایک عالم ہوا کرتے تھے جو کسی بڑی درسگاہ سے فارغ التحصیل تھے اور اُن کے علم کا بڑا ڈنکا بجتا تھا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ جب تعلیم سے فراغت پا کر گھر مقیم ہوئے تو ان عالم کے ساتھ آپؒ کے مناظرے

شروع ہو گئے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی جرأت، قوت اور علمی دلائل سے انہیں مغلوب کیا۔ وہ عمر میں حضرت رحمۃ اللہ سے بڑے تھے، فوت ہو گئے۔ ایک دن حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اس قبرستان کے پاس گزرنے کا اتفاق ہوا جہاں وہ عالم دفن تھا۔ قاضی ثناء اللہ مرحوم جو بڑے اعلیٰ درجے کے صاحبِ کشف تھے ہمراہ تھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی صاحب سے کہا کہ ذرا ان مولوی صاحب سے بات تو کریں۔ ان سے پوچھیں تو سہی کہ یہاں تو میرے خلاف مناظرے کرتے تھے اب تو انہیں پتا چل گیا ہوگا کہ حق کیا تھا اور باطل کیا تھا۔

قاضی صاحب کہنے لگے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ساتھ بڑا ظلم کیا کہ ساری عمر دلائل جمع کر کے، کتابیں پڑھ پڑھ کر یہی کرتے رہے کہ باطل کو حق بتاتے رہے اور حق کو باطل ثابت کرتے رہے۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ ہم نے جو کچھ کیا بڑا ظلم کیا اور سارا بوجھ اپنے اوپر لادتے رہے لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی صاحب سے کہا کہ ان سے پوچھیں کہ کبھی کوئی نجات کی امید ہے؟ کہنے لگے کوئی امید نہیں۔

کتنا اچھا ہوتا کہ یہ دنیا میں اس کا اندازہ کر لیتے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے کہ زندگی میں تو توبہ کا موقع موجود ہے، واپسی کا ایک راستہ ہے۔ جب یہ دنیا ختم ہو جائے گی تو واپسی کا راستہ نہیں رہے گا اس لیے کہ وہ دنیا دار الجزا ہے دار العمل نہیں ہے۔ وہاں صرف بدلہ ملے گا اُن اعمال کا جو ہم دنیا میں کر چکے ہوں گے۔ دنیا دار العمل ہے، کام کرنے کی فرصت دنیا میں ہی ہے اگر ہم بہت غلطیاں بھی کر چکے ہیں، بہت دور جا چکے ہیں تو بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیں تو اچھا ہے۔ اور اگر غلط بات پر ہی جمے رہے تو بہت جلد سمجھ آ جائے گی۔ اللہ کا عذاب دیکھ کر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ کون حق سے بہت دور چلا گیا تھا۔

خواہش کی پیروی دراصل خواہش کو معبود کا درجہ دینا ہے:

معبودانِ باطلہ کی پوجا درحقیقت اپنی خواہشِ نفس کی پوجا ہے۔ فرمایا: اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ۔۔۔ بھلا آپ نے اس شخص کا حال دیکھا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔

اس آیہ مبارکہ میں قرآن نے کفر و شرک کی بڑی جامع تشریح کی ہے اتنی خوبصورت باتیں کرنا قرآن ہی کو زیبا ہے کہ یہ اللہ کریم کا کلام ہے۔ فرمایا یہ جو بتوں کو پوجتے ہیں یا انسانوں کو پوجتے ہیں یا جتنے بھی انہوں نے معبود بنا رکھے ہیں یہ لوگ ان معبودان باطلہ کی پوجا نہیں کرتے۔ یہ لوگ دراصل اپنی خواہشات کی پوجا کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے تمام مذاہبِ باطلہ کی اصل بتا دی کہ انہوں نے اپنی خواہشات کو معبود بنا رکھا ہے۔ جو

منصب ذاتِ باری کا تھا وہ انہوں نے نفس کی خواہشات کو دے رکھا ہے۔ ان کی عبادات کسی نہ کسی دنیوی مفاد سے جڑی ہوتی ہیں۔ کسی کی پوجا کرتے ہیں کہ یہاں سے دولت ملے گی، کسی کی پوجا صحت اور لمبی عمر کی امید پر کرتے ہیں اور کسی کی پوجا اولاد کے حصول کے لیے کرتے ہیں۔ کفر کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنی خواہشات کو رسومات کے ساتھ جوڑ لیتے ہیں اور خواہشاتِ نفس کو پوجتے ہیں لیکن الزام بتوں پر لگا رکھا ہے۔ کافر آخرت کو تو مانتا نہیں اس لیے اپنی رسومات کے ساتھ آخرت کو نہیں جوڑ سکتا چنانچہ ان کی آرزو نہ اللہ کی رضا ہے نہ آخرت بلکہ ان کی آرزو تو ان کی خواہشاتِ نفس کا پورا کرنا ہے۔ تمام عالمِ کفر کی قدرِ مشترک یہاں اللہ کریم نے ارشاد فرما دی کہ یہ سب اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کے مذہب کے جھوٹا ہونے کی دلیل یہی ہے کہ ان کے معبودوں کے ساتھ ان کی خواہشات ہیں۔

اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں مومن جنت کا طالب ہے اور جنت مخلوق ہے اور اس کی طلب کا حکم قرآن میں بھی ہے تو پھر مخلوق کا آرزو کرنا کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جنت فی نفسہٖ مطلوب نہیں ہے بلکہ اس لیے طلب کی جاتی ہے کہ یہ رضائے الٰہی کی سند ہے۔ جس طرح ایک شخص پی ایچ ڈی کرتا ہے تو اس کا مقصد صرف ایک کاغذ کا ٹکڑا حاصل کرنا نہیں ہوتا بلکہ علم کا حصول ہوتا ہے لیکن وہ سند جو اُسے ملتی ہے وہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ اس نے اتنا علم حاصل کیا ہے۔ جنت اُن لوگوں کی رہائش گاہ ہے جن سے اللہ کریم راضی ہوں گے چنانچہ مطلوب رضائے الٰہی ہے، جنت فی نفسہٖ مطلوب نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ذمّہ زبردستی منوانا نہیں ہے:

فرمایا یہ جو اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں: اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾ تو کیا آپ اس کی نگرانی کر سکتے ہیں؟

جو خواہشات کو معبود بنا لیتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اُن پر نگہبان یا چوکیدار نہیں ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا کام انہیں زبردستی دین میں لانا نہیں ہے نہ یہ آپ کی ذمّہ داری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذمّہ داری اللہ کا پیغام پہنچانا ہے جو آپ نے پہنچا دیا، اب آگے لوگوں کا اپنا فیصلہ ہے۔ اللہ کریم نے ہر فردِ بشر کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لاتا ہے یا نہیں۔ ہر ایک کو قلب عطا فرمایا، معرفتِ حق کی استعداد دے کر دنیا میں بھیجا۔ اب اگر دنیا میں کھو کر کوئی معرفتِ الٰہی کی استعداد ضائع کر دیتا ہے تو اپنا نقصان کرتا ہے لہٰذا کسی کو اس پر

تلوار لے کر دوڑنے کی ضرورت نہیں نہ ہی اُسے مجبور کر سکتا ہے کہ وہ ایمان لائے۔ ایمان لانا یا نہ لانا سب کا اپنا ذاتی فیصلہ ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ اسلام بنوکِ شمشیر پھیلا، انہیں قرآن کی اس آیت پر غور کرنا چاہیے اور یہ ایک آیت ہی نہیں بلکہ جگہ جگہ اس کا تذکرہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کفار پر داروغہ نہیں ہیں، ان پر نگہبان نہیں ہیں۔ یہ اُن کا فیصلہ ہے کہ وہ کفر میں ہی رہنا چاہتے ہیں یا اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں۔

دنیا میں جہاں اسلام پھیلا اور جن قوموں نے قبول کیا۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اخلاقِ حسنہ اور اسلام کی برحق تعلیمات کی وجہ سے قبول کیا۔ اس خوبصورت انسانی معاشرے کو دیکھ کر لوگ مسلمان ہوتے چلے گئے جس کی بنیاد آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا لایا ہوا خوبصورت دین تھا۔ اس خوبصورت معاشرے میں کافر کی جان، مال و آبرو کو بھی وہی تحفظ دیا گیا تھا جو مومن کی جاں مال اور آبرو کو دیا گیا۔ اس کے بچوں کی تعلیم کا بھی اہتمام کیا گیا بلکہ ملک کا دفاع مسلمانوں کے ذمے تھا جبکہ کافر کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں پر تھی۔ اب اگر کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اس خوبصورت دین کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کے پیچھے لگ جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ان کو زبردستی نہیں روک سکتے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا منصب ہی نہیں ہے۔ مذہب قبول کرنا دل کا فیصلہ ہوتا ہے، زبردستی یا بنوکِ شمشیر نہیں کیا جاتا۔

منکرینِ رسالت دراصل انسانی اوصاف ضائع کر چکے ہیں:

فرمایا: اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَکۡثَرَهُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ اَوۡ یَعۡقِلُوۡنَ۔۔۔ یا کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں؟

جو باتیں انبیاؑ ارشاد فرماتے ہیں اُن کو سمجھنے کی استعداد ہر بنی آدم کو منجانب اللہ عطا ہوتی ہے بات سننے کی صلاحیت بھی انسانوں کو عطا ہوئی لیکن اگر کوئی اپنے کان بہرے کر بیٹھے تو پھر وہ کیا سنے گا؟ فرمایا ان کے کفر کی وجہ سے ان کے کانوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات سننے کی صلاحیت ہی نہیں رہی اور ان کی عقول اتنی تاریک ہوگئی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاداتِ عالی اور منصبِ عالی کو ان کے دماغ سمجھتے ہی نہیں۔

فرمایا: اِنۡ هُمۡ اِلَّا کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ سَبِیۡلًا ﴿۴۴﴾ یہ تو محض چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بات نہیں سنتا وہ انسان نہیں ہے، جانور ہے جو نہ تو سننے کی صلاحیت

رکھتا ہے نہ عقل رکھتا ہے اس کی زندگی چوپائے جیسی ہے۔اب سننے کو تو ہر پرندہ، درندہ، ہر چوپایہ آواز سنتا ہے لیکن کیا وہ اس آواز کے معنی جان کر اس پر عمل کر سکتا ہے؟ اسی طرح ان کفار کی زندگی کا تجزیہ کریں تو ان جیسی زندگی تو درندے اور عام جانور بھی گزار رہے ہیں کہ چارا بھی کھالیا، بچے پیدا کیے ٹھکانہ بنایا اور مر گئے۔ جنگل میں ایک درندے کو دیکھا جائے تو وہ بھی اپنے بچے پالتا ہے، اُن کے لیے کھوہ بناتا ہے، گرمی سردی سے بچاتا ہے، اُن کے لیے شکار کر کے لاتا ہے، اُن کو پالتا ہے، بڑا کرتا ہے اور مر جاتا ہے۔ اسی طرح پرندے بھی اور کیڑے مکوڑے بھی اپنی زندگی گزار کر مر جاتے ہیں۔

انسان کو تو اللہ کریم نے معرفتِ الٰہی کی استعداد دی تھی لیکن یہ اس عظمت کے مقام سے گر کر چوپایوں کے درجے پر آ گئے ہیں۔ سو فرمایا یہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات نہیں سنتے، جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بات سمجھ نہیں آتی، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع نہیں کرتے یہ تو چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ جانوروں کو تو پیدا ہی جانور کیا گیا ہے اُن کو معرفتِ الٰہی پانے کی استعداد دی ہی نہیں گئی۔ انسانوں کو شرفِ انسانی بخشا لیکن یہ لوگ انسانی عظمتوں کو چھوڑ کر جانوروں جیسی ذلیل زندگی پر راضی ہو گئے یقیناً یہ جانوروں سے بھی بدتر لوگ ہیں۔

مغربی معاشرے کی اک جھلک:

آج سب لوگ مغرب کے بے دین معاشرے سے بہت مرعوب ہیں اور ان کی غلامی کو باعثِ فخر سمجھتے ہیں لیکن اگر وہاں جا کر دیکھیں تو اُن کا معاشرہ اور زندگی انسانی نہیں ہے۔ وہاں آبرو کا تصور نہیں ہے نہ ہی کوئی رشتہ باقی رہا ہے۔

سویڈن سے آئے ہوئے ایک نومسلم لڑکے سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ وہ اپنے خاندان میں اکیلا تھا جو اسلام لایا۔ اس سے پوچھا کہ تمہارے ماں باپ کا، گھر والوں کا کیا ردِعمل تھا؟ اس نے بتایا کہ اُن ممالک میں نظام ایسا ہے کہ بچہ پیدا ہونے پر سرکاری طور پر اس کا وظیفہ مقرر ہو جاتا ہے جو اس کے بالغ ہونے تک والدین کو ملتا رہتا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ جب میں بالغ ہوا اور میرا سرکاری وظیفہ ملنا بند ہوا تو میرے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ ''They Kicked me out'' کہ اب جاؤ اور اپنا کماؤ، اُن کا تعلق اس وظیفے کے ساتھ تھا جب وہ ختم ہو گیا تو انہوں نے مجھے دھکے دے کر نکال دیا۔ اسی طرح بچیاں جوان ہوتی ہیں تو اُن کو بھی نکال دیتے ہیں یا کہتے ہیں کہ اگر گھر میں رہنا ہے تو کما کر لاؤ، کمرے کا کرایہ دو

کھانے پینے کے پیسے دو تو رہ سکتی ہو۔ کیا یہ انسانی معاشرہ ہے؟ یہ تو جانوروں کی زندگی ہے کہ جانور بچے پالتا ہے تو جب وہ سیانے ہو جاتے ہیں تو وہی باپ یا ماں انہیں بھگا دیتا ہے۔ پھر انہیں قریب نہیں آنے دیتا اور نہ ہی بچے ماں باپ کو ڈھونڈتے ہیں کہ وہ کون تھے۔

ہمارا المیہ:

ہمارا بھی ایک مسئلہ ہے کہ ہم جب قرآنِ کریم پڑھتے ہیں تو اپنی ذات کو اس سے الگ رکھ کر پڑھتے ہیں۔ جب کافروں کے بارے پڑھتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تو کافروں کے متعلق ہے اور خود کو اس سے فارغ سمجھتے ہیں۔ جب نیک لوگوں کی بات پڑھتے ہیں تو اُسے صحابہؓ اور اولیا اللہ کے ذمّے سمجھتے ہیں، تو پھر ہمارے لیے قرآن میں کیا ہے؟ اصل میں قرآن ہر بندے سے ذاتی طور پر مخاطب ہے۔ ہمیں بھی یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی کتنی اطاعت کر رہے ہیں۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا کون کون سا حکم بجا لا رہے ہیں اور کتنی نافرمانی کر رہے ہیں۔ جہاں ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہاں ہم بھی حیوانوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہم بھی اندھے اور بہرے بن جاتے ہیں۔

قرآن کسی خاص طبقے کے لیے نہیں بلکہ ہر متنفس سے اس کی ذاتی زندگی پر بحث کرتا ہے۔ قرآن کریم اسی نظر سے پڑھنا چاہیے اور اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ اللہ کریم ہمارے گناہ معاف فرمائیں نیکی کی توفیق دیں۔

سورۃ الفرقان رکوع 5 آیات 45 تا 60

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا
الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۙ﴿۴۵﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۶﴾ وَهُوَ الَّذِىْ
جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾
وَهُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً
طَهُوْرًا ۙ﴿۴۸﴾ لِّنُحْيِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِىَّ كَثِيْرًا ﴿۴۹﴾
وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾ وَلَوْ
شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِىْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴿۵۱﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ
جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾ وَهُوَ الَّذِىْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ
اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾ وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ
بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۭ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴿۵۴﴾ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۭ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿۵۵﴾ وَمَآ
اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۵۶﴾ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ
شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِىْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ
بِحَمْدِهٖ ۭ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرَۨا ﴿۵۸﴾ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۛ اَلرَّحْمٰنُ
فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿۵۹﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۤ

اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿۶۰﴾

(اے مخاطب!) بھلا تُو نے اپنے پروردگار (کی قدرت) کو نہیں دیکھا کہ وہ سائے کو کیسے پھیلا دیتے ہیں اور اگر وہ چاہتے تو اس کو ایک حالت پر ٹھہرا دیتے پھر ہم نے سورج کو اس (درازی و کوتاہی) پر علامت مقرر فرمایا ﴿۴۵﴾ پھر ہم نے اس کو اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹ لیا ﴿۴۶﴾ اور وہی ذات ہے جس نے تمہارے لیے رات کو پردہ اور نیند کو آرام بنایا اور دن کو اٹھ کھڑے ہونے کا وقت بنایا ﴿۴۷﴾ اور وہی ذات ہے کہ اپنی رحمت کی بارش سے پہلے ہواؤں کو خوشخبری بنا کر بھیجتی ہے اور ہم آسمان سے پاک (نتھرا ہوا) پانی برساتے ہیں ﴿۴۸﴾ تاکہ ہم اس سے مردہ زمین میں جان ڈال دیں اور اپنی مخلوقات میں سے چارپایوں اور بہت سے آدمیوں کو سیراب کریں ﴿۴۹﴾ اور ہم نے اس (قرآن) کو ان میں طرح طرح سے بیان فرمایا تاکہ نصیحت حاصل کریں سو بہت سے لوگ ناشکری کیے بغیر نہ رہ سکے ﴿۵۰﴾ اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں (انجامِ بد سے) ڈرانے والا بھیج دیتے ﴿۵۱﴾ تو آپ کافروں کی بات نہ مانیں اور اس (قرآن) کے مطابق ان سے پوری قوت سے جہاد کیجیے ﴿۵۲﴾ اور وہی ذات ہے جس نے دو دریاؤں (کے پانی) کو (صورۃً) ملا دیا۔ ایک (کا پانی) میٹھا ہے پیاس بجھانے والا اور ایک (کا) شور (اور) تلخ ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک آڑ اور مضبوط اوٹ بنا دی ﴿۵۳﴾ اور وہی ذات ہے جس نے پانی (نطفہ) سے آدمی کو پیدا فرمایا پھر اس کو خاندان والا اور سسرال والا بنایا اور (اے مخاطب!) تیرا پروردگار بڑی قدرت والا ہے ﴿۵۴﴾ اور (باوجود اس کے) یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ ان کو نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ ان کو نقصان پہنچا سکتی ہے اور کافر اپنے پروردگار کی مخالفت میں بہت زور مارتا ہے ﴿۵۵﴾ اور ہم نے آپ کو صرف خوشی اور عذاب کی خبر سنانے کو بھیجا ہے ﴿۵۶﴾ فرما دیجیے کہ مَیں اس پر تم سے کوئی اجرت

نہیں مانگتا ہاں جو شخص چاہے اپنے پروردگار کی طرف (جانے کا) راستہ اختیار کرے ﴿۵۷﴾ اور اس (اللہ) زندہ پر بھروسہ رکھیں جو (کبھی) نہیں مریں گے اور اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے رہیے اور وہ اپنے بندے کے گناہوں سے خبر رکھنے کو کافی ہیں ﴿۵۸﴾ جس ذات نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے، (سب کو) چھ دن میں پیدا فرمایا پھر عرش پر قائم ہوا، وہ بڑا مہربان ہے پس اس کی شان کسی جاننے والے سے پوچھنا چاہیے ﴿۵۹﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس بڑے مہربان (رحمٰن) کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ بڑا مہربان (رحمٰن) کیا چیز ہے۔ کیا ہم اس کو سجدہ کرنے لگیں جس (کو سجدہ کرنے) کو تم ہم کو کہتے ہو۔ اور ان کو اور زیادہ نفرت بڑھتی ہے ﴿۶۰﴾

تفسیر ومعارف

رشتوں کا توازن، نظامِ زندگی کی روانی کا سبب ہے:

فرمایا، اے مخاطب تو دیکھتا نہیں کہ تیرے پروردگار نے ہر شے اور ہر کام میں ایک رشتہ قائم کر دیا ہے۔ سبب اور نتیجہ کا ایک دوسرے سے جو رشتہ ہے اس کی ایک مثال ارشاد فرمائی۔ فرمایا: اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۝ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ۝ (اے مخاطب!) بھلا تو نے اپنے پروردگار (کی قدرت) کو نہیں دیکھا کہ وہ سائے کو کیسے پھیلا دیتے ہیں اور اگر وہ چاہتے تو اس کو ایک حالت پر ٹھہرا دیتے پھر ہم نے سورج کو اس (درازی و کوتاہی) پر علامت مقرر فرمایا۔ پھر ہم نے اس کو اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹ لیا۔

اللہ کریم نے اس کائنات میں تعلقات کا ایک توازن قائم کیا ہے، نتائج کو اسباب سے متعلق کر دیا اور اسباب کو نتائج کے ساتھ رشتے کی لڑی میں پرو دیا ہے اور ان کے نتائج قطعی ہیں جنہیں ہر بندہ جانتا ہے۔ جیسے سورج کی روشنی اور سائے میں رشتہ ہے۔ فرمایا، کیا تم نہیں دیکھتے کہ قدرتِ باری نے چیزوں کو سایہ بخشا کہ دور تک پھیلا ہوتا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو اسے ایسے ہی رکھنے پر قادر تھا مگر اس نے سائے کے بڑھنے اور گھٹنے کو سورج اور دھوپ سے متعلق

کر دیا۔ سورج طلوع ہوتا ہے تو چیزوں کے سائے کتنے دور تک پھیلے ہوتے ہیں، لمبے نظر آتے ہیں۔ سورج اوپر اُٹھتا ہے تو سائے سمٹتے چلے جاتے ہیں، دھوپ اور گرمی کی تپش پھیلتی ہے۔ پھر جب سورج ڈھلتا ہے، غروب کی طرف جاتا ہے تو سائے دوبارہ پھیلنا شروع ہو جاتے ہیں اور جب رات ہوتی ہے تو غائب ہو جاتے ہیں، بلکہ ہوتے ہی نہیں۔ یہ رشتے، یہ اسباب و نتائج اللہ کریم نے دنیا کی آبادی اور بنی آدم کے آرام کا سبب بنائے ہیں۔

سایہ دیکھ کر وقت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ شروع شروع میں جو گھڑیاں بنیں اُن میں سائے سے ہی وقت ناپا جاتا تھا۔ زمین پر گھڑی بنا کر ایک ڈنڈا سا کھڑا کر دیتے اور اس سے پیمائش ہوتی کہ اتنا سایہ ہے اب یہ وقت ہوگا، اب اتنا سایہ ہے، یہ وقت ہوگا۔ اسے 'دھوپ گھڑی' کہا جاتا تھا۔ دھوپ اور سائے کا رشتہ اتنا قطعی اور یقینی ہے کہ واقعی اس سے صحیح اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اگر اللہ کریم چاہتے تو سورج بھی چلتا رہتا اور سائے بھی ایک جگہ کھڑے رہتے تو کون روک سکتا تھا۔ یہ اس کی حکمت ہے کہ اس نے چیزوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا ہے اور ان کے رشتے میں توازن کو معمورہ عالم (دُنیا) کی آبادی کا سبب بنایا ہے۔

فرمایا: وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾ اور وہی ذات ہے جس نے تمہارے لیے رات کو پردہ اور نیند کو آرام بنایا اور دن کو اٹھ کھڑے ہونے کا وقت بنایا۔

وہ ایسا قادر ہے کہ اس نے رات بنا دی جو سارے نظام پر چھا جاتی ہے اور اسے تمہارے لیے پردہ بنا دیا۔ کاروبار بند ہو جاتے ہیں، شور شرابا ختم ہو جاتا ہے اور ہر چیز سکون میں چلی جاتی ہے ہر کوئی پردے میں ہو جاتا ہے۔

اُسی قادرِ مطلق نے رات کے پردے میں نیند پیدا کر دی جو انسان کو آرام بخشتی ہے اور دن بھر وجودِ انسانی کام کاج میں جو توانائی خرچ کرتا ہے وہ پھر سے بحال کر دیتی ہے۔ انسان تھکا ہارا جب رات کو سو جاتا ہے تو صبح تازہ دم ہو کر اٹھتا ہے۔ سو نیند کو آرام کا سبب بنا دیا، توانائی بحال کرنے کا سبب بنا دیا۔ اگر رات کا پردہ نہ ہو اور رات میں بھی سورج چمکتا رہے گلیوں، بازاروں میں وہی شور شرابا رہے تو زندگی disturb ہو جائے۔ اگر آدمی کو آرام ہی نہ ملے تو وہ آخر کتنے دن چل سکے گا، کتنا کام کر سکے گا؟ جب یہ توازن بگڑتا ہے تو چیزیں تباہ ہونے لگتی ہیں۔

فرمایا: وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾ پھر رات کے بعد دن کو بنا دیا کہ ہمیشہ رات بھی نہیں رہتی بلکہ ایک مخصوص وقت کے لیے آتی ہے۔ اس کے بعد دن طلوع ہوتا ہے جو جاگ اٹھنے اور کام کاج کی دعوت دیتا ہے۔ لوگ تازہ دم ہو کر اٹھتے ہیں اور اپنے کام پر لگ جاتے ہیں۔ یہ ایک توازن ہے جسے بگڑنا نہیں چاہیے۔

رات اور دن اپنے اپنے وقت پر آتے ہیں۔ کوئی شخص دن بھر ویسے نہیں سو سکتا جیسے رات بھر نیند کے

مزے لیتا ہے۔ لوگ رات کو سوتے رہتے ہیں تو یہ ایک توازن ہے جس کا قائم رکھنا ضروری ہے۔ اگر یہ مجروح ہو جائے اور سارا سال دن ہی رہے، رات نہ آئے تو لوگ آرام کب کریں گے اور کام کب کریں گے۔ حالات یہ ہوں گے کہ کوئی سو رہا ہوگا کوئی کام کر رہا ہوگا کوئی بازار میں پھر رہا ہوگا تو یہ کیسے چل سکتا ہے؟ اسی طرح اگر برسوں رات مسلط رہے تو پھر نظامِ کائنات کیا ہوگا اور انسانی زندگی کس قدر دشوار ہو جائے۔ کاروبارِ حیات تو تب چلتا ہے کہ جاگنے کے وقت سب جاگ رہے ہوں اور آرام کے وقت آرام کر رہے ہوں۔

وہ ایسا قادر ہے کہ اس نے ہواؤں اور بارش میں ایک خوبصورت تعلق پیدا فرما دیا: وَهُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ۔۔۔ اور وہی ذات ہے کہ اپنی رحمت کی بارش سے پہلے ہواؤں کو خوشخبری بنا کر بھیجتی ہے۔ ہواؤں اور بارش میں اتنا مضبوط رشتہ ہے کہ خاص ہوائیں جب چلتی ہیں تو انہیں دیکھ کر ایک عام کاشتکار، ایک اَن پڑھ آدمی بھی اندازہ لگا لیتا ہے کہ آج پُروا چل رہی ہے آج بارش برسے گی۔ اُسے یہ کیسے پتا چلا کہ بارش آئے گی؟ اسے تجربے سے، علم سے پتا ہے کہ اللہ نے اس ہوا کے ساتھ بادلوں کا آنا جوڑ دیا ہے اور جب یہ ہوا آتی ہے تو بادل لے آتی ہے۔ یعنی ایسا مضبوط نظام ہے پروردگار کا جبکہ انسان اسے دیکھ کر جو کچھ سمجھ پاتا ہے وہ اس پر ہی نازاں ہو جاتا ہے۔ اس کا نظام تو بہت وسیع ہے اور انسان نے تو بہت تھوڑا جانا ہے۔ وہی مالک ہے قادر ہے جو اپنی رحمت سے ہواؤں کو بارش کی بشارت دینے والا بنا کر چلا دیتا ہے۔

فرمایا: وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾ اور ہم آسمان سے پاک (نتھرا ہوا) پانی برساتے ہیں۔

بارش برستی ہے تو صاف شفاف، پاکیزہ میٹھا پانی کتنی بلندیوں سے آسمانوں سے برسایا جاتا ہے جو حیات آفرین ہوتا ہے۔ دنیا کا تین چوتھائی حصّہ سمندر ہے۔ سمندر کا پانی سخت کڑوا، نمکیات سے بھرا ہوا اور سیاہ ہے۔ اگر سمندر کے پانی سے ہاتھ دھوئے جائیں تو خشک ہوتے ہی ہاتھوں پر نمک جمنا شروع ہو جاتا ہے۔ اسی پانی میں سے بخارات کو اٹھا کر ہواؤں کے دوش پر سوار کر دیتا ہے اور جب برساتا ہے تو بڑا میٹھا مزیدار صاف شفاف سفید پانی ہوتا ہے۔ اُسی کی قدرت ہے کہ اتنا پانی بادلوں میں موجود ہوتا ہے لیکن محسوس نہیں ہوتا اور کبھی بادل کہیں زیادہ گہرے ہوں تو زمین کے قریب بھی آ جاتے ہیں لیکن ان سے پانی نہیں بہتا۔ بادلوں میں سے جہاز گزرتے ہیں لیکن پانی نظر نہیں آتا نہ بہتا ہے لیکن جب اللہ انہیں برسنے کا حکم دیتے ہیں تو زمین سے پانی سنبھالا نہیں جاتا اور جل تھل کر دیتا ہے۔

فرمایا: لِّنُحْيِيَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿۴۹﴾ تاکہ ہم اس سے مردہ زمین میں جان ڈال دیں اور اپنی مخلوقات میں سے چار پایوں اور بہت سے آدمیوں کو سیراب کریں۔

بارش کا پانی سراپا حیات ہے کہ اس سے مردہ زمین کو پھر سے حیات بخشی جاتی ہے۔ زمین پر جب روئیدگی

نہ رہے تو یہ اس کی موت ہے۔ جب وہ سرسبز ہو جاتی ہے تو اس پر حیات ہوتی ہے جس کا سبب اللہ نے پانی کو بنا دیا ہے۔ کہیں دریا بہتے ہیں کہیں نہریں اور چشمے ہیں لیکن یہ ساری زمین کو سیراب نہیں کر سکتے۔ جب بارش برستی ہے تو بلندیوں، پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھی پانی بہتا ہوا نظر آتا ہے ہر جگہ کو سیراب کر دیتا ہے۔ یہ اللہ کی قدرتِ کاملہ ہے جو ہر جگہ اس کو پہنچا دیتی ہے۔ اسی پانی سے جانور بھی سیراب ہوتے ہیں اور بے شمار انسان بھی محض بارش کے پانی پر گزارا کرتے ہیں۔ جہاں کوئی دریا، چشمہ نہیں ہوتا وہاں بھی بارش پانی پہنچانے کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ سارے کام رشتوں ہی کی وجہ سے خوبصورتی اور آرام سے انجام پاتے ہیں۔ وہ رشتے جو اللہ نے اسباب اور نتائج میں رکھ دیے ہیں۔ سب اپنا اپنا کام کرتے ہیں اور روئے زمین پر زندگی آباد ہوتی ہے۔ ان رشتوں کا توازن اللہ ہی قائم رکھے ہوئے ہے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں ان میں تبدیلی فرمائی تو لوگوں پر تباہی آئی۔ اگر کبھی بارشوں میں کمی آ جائے تو زندگی تڑپنے لگتی ہے اور اگر بہت زیادہ بارشیں برسیں تو زندگی تباہ ہونے لگتی ہے۔ جیسے نوح علیہ السلام کی قوم پر وہی بادل برسے لیکن حد سے زیادہ برسے جس کے نتیجے میں کشتی میں سوار لوگوں کے سوا ساری قوم غرقِ آب ہوئی۔ اگر بارش نہ برسے تو قحط سالی ہو جاتی ہے بیماریاں پھیل جاتی ہیں انسان اور جانور مر جاتے ہیں تباہی پھیلتی ہے۔ کبھی بادلوں سے آگ برسی اور لوگ تباہ ہو گئے۔

نزولِ قرآن، رشتۂ زندگی نبھانے کے لیے ہے:

فرمایا: وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝ اور ہم نے اس (قرآن) کو ان میں طرح طرح سے بیان فرمایا ہے تاکہ نصیحت حاصل کریں سو بہت سے لوگ ناشکری کیے بغیر نہ رہ سکے۔

یہ ساری تمہید جو قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے کہ رشتوں کا توازن برقرار رہے تو معمورۂ عالم آباد رہتا ہے اور بگڑ جائے تو تباہی آ جاتی ہے یہ اس لیے ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ یہ سب رشتے اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ یہ نصیحت حاصل ہو کہ مالک اور بندے میں جو رشتہ ہے وہ کس قدر اہم ہے۔ اگر مخلوق کا رشتہ ربّ العالمین سے بگڑ جائے تو کیا ہوگا؟

انسانو! تمہارے اور تمہارے پروردگار کے درمیان جو رشتہ ہے اسے بھی قائم رہنا چاہیے جبکہ تمہارا ربّ اس کو اپنی طرف سے خوبصورتی سے نبھاتا ہے۔ تمہیں پیدا کیا، وجود عطا کیا، نعمتیں دیں اور شرفِ انسانی بخشا۔ اس شرفِ انسانی کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ بندہ بھی بندگی کا رشتہ نبھائے۔ اس رشتے میں بھی توازن رہنا چاہیے۔

اگر تم اس رشتے کو بگاڑ لو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ اگر یہ رشتہ ٹوٹے گا تو انسانی حیات کس قدر پریشان اور تباہ ہو گی۔ ہم نے قرآن اس لیے نازل فرمایا ہے کہ بندوں اور اُن کے مالک کا رشتہ قائم رہے لیکن لوگوں کی اکثریت نے اسے ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ کفر اور ناشکری کا راستہ اختیار کر کے اس رشتے کو تباہ کر دیا اور حیاتِ انسانی کو مصیبت و پریشانی میں ڈال رکھا ہے۔ آج دنیا میں عالم کفر میں انسانی زندگی نہیں ملتی۔ ہر شخص اپنی اپنی زندگی جیتا ہے اور نفسانفسی کے عالم میں زندگی گزار کر مر جاتا ہے۔

اگر مسلمان بھی اللہ کے ساتھ تعلقات میں توازن برقرار نہیں رکھیں گے تو اُن کے لیے زندگی کا مقصد صرف مادّی راحتیں بن جائے گا۔ سو فرمایا، جب بندے اور اس کے مالک کے تعلقات بگڑتے ہیں، توازن بگڑتا ہے تو وہ مالک الملک ہے، تباہی تو بندے ہی کی طرف آئے گی۔ جس طرح سورج اور سائے میں رشتہ ہے، بادلوں ہواؤں اور بارشوں میں رشتہ ہے، رات اور دن میں رشتہ ہے اُسی طرح اللہ کی یاد، اللہ کی عبادت، اطاعت اور مخلوق کے درمیان رشتہ ہے۔

اگر بادلوں اور بارش، رات اور دن کے رشتے میں فرق آنے کا کوئی تصور نہیں کر سکتا تو پھر یہ ہم نے کیسے سوچ لیا کہ ہمارا رشتہ اللہ سے خراب ہو جائے تو خیر ہے۔ خیر نہیں ہو گی، تباہی ہو گی۔

معلمِ انسانی (صلی اللہ علیہ وسلّم):

دنیا میں کفر و ناشکری بہت ہے جس کے نتیجے میں انسانی معاشرے میں بے شمار خرابیاں بھی ہیں جن کی اصلاح بہت بڑا کام ہے سو فرمایا: وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴿۵۱﴾ اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں (انجام بد سے) ڈرانے والا بھیج دیتے۔

دنیا کی آبادی بہت بڑھ گئی اور کفر اور اللہ کی ناشکری سے معاشرہ تباہی کی طرف چل نکلا تو اگر اللہ کریم چاہتے تو ہر آبادی ہر بستی میں ایک نبیؑ مبعوث فرما دیتے جو اُن لوگوں کو نافرمانی کے اثراتِ بد اور تکلیف دہ نتائج سے خبردار کرتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ یہ سارا کام آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو ہی کرنا ہے۔ کائنات کی جتنی وسعت ہے اس کے لیے ایک ہی معلم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کافی ہیں۔ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو وہ قوت اور علوم و برکات کا بے بہا خزانہ عطا ہوا جو قیامت تک آنے والی ساری انسانیت کے لیے کافی ہے۔ ساری کائنات اور تمام انسانیت کی تمام خرابیوں کا حل اور سارے سوالوں کا جواب آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ہی کی ذات ہے۔ اللہ کریم کا احسان ہے کہ انسانوں کو زندگی کا نصاب دے دیا اور ساتھ معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلّم عطا فرمائے جو اپنی بعثت سے لے کر

قیامت تک سارے انسانوں کو اللہ کی طرف سے تعلیم دینے والے، ہدایت کی راہنمائی دینے والے ہیں۔

اب کوئی جہاں بھی بستا ہے، صحرا میں یا بلند پہاڑوں پہ بستا ہے، جزیرے پر ہے، خشکی یا سبزہ زاروں میں ہے سب کے لیے اللہ سے تعلق قائم کرنے کا یا نظامِ حیات کا طریقہ وسلیقہ سیکھنے کے لیے ایک ہی ہستی سے راہنمائی لینی ہوگی۔ مخلوق کے تمام سوالوں کے جواب صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس ہیں۔ اُن پر نازل کی گئی کتاب قرآن کی شکل میں موجود ہے۔ اب قیامت تک کسی دوسرے نبیؐ کی ضرورت ہی پیدا نہیں ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر نبوت مکمل ہوگئی، دین مکمل ہوگیا اور کوئی ایسا سوال عہدِ جدید کا بھی نہیں جو تشنہ رہ جائے۔

کفار کی پیروی کی ممانعت:

فرمایا: فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ ۔۔۔ تو آپ کافروں کی بات نہ مانیں۔ کافر سے تعلقات کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ کافر کی پیروی نہ کی جائے اس لیے کہ وہ اللہ سے دور ہے اور اس کی پیروی کرنے والا بھی دور ہو جائے گا۔ عقائد میں ہرگز کافر کی پیروی نہیں کی جائے گی کہ اس کے عقائد کافرانہ ہیں جبکہ آپ ایمان لائے ہیں۔ ان میں رات دن کا فرق ہے۔ معاملاتِ دنیا میں بھی کافر کی پیروی نہیں ہوگی اس لیے کہ کافر کو حلال، حرام، پاکی، پلیدی کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ جبکہ مومن حلال کا پابند ہے اور حرام سے اسے بچنا ہے، مومن پاک کا پابند ہے اور ناپاک ناجائز سے اسے بچنا ہے۔ حتیٰ کہ رسوم ورواج اور حلیے اور لباس تک میں کافر کی پیروی منع ہے۔ جب چھوٹی چھوٹی چیزوں سے رکیں گے تو ہی بڑی بڑی چیزوں سے رک سکیں گے۔

علمائے حق فرماتے ہیں کہ نفس اور شیطان کے ساتھ نفلوں پر جھگڑا کرو یعنی نفس کہے گا کہ چھوڑو نفل کی اتنی اہمیت نہیں، شیطان کہے گا نفل میں کیا رکھا ہے۔ اگر بندہ نفل چھوڑ دے گا تو پھر اگلی بات سنت پر ہوگی۔ وہ کہے گا کہ سنت کیوں پڑھتے ہو، فرض پڑھ لو۔ جب سنت چھوڑ دے گا تو جھگڑا فرض پر آجائے گا۔ شیطان کہے گا کہ اس کی کیا ضرورت ہے؟ کیوں رات دن لگے رہتے ہو۔

علمائے حق فرماتے ہیں کہ بہتر ہے کہ شیطان سے مستحبات پر جھگڑا کیا جائے۔ ان کاموں پر جن کا کرنا باعثِ ثواب ہے اور چھوڑنا گناہ نہیں ہے یعنی مستحبات میں محنت کرو تو پھر آپ کے نوافل، سنتیں اور فرائض محفوظ رہیں گے۔ اگر پیچھے ہٹتے جائیں گے تو دشمن آگے بڑھتا آئے گا اور لڑائی گھر میں آجائے گی۔ سو کافر کی بھی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے اختلاف کریں گے تو آپ اس کی پیروی سے محفوظ رہیں گے لیکن اگر اس جیسا بننا پسند کریں تو پھر کافر کے بڑے بڑے گناہ بھی آپ کو چھوٹے لگیں گے۔

علامہ ابن خلدون نے مقدمہ ابنِ خلدون میں لکھا ہے کہ جس قوم کا حلیہ اور لباس اپنایا جاتا ہے پھر اس قوم کی بہت سی برائیاں بندے کی نگاہ میں ہلکی ہو جاتی ہیں۔ وہ کہتا ہے خیر ہے یہ بھی ٹھیک ہے، ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ یوں آہستہ آہستہ بندہ اسی میں غرق ہو کر تباہ ہو جاتا ہے۔

جہاد:

کافروں کی پیروی نہ کیجیے اور دوسری بات یہ ہے فرمایا: وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾ اور اس (قرآن) کے مطابق ان سے پوری قوت سے جہاد کیجیے۔

جہاد، جہد سے مشتق ہے اور انتہائی کوشش، تھکا دینے والی محنت کو 'جہد' کہتے ہیں۔ اگر کافر کی اصلاح کے لیے کوشش کی جائے اس تک کلمہء حق پہنچانے کے لیے تبلیغ کی جائے تو یہ بھی جہاد ہے۔ احقاقِ حق کے لیے، لوگوں کی راہنمائی کے لیے کتابیں لکھی جائیں، حق بیان کیا جائے محنت کی جائے تو یہ بھی جہاد ہے۔

جہاد بالسیف، قتال کی نوبت تب آتی ہے جب کافر مسلمان کے ساتھ زیادتی کرے اور اُن پر چڑھ دوڑے تو دفاع کے لیے تلوار یا بندوق اٹھانا جہاد ہے۔ اس کے بھی قواعد وضوابط ہیں۔ اگر کافر کا شر دفع ہو جائے تو یہ اجازت نہیں ہے کہ پیچھے جا جا کر اُسے مارتے رہیں۔

جہاد بالسیف کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا اعلان مسلمان حکمران یا حکومت کرے۔ یہ انفرادی کام نہیں ہے کہ جس کے دل میں آئے وہ بندوق اٹھا لے اور جسے چاہے قتل کر دے۔ ایسا کرنا جہاد نہیں فساد ہے کہ جسے جانتے نہیں جس کا کوئی گناہ نہیں اُسے خوامخواہ قتل کر دو۔ یہ جہاد نہیں ہے۔ مسلمان حکومت جب اعلانِ جہاد کرے تو اس کے قاعدے اور ضابطے کے تحت لڑنا جہاد ہوگا ورنہ فساد، ظلم یا زیادتی کی اجازت نہیں ہے۔

عہدِ نبوی علٰی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں جتنے غزوات وسرایہ ہوئے سب دفاعی تھے اور سب میں ابتدا کافروں کی طرف سے ہوئی۔ اہلِ مکہ نے بدر میں چڑھائی کی، اُحد میں چڑھائی کی اور جتنے بھی معرکے ہوئے سب میں کفار کی طرف سے سرکشی اور پہل ہوئی جبکہ مسلمانوں نے دفاع کیا۔ حتیٰ کہ ایرانی سلطنت بھی عرب پر چڑھ دوڑی اور قیصرِ روم بھی اسلامی ریاست کو مٹانے کے لیے تیار ہو گیا لہٰذا ایرانیوں سے بھی جنگ ہوئی اور قیصر سے بھی جہاد ہوا۔

اسلام میں کسی کو بلاوجہ فتح کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی نہ ہی اس کی اجازت دی جاتی ہے۔ ساری جنگیں دفاعی لڑی جاتی ہیں۔ ہاں کافر تک دین پہنچانا ضروری ہے، اللہ کی بات پہنچانا فرض ہے اور چاہیے کہ اچھے

طریقے سے، عزت واحترام سے اور اپنے اچھے کردار سے اسے دعوت دی جائے۔

اللہ کریم کی قدرتِ کاملہ:

فرمایا: وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ۔۔۔اور وہی ذات ہے جس نے دو دریاؤں (کے پانی) کو (صورۃً) ملا دیا۔ ایک (کا پانی) میٹھا ہے پیاس بجھانے والا اور ایک (کا) شور (اور) تلخ ہے۔

وہ ایسا قادر ہے کہ اس نے دو طرح کے پانی بنا دیے کڑوا اور میٹھا اور دونوں اپنی خصوصیات کے ساتھ اس زمین میں موجود ہیں۔ اسی زمین کے تین حصّوں پر گہرے سیاہ سمندر چھائے ہوئے ہیں جن کا پانی تلخ اور کڑوا ہے۔ مگر جب اللہ چاہتا ہے تو بادل اٹھاتا ہے بارش برساتا ہے اور ٹھنڈے میٹھے پانی کے خوبصورت چشمے، ندیاں نہریں جاری کر دیتا ہے۔ چوٹیوں پر برف کے خزانے جمع کر دیتا ہے۔ کیا سمندر کا کڑوا پانی زمین کے میٹھے پانی کو جذب کر لیتا ہے؟ کیا سمندر کی وجہ سے دریا یا چشمے کڑوے ہو گئے ہیں؟ اس لیے کہ، وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾ اور ان دونوں کے درمیان ایک آڑ اور مضبوط اوٹ بنا دی۔

یہ پانی کبھی ایک دوسرے کو مغلوب نہیں کر سکے اس لیے کہ ان کے درمیان ایک نظر نہ آنے والی حدِ فاصل ہے۔ اللہ نے ان کے درمیان پردہ بنا دیا ہے جو انسان کو نظر نہیں آتا لیکن اپنی جگہ موجود ہے اور کام کر رہا ہے۔ میٹھا، میٹھا رہتا ہے اور کڑوا تلخ رہتا ہے۔ بعض اوقات زمین میں ایک جگہ نلکا لگایا جائے تو کڑوا پانی نکلتا ہے اور تھوڑے ہی فاصلے پر لگائیں تو میٹھا آ جاتا ہے۔ یہ دونوں پانی ملتے کیوں نہیں؟ اس لیے کہ اللہ کریم نے بَرْزَخًا۔۔۔ان کے درمیان پردہ ڈال دیا ہے، وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا۔۔۔انہیں الگ کر دیا ہے۔

اگر وہ اپنی قدرتِ کاملہ سے کافر اور مومن کو بھی الگ کرنا چاہتا تو اسی طرح کر دیتا جس طرح میٹھا اور کڑوا پانی ہے، رات اور دن ہے دھوپ اور چھاؤں ہے۔ دین یہی ہے کہ تمہیں اختیار دیا ہے کہ کفر میں ڈوبنا چاہتے ہو یا حق پر رہنا چاہتے ہو۔ یہ تمہارا اپنا انتخاب ہے اور یہی آزمائش ہے کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت اور غلامی کرنا چاہتے ہو یا پھر کافروں کی طرح جینا چاہتے ہو۔

تم اپنے رشتے ناتے کس طرح نبھاتے ہو، کاروبار کس انداز میں کرنا چاہتے ہو۔ اگر کافرانہ انداز اپناؤ گے تو عنداللہ جوابدہی ہوگی اور اگر مومنانہ انداز اپناؤ گے تو اللہ کریم راضی ہوں گے اور انعامات سے نوازیں گے۔ یہی اختیار انسان کو دیا گیا ورنہ وہ قادر ہے چاہتا تو کافر اور مومن کو الگ الگ کر دیتا جیسے کڑوے اور میٹھے پانی کو کر دیا۔ یہی

آزمائش ہے اور اسی پر قائم رہنے کا نام دین ہے۔

کیا سمندر کی کڑواہٹ، کثرت اور سیاہی بارش کے عمل کو روک سکتی ہے؟ ہرگز نہیں سو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنا کام جاری رکھیں، محنت جاری رکھیں جو قبول کریں گے اللہ انہیں کفر کے سمندر سے نکال کر میٹھا چشمہ بنانے پر قادر ہیں۔

تخلیقِ انسانی اور رشتے:

اب کلام کا رخ انسان کی طرف ہوا، فرمایا: وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۔۔۔اور وہی ذات ہے جس نے پانی (نطفہ) سے آدمی کو پیدا فرمایا پھر اس کو خاندان والا اور سسرال والا بنایا۔

اللہ کریم وہ عظیم خالق ہے، ایسا قادرِ مطلق ہے، ایسا کاریگر ہے کہ اس نے انسان کی تخلیق پانی سے فرمائی۔ ذرّاتِ خاکی کو پانی بنانے تک کتنی منازل اور مراحل سے گزارتا ہے۔ کتنی کڑیاں مل کر کتنی ترتیب سے یہ کام ہوتا ہے۔ خاکی ذرّات کو مختلف غذاؤں، دواؤں کی صورت دیتا ہے۔ کہیں جڑی بوٹیوں کی، کہیں پھل دار درختوں کی صورت بنتے ہیں اور جانوروں کی غذا بن جاتے ہیں پھر جانوروں کا گوشت اور دودھ انسان کی غذا بن جاتے ہیں۔ وہ ذرّاتِ خاکی جن سے مل کر انسانی وجود بنتا ہے وہ پانی کی شکل اختیار کرتا ہے اور اسے پشتِ پدر میں محفوظ کر دیتا ہے پھر وہ شکمِ مادر میں جاتا ہے۔ اس کے بعد بچہ بننے تک پھر کتنی ترتیب ہے اور ذرّات سے انسان بننے تک کتنی نسبتیں ہیں کتنے لمبے رشتے ہیں کہ کہیں سے ایک کڑی بھی ٹوٹ جائے تو یا تو انسانی وجود بنتا ہی نہیں اور بن جائے تو ناقص ہوگا، معذور یا بے کار ہوگا۔ جب دنیا میں انسان وارد ہوتا ہے تو اس کے مختلف رشتے بن جاتے ہیں۔ والدین سے نسبی رشتے، خاندانی رشتے نصیب ہوتے ہیں پھر شادی ہوتی ہے تو سسرالی رشتے وجود میں آتے ہیں اور پھر آگے انسانوں کی تخلیق ہوتی ہے، اسی ترتیب سے ہوتی ہے۔ اس ترتیب میں اگر کوئی رابطہ ٹوٹ جائے تو نقصان دہ ہوتا ہے۔ والدین سے اگر رشتہ ٹوٹتا ہے تو نافرمان کہلاتا ہے۔ سسرال سے رشتہ ٹوٹتا ہے تو نوبت طلاق تک پہنچ جاتی ہے اور دوستی کی بجائے بات دشمنی اور قتل و غارت گری تک چلی جاتی ہے۔ یہ سارا نظام ان رشتوں سے ترتیب دیا گیا ہے۔ جس طرح ان رشتوں کی حفاظت سے انسان وجود میں آتا ہے اور ان رشتوں کی حفاظت سے انسان دنیوی امور انجام دیتا ہے، اسی طرح جو رشتہ مالک اور مملوک، عابد و معبود میں ہے، اس کا جو رشتہ اللہ کریم سے ہے یعنی عبودیت کا، اسے بھی پوری تندہی سے قائم رکھنا چاہیے۔ اگر یہ بندگی کا رشتہ ٹوٹے گا تو خرابیاں ہوں گی اور ظاہر ہے کہ اس کا نقصان بندے کو ہوگا

کہ اللہ کریم کی ذات تو اس سے بالاتر ہے۔

ترتیب اور تدریج کائنات کا حُسن ہے:

فرمایا: وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ﴿٥٤﴾ (اے مخاطب!) تیرا پروردگار بڑی قدرت والا ہے۔ آپ کا پروردگار تو ہر طرح کی قدرت رکھتا ہے اگر وہ چاہتا تو آنِ واحد میں زمین و آسمان بن جاتے یا انسان آنِ واحد میں زمین و آسمان سے پیدا ہونا شروع ہو جاتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ایک ہی بندے سے بندے بنتے چلے جاتے لیکن اللہ کریم نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ہر کام میں ایک ترتیب رکھی ہے اور ہر ترتیب میں مختلف رشتے اور مدارج رکھے ہیں۔

کفار کی بدنصیبی:

فرمایا: وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۗ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلَىٰ رَبِّهِ ظَهِيرًا ﴿٥٥﴾ اور (باوجود اس کے) یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ ان کو نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ اُن کو نقصان پہنچا سکتی ہیں اور کافر اپنے پروردگار کی مخالفت میں بہت زور مارتا ہے۔

جو لوگ کفر اختیار کرتے ہیں بہت بدبخت ہیں اور اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کرتے ہیں۔ یعنی اللہ کے ساتھ رشتہء عبدیت کو توڑ کر غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں جو اس رشتے کے ٹوٹنے سے پیدا ہونے والے نقصانات کا مداوا بھی نہیں کر سکتے۔ جو خود مخلوق ہے، محتاج ہے وہ دوسرے کی حاجت براری کیا کرے گا؟ اگر ان معبودانِ باطلہ کی پوجا نہ کی جائے تو کوئی رشتہ ہی نہیں ٹوٹتا، کچھ بگڑتا ہی نہیں اس لیے کہ وہ عبادت کے مستحق ہی نہیں ہیں اور یہ نہ کسی کا کچھ سنوار سکتے ہیں نہ ہی بگاڑ سکتے ہیں یعنی کسی قسم کا رشتہ نہ جُڑ سکتا ہے نہ ٹوٹتا ہے۔

کافر کی بدنصیبی یہ ہے کہ اس نے اللہ کی طرف سے منہ ہی موڑ لیا ہوا ہے حالانکہ اُس کا خالق اور رب بھی اللہ ہی ہے۔ اسی طرح ترتیب سے اُسے بھی ذرّاتِ خاکی سے پانی بنا کر پانی سے انسان بنایا۔ اُسے زندگی دی، صحت دی، مہلت دی، عقل و شعور، سماعت و بصارت عطا کی، گھر دیا اہل و عیال دیے۔ لیکن کافر اپنے ربّ کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہے۔ کافر پوری قوت سے اللہ کا انکار کر رہا ہے، نافرمانی کر رہا ہے اور بتوں کی پوجا کر رہا ہے لیکن اس کے انکار سے یا مخالفت سے اللہ کا کچھ بگڑتا ہے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا منصبِ عالی:

فرمایا: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٥٦﴾ اور ہم نے آپ کو صرف خوشی اور عذاب کی خبر سنانے کو بھیجا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا منصبِ عالی یہ ہے کہ آپ نیکی کرنے والوں کو، اللہ کی عبادت اور اطاعت کرنے والوں کو بشارت دے دیں، خوشخبری سنا دیں اور جو نافرمان ہیں انہیں اُن کی نافرمانی کے آنے والے انجام سے بروقت خبردار کر دیں۔ یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا منصبِ جلیلہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے جب اسے پورا کر دیا تو اب لوگوں پر ہے کہ وہ اللہ کریم کے ساتھ کیسا تعلق رکھنا چاہتے ہیں۔ کیا وہ اللہ کریم سے اطاعت کا تعلق رکھنا چاہتے ہیں یا نافرمانی کر کے اپنے تعلق کو بگاڑنا چاہتے ہیں، یہ اُن کا فیصلہ ہے۔

اللہ کریم تو ربّ ہے، ایک معلوم وقت تک کافروں کو روزی بھی دے گا اور فرصت بھی دے گا لیکن جب وقت ختم ہو جائے گا تو جو کفر کرے گا، برائی کرے گا وہ اس کا نتیجہ بھگتے گا۔ جو نیکی کرے گا وہ اس کا انعام پائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے کہ آپ خبر دے دیتے ہیں۔ مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کوہ صفا پر جلوہ افروز ہو کر مکہ کے مختلف قبائل کو اعلان فرما کر جمع فرمایا کہ آؤ میری بات سنو۔ صفا اور مروہ خاصی بلند پہاڑیاں تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اب اُن کے درمیان کا فاصلہ بھر گیا اور نشان رہ گئے ہیں۔

جب مکہ کے قبائل کوہ صفا کے سامنے جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے لوگوں سے فرمایا کہ تم لوگ مجھے کیسا جانتے ہو؟ سب نے کہا آپ صادق ہیں، امین بھی ہیں۔ آپ سچے ہیں، امانت دار ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا میں ایسی جگہ کھڑا ہوں جہاں میں پہاڑ کی دونوں اطراف دیکھ سکتا ہوں۔ اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ پہاڑ کی پچھلی طرف سے ایک فوج آ رہی ہے جو تم پر حملہ آور ہو گی اور تمہیں تباہ کر دے گی تو کیا تم مانو گے؟ انہوں نے کہا کہ اگر آپ ایسا کہیں گے تو ہم مان لیں گے اس لیے کہ آپ صادق ہیں، امین ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا پھر میں تمہیں اطلاع دیتا ہوں کہ اللہ کی عظمت کو مان لو، اللہ کی توحید کو اختیار کرو، اللہ کی اطاعت کرو ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ دوسری طرف دوزخ کا گڑھا ہے، اس میں جا گرو گے، سو منصبِ نبوت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے رسول ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے یہ دنیا بھی ہے اور آخرت بھی ہے۔ ہمارے سامنے تو یہی دنیا ہے اور اس کے حقائق سے بھی ہم پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ ہماری نظر تو اتنا ہی کام کرتی ہے کہ دور سے چیز دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں شاید کوئی جانور ہے قریب جاتے ہیں تو وہ جھاڑی ہوتی ہے۔ ہم کسی چیز کو بہت خوبصورت سمجھتے ہیں لذیذ سمجھتے ہیں لیکن کھاتے ہیں تو بیمار پڑ جاتے ہیں اس لیے کہ ہماری نگاہ صرف ظاہری رنگت پر تھی اس کے اثرات پر نہیں تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی نگاہ دونوں جہانوں پر ہے اور اس دنیا میں جو کام اطاعتِ الٰہی میں ہے اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم واقف ہیں اور ہر وہ کام جو اللہ کی نافرمانی ہے اس سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم آگاہ ہیں۔ چنانچہ ساری کائنات کی راہنمائی فرمانا اور اطاعت گزاروں کو انعامات کی بشارت سنانا اور نافرمانی اور برائی کے برے انجام سے بروقت مطلع کرنا یہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا منصب جلیلہ ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے، انسانیت پر اللہ کریم کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کو مبعوث فرما کر انسانوں کو آنے والے خطرے کی بروقت خبر دے دی جبکہ ابھی اُن کے پاس توبہ اور اصلاح کا موقع ہے۔

سو فرمایا کہ اگر کوئی کفر اور برائی پر ہی اصرار کرتا ہے تو اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا کوئی نقصان نہیں ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے رسول ہیں۔

اجر کی امید صرف اللہ سے رکھنی چاہیے:

فرمایا: قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾ فرما دیجیے کہ میں اس پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا ہاں جو شخص چاہے اپنے پروردگار کی طرف (جانے کا) راستہ اختیار کرے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم فرما دیجیے کہ میں تم سے کوئی معاوضہ یا چندہ نہیں مانگتا نہ ہی مجھے اقتدار کی ضرورت ہے کہ تم میرے ساتھ جتھا بن جاؤ اور مجھے اقتدار مل جائے۔ یہ میرا مقصد نہیں ہے۔ میں تمہیں اللہ کے احکام پہنچا رہا ہوں کہ یہ میرا فرضِ منصبی ہے اور اس کا معاوضہ مجھے تم سے نہیں چاہیے۔ مجھے میرا اجر اللہ کریم عطا فرمائیں گے کہ میں اللہ کی طرف سے کام کر رہا ہوں اور میرا مقصد یہ ہے کہ تم میں سے کوئی خوش بخت شاید اللہ کی راہ اختیار کر لے، اپنے ربّ سے رشتہ استوار کر لے جو خود اس کے لیے فائدہ مند اور ضروری ہے۔ مجھے تم سے کوئی اجرت یا معاوضہ نہیں چاہیے۔ علمائے حق فرماتے ہیں کہ دین کا کام وہی ہے جو بلا معاوضہ کیا جائے۔ دینی کام کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ اپنی روزی معروف طریقوں سے کمائیں جس طرح دوسرے لوگ کماتے ہیں اور اپنے اوقات میں دین کی خدمت کے لیے بھی وقت رکھیں۔ انہیں چاہیے کہ کاروبار کریں، مزدوری یا ملازمت کریں یا کاشتکاری کریں اور جائز وسائل اختیار کریں تا کہ لوگوں کے محتاج نہ ہوں۔ اب کوئی دین بیان کر سکتا ہے تو کرے، کوئی تبلیغ کر سکتا ہے، کوئی اچھا لکھ سکتا ہے تو اچھی اچھی کتابیں لکھ کر لوگوں تک پہنچائے جس طرح سے بھی دین پہنچایا جا سکتا ہے ضرور پہنچایا جائے۔ یہ ضروری ہے کہ دین کا کام کرنے والا اپنا رزق خود معروف ذرائع سے حاصل کر رہا ہو کسی کا محتاج نہ ہو۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جو بندہ کسی کا محتاج ہوتا ہے وہ اس کو سیدھی بات نہیں بتا سکتا وہ اسے وہی بات بتاتا ہے جسے سن کر وہ خوش ہو، خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ المختصر اگر دین بیان کرنے والے لوگ خود لوگوں کے محتاج ہوں گے تو وہ اللہ کا دین بیان نہیں کر سکیں گے۔ انہیں وہ باتیں کہنی پڑیں گی جو لوگوں کو پسند ہوں۔ انبیاؑ معاوضے کے محتاج نہیں ہوتے نہ کسی سے معاوضہ طلب کرتے ہیں اگر معاوضے کی بات آجائے گی تو پھر اللہ کی بات نہیں کی جا سکے گی۔

سو فرمایا، کہ انہیں فرما دیجیے کہ میں تم سے کوئی اجرت طلب نہیں کرتا نہ معاوضہ یا اجر چاہتا ہوں بلکہ تمہاری

بہتری اور بھلائی کے لیے ساری محنت کر رہا ہوں۔

اللہ کی ذات ہی بھروسے کے لائق ہے:

اگر کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات ماننے کو تیار نہیں ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا کچھ نہیں بگاڑ رہا بلکہ اپنا نقصان کر رہا ہے۔ فرمایا: وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ ۔۔۔ اور اس (اللہ) زندہ پر بھروسہ رکھیں جو (کبھی) نہیں مریں گے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم صرف اللہ پر بھروسہ کیجیے جو ہمیشہ زندہ ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا جس پر کبھی موت نہیں آئے گی۔ یعنی جس کی ذات میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ جس کی کسی طاقت، کسی قوت کو زوال نہیں آتا۔ جس کی ذات کو زوال ہے نہ جس کی صفات کو زوال ہے کہ اس کو کوئی سبب متاثر نہیں کر سکتا جو ہمیشہ سے قدرتِ کاملہ کا مالک ہے اور ہمیشہ کے لیے قادر ہے ہر چیز کر سکتا ہے۔ وہی ایک ذات بھروسے کے لائق ہے۔ جو ذوات خود تغیر پذیر ہیں وہ بھلا بھروسے کے قابل کیسے ہو سکتی ہیں!

اللہ کی تسبیح اور حمد کی حقیقی صورت:

فرمایا: وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ ۔۔۔ اور اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے رہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ پر بھروسہ کیجیے اور اس کی تسبیح کرتے رہا کیجیے اس کی پاکی بیان کیجیے۔ اسی کا نام لیتے رہیے اسی کی عظمت و کمالات بیان کرتے رہیے۔ اس کی اطاعت میں ہر لمحہ رہیے۔

ہمارے ہاں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ دین اور اور دنیا الگ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دین کو دنیا سے الگ کر دیا جائے تو دین کا مقصد کیا رہ جاتا ہے۔ دنیا کے کاموں کو اللہ کے حکم کے مطابق کرنا ہی دین ہے اور یہی عبادت بن جاتی ہے۔ اگر دنیا کے کام درمیان سے نکال دیں تو پھر لوگ دین پر عمل کیسے کریں گے، کہاں کریں گے؟ دین سے مراد ہے دنیا کے کاموں کو اللہ کے حکم کے مطابق کرنا۔ دنیا کے ہر کام میں ایک انسانی کی اپنی خواہش یا نفس کی رائے ہوتی ہے، ایک معاشرے کا دستور آجاتا ہے اور اس پر لوگوں کا اصرار ہوتا ہے کہ ایسا ہی کیا جائے اور ایک اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اللہ کا حکم پہنچایا ہوتا ہے کہ اس کام کو کرنے کا طریقہ یہ ہے، یہی درست طریقہ ہے۔ جب کام کو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بتائے ہوئے حکم کے مطابق کیا جائے تو وہی اللہ کی تسبیح بن جاتی ہے، حمد بن جاتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ عالی ہے کہ مومن کی دنیا بھی دین ہے کہ وہ دنیا کا ہر کام اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے۔

اللہ کریم بندوں سے خود آگاہ ہیں:

جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بات نہیں سننا چاہتے اور بدستور برائی، کفر کا ارتکاب کیے جا رہے ہیں، فرمایا:

وَ كَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا ﴿۵۸﴾ اور وہ اپنے بندے کے گناہوں سے خبر رکھنے کو کافی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا منصبِ جلیلہ نہیں کہ لوگوں کے گناہ شمار کریں یا اس پر دکھ کا اظہار کریں۔ اللہ اپنے بندوں کے جرائم سے خوب آگاہ ہے وہ خود ان سے نبٹ لے گا کہ یہ اس کا کام ہے کیونکہ وہ بندوں کے کردار سے لحہ بہ لحہ واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کون کیا سوچ رہا ہے، کیا کر رہا ہے، کیا کر چکا ہے اور کیا کرنے والا ہے۔ یہ سب اللہ خود جانتا ہے یہ اس کا اور اس کے بندوں کا معاملہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کی بات اس کے بندوں تک پہنچا دیجیے۔ جو آپ کا دامن تھام لیں، اُن کی راہنمائی کیجیے۔ جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے دامنِ خیر کو نہ تھام سکیں تو اُن کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ وہ خود جانتا ہے کہ کون کیا کر رہا ہے۔ یہ بندے اس سے چھپ کر بھلا کہاں جائیں گے۔

نظامِ کائنات کی تخلیق میں حسنِ ترتیب:

وہ ایسا قادر ہے کہ انسان تو کائنات کا ایک چھوٹا سا حصّہ ہے اس نے تو: الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ۔۔۔ جس ذات نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے، (سب کو) چھ دن میں پیدا فرمایا۔

اس ساری وسیع کائنات کو اللہ کریم نے خود عدم سے پیدا کیا کہ کچھ نہیں تھا اللہ نے اسے بنایا۔ خالق اس ہستی کو ہی کہا جا سکتا ہے جو عدم سے پیدا کرے جو اپنی قدرتِ کاملہ سے وجود بخشے۔ لفظ 'خالق' صرف اللہ ہی کو زیب دیتا ہے، یہ اسی کی صفت اور شان ہے۔

آج کل یہ رواج ہو گیا ہے کہ کوئی کتاب لکھتا ہے، شعر لکھتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس کتاب یا شعر کا خالق ہے۔ یہ خالق کیسے ہو گیا جبکہ الفاظ و حروف پہلے سے موجود تھے۔ قلم اور سیاہی پہلے سے میسر تھے؟ اگر موجود چیزوں کو جوڑ کر مضمون یا شعر لکھ دیے تو مصنف یا شاعر تو کہلا سکتا ہے خالق نہیں۔ خالق تب ہوتا اگر عدم سے وجود میں لاتا۔ اسی طرح موجود چیزوں کو جوڑ کر انسان اگر مشین، موٹر یا کپڑا بنا لے تو وہ خالق نہیں بن جاتا بلکہ موجد ہوتا ہے۔ وہ ایسا قادر ہے کہ ارض و سما اور ان کا سارا نظام اس نے چھ دن میں پیدا فرمایا۔ اس کی قدرتِ کاملہ تو ایسی ہے کہ جب 'کُن' کہتا ہے تو ہر چیز بغیر وقت ضائع کیے فوراً پیدا ہو جاتی ہے مگر اس کی یہ حکمت ہے کہ تخلیقِ کائنات میں اس نے ترتیب رکھی ہے۔ آسمان اور زمین جُڑے ہوئے تھے انہیں الگ کیا۔ زمین ایک نقطہ سا تھا جو پانی پر تیر رہا تھا جہاں

بیت اللہ شریف ہے۔ یہی مرکز ہے زمین کا اور یہاں سے ہی زمین کو پھیلایا گیا پھر آسمانوں کو الگ الگ سات آسمان بنادیے ان میں سورج، چاند، ستارے سجادیے۔ اس نے موسم اور ان کے اثرات بنادیے، اوقات اور تبدیلیوں کا رشتہ قائم رکھا۔ اللہ نے تخلیق میں حسنِ ترتیب رکھا ورنہ وہ قادر تھا پل بھر میں بنادیتا۔ اس نے رشتے سے رشتہ جوڑ کر ذرّے سے ذرّہ جوڑ کر زمین بنادی، آسمان بنادیے اور اُن میں بھی ترتیب رکھی۔

'استوٰی علی العَرشِ' کا مفہوم:

فرمایا: ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ۔۔۔ پھر عرش پر قائم ہوا۔ اللہ کریم نے عرش پر تمام کائنات کا مرکز بنا دیا کہ سارے نظام کی ڈور وہاں سے ہلتی ہے۔ ساری دعائیں، آرزوئیں تمنائیں عرش کو اٹھتی ہیں۔ عرش ہی وہ جگہ ہے جس پر دعا پہنچتی ہے اور جہاں سے تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں سارے احکام وہاں سے ہی جاری ہوتے ہیں، فرشتوں کو احکام ملتے ہیں۔ آج کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ کائنات کا سیکریٹریٹ ہے یعنی اس کو چلانے والا دفتر ہے۔

اس آیہ مبارکہ کے اس حصّے: ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ۔۔۔ پر بہت بحث کی گئی ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس سے مراد ہے کہ اللہ کریم عرش پر جلوہ افروز ہیں، کرسی پر بیٹھے ہیں۔ یہ محض اُن کے خیالات ہیں، حقائق نہیں ہیں۔

حق یہ ہے کہ اللہ کریم ہر جگہ ہر آن موجود ہیں اور کوئی جگہ اس کے لیے ایک جگہ نہیں بن سکتی اگر یہ مانا جائے کہ اللہ کریم کرسی پر بیٹھے ہیں تو کرسی پر بیٹھنے والی ایک حد تو معلوم ہوگئی اور جس کی حد معلوم ہوتی ہے وہ خود مخلوق ہوتا ہے۔ اللہ خالق ہے اور حدود سے بالاتر ہے۔ اس نے اتنی وسیع کائنات بنا کر عرش کو اس کا مرکز بنادیا۔

معرفت رکھنے والوں سے پوچھو:

فرمایا: اَلرَّحۡمٰنُ فَسۡـَٔلۡ بِہٖ خَبِیۡرًا ﴿۵۹﴾ وہ بڑا مہربان ہے پس اس کی شان کسی جاننے والے سے پوچھنا چاہیے۔

اللہ بہت ہی بڑا رحمت کرنے والا ہے۔ انسانی عقل کی وہاں تک رسائی نہیں جہاں تک وہ رحم فرماتا ہے۔ کائنات کا ہر ذرّہ اس کی رحمت کا محتاج ہے اور اللہ کی صفتِ رحمت دنیا میں رحمانیت کے طور پر جلوہ افروز ہے جس کا ظہور دنیا کی زندگی تک ہے۔ اس رحمانیت کے صدقے دنیا میں کافر بھی مستفید ہو رہا ہے۔ اس کو بھی زندگی، صحت، اولاد، گھر بار دولت مل رہی ہے۔ اس دنیا میں اللہ رحمٰن سب پر مہربان ہے لیکن کافروں کو یہ غلط فہمی ہے کہ وہ اپنی عقل اور محنت سے خود کو پال رہے ہیں جبکہ وہی رحمٰن انہیں بھی پال رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پہچان نہیں رہے اور ناشکری

کررہے ہیں۔اس کی رحمانیت سے ہی دنیا میں ہرایک کا گزر بسر ہورہا ہے، مومن بھی پل رہا ہے اور کافر کی پرورش بھی ہورہی ہے۔وہ تو اَلرَّحمٰن ہے، بہت بڑا رحم کرنے والا، اس کی شان تو جاننے والوں سے پوچھی جائے کہ ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔اللہ نے جن کو دینی علوم عطا کیے ہیں اُن سے پوچھو کہ اس کی شان کیا ہے اور وہ کیسا رحمٰن ہے۔اس کی عظمتیں کیا ہیں، اس کے بارے میں جاننے والوں سے پوچھو۔

ناشکری فاصلے بڑھا دیتی ہے:

فرمایا: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿۶۰﴾ السجدة

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس بڑے مہربان (رحمٰن) کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ بڑا مہربان (رحمٰن) کیا چیز ہے کیا ہم اس کو سجدہ کرنے لگیں جس (کو سجدہ کرنے) کو تم ہم کو کہتے ہو۔اور ان کو اور زیادہ نفرت بڑھتی ہے۔

جب کافروں سے کہا جائے کہ اس بڑے مہربان کی اطاعت کرو جس کے تم پر اتنے احسانات ہیں، اس کی بارگاہ میں سربسجود ہو جاؤ اور اس کی عظمت کا اقرار کرو۔اس کے احسانات دیکھو جس نے ذرّات کو جوڑ کر مختلف صورتیں دے کر مختلف کڑیاں ملا کر پانی کی ایک صورت میں ڈھالا پھر اس پانی سے انسان بنایا۔اس نے انسان کی ضروریات کی تکمیل کے ذرائع بنائے اسے نسبی اور سسرالی رشتے دیے، لیکن یہ کہتے ہیں وَمَا الرَّحْمٰنُ۔۔۔یہ رحمٰن کون ہے؟ تم اتنے ناآشنا ہو کہ کہتے ہو کہ رحمٰن کیا چیز ہے۔تم اپنے خالق سے رشتہ توڑ دیتے ہو۔جب اس کے سامنے سربسجود ہونے کا کہا جائے تو کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسے گئے گزرے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) جس کو کہیں ہم سجدہ کریں، ہرگز نہیں اور یوں ان کے دلوں میں مزید نفرت اور کدورت بڑھتی ہے۔فاصلے بڑھتے ہیں، حق سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔کسی دوسرے گمراہ گروہ میں چلے جاتے ہیں اور دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

سورۃ الفرقان رکوع 6 آیات 61 تا 77

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿۶۱﴾
وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ
شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا
خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا
وَّقِيَامًا ﴿۶۴﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ
عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۶۶﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ
اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾ وَالَّذِيْنَ لَا
يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ
وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا
فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۰﴾ وَمَنْ
تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ
الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ
لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿۷۳﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ
اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ

يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ﴿۷۵﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ
حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۷۶﴾ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ۚ
فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾

وہ ذات بڑی برکت والی ہے جس نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے (بُرج) بنائے اور اس میں ایک چراغ (سورج) اور روشن چاند بنایا ﴿۶۱﴾ اور وہ ذات ہے جس نے رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والے بنائے (اور یہ عمل) اس کے لیے جو سمجھنا چاہے یا شکر ادا کرنا چاہے ﴿۶۲﴾ اور رحمٰن (اللہ) کے (خاص) بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے (جہالت کی) بات کرتے ہیں تو وہ رفع شر کی بات (سلام) کہتے ہیں ﴿۶۳﴾ اور جو راتوں کو اپنے پروردگار کے سامنے سجدہ اور قیام میں لگے رہتے ہیں ﴿۶۴﴾ اور جو یہ دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! دوزخ کے عذاب کو ہم سے دور رکھیو۔ بے شک اس کا عذاب بہت تکلیف کی چیز ہے ﴿۶۵﴾ یقیناً وہ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت بُری جگہ ہے ﴿۶۶﴾ اور وہ لوگ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو بے جا نہیں کرتے اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے ﴿۶۷﴾ اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کی پرستش نہیں کرتے اور جس کے قتل کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے اس کو قتل نہیں کرتے ہاں مگر حق کے ساتھ (یعنی اگر اللہ کا حکم ہو تو) اور وہ زنا نہیں کرتے۔ اور جو شخص ایسے اعمال کرے گا سخت گناہ میں مبتلا ہوگا ﴿۶۸﴾ قیامت کے روز اس کا عذاب بڑھتا جائے گا اور وہ اس میں ہمیشہ ذلیل و خوار رہے گا ﴿۶۹﴾ مگر جو (شرک و گناہ سے) توبہ کر لے اور ایمان بھی لے آئے (عقیدہ درست کر لے) اور نیک کام کرتا رہے تو اللہ ایسے لوگوں کو ان کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائیں گے اور اللہ تو بخشنے والے مہربان ہیں ﴿۷۰﴾ اور جو توبہ کرتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے تو بے شک وہ

خاص طور پر اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے ﴿۷۱﴾ اور وہ لوگ بیہودہ باتوں میں شامل نہیں ہوتے اور اگر (اتفاقاً) بیہودہ باتوں کے پاس سے گزر ہو تو سنجیدگی سے گزر جاتے ہیں ﴿۷۲﴾ اور جب ان کو ان کے پروردگار کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے (غور و فکر سے سنتے ہیں) ﴿۷۳﴾ اور وہ لوگ دعا کرتے رہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک (راحت) عطا فرمایے اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا دیجیے ﴿۷۴﴾ ان لوگوں کو صبر کے بدلے اونچے اونچے محل دیے جائیں گے اور وہاں (فرشتے) ان سے دعا و سلام کے ساتھ ملاقات کریں گے ﴿۷۵﴾ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے وہ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت ہی عمدہ جگہ ہے ﴿۷۶﴾ فرما دیجیے کہ اگر تم (اللہ کو) نہیں پکارتے تو میرا پروردگار بھی تمہاری کچھ پروا نہیں کرتا تو یقیناً تم نے جھٹلایا ہے سو اس کی سزا (تمہارے لیے) جلد لازم ہوگی ﴿۷۷﴾

تفسیر و معارف

اجرامِ فلکی انسان کی خدمت پر مامور ہیں:

فرمایا: تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ﴿۶۱﴾ وہ ذات بڑی برکت والی ہے جس نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے (برج) بنائے اور اس میں ایک چراغ (سورج) اور روشن چاند بنایا۔

وہ ذات بہت برکت والی ہے جس نے انسان کی حیات کا اتنا وسیع نظام ایک بہت ہی خوبصورت انداز سے ترتیب دے کر ہر شے کو حتیٰ کہ اجرامِ فلکی کو بھی انسان ہی کی خدمت پر لگا دیا جو مدتوں سے اپنے اپنے کام سرانجام دے رہے ہیں۔

اس قادرِ مطلق نے آسمانوں کو پیدا فرمایا اور اس میں ستارے بنائے۔ ان کے چلنے کی راہیں اور منازل مقرر فرما دیں۔ سورج کو روشنی کا منبع بنا دیا اور چاند کو بنایا جو روشنیاں بانٹتا ہے۔ یہ نظام نہایت مربوط ہے اور عجیب ہے،

اسے نظامِ شمسی کہتے ہیں۔اس کے اثرات اوران اجرامِ فلکی میں توازن نے اللہ کی قدرتِ کاملہ پر مزید دلائل مہیا کر دیے اور یہ ثابت کر دیا کہ اتفاقات سے اس قدر مربوط اور منظم نظام نہ بنا کرتے ہیں اور نہ ہی اتنی مدتوں چلا کرتے ہیں۔ یہ نظام اتفاقات کی پیداوار نہیں ہے اسے پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہے اور وہی اسے چلا رہا ہے اور قائم رکھے ہوئے ہے۔

سورج کی روشنی سے زمین پر چیزیں اُگتی ہیں، نشوونما پاتی ہیں، پھل پکتے ہیں، بخارات بنتے ہیں۔ بادل بنتے ہیں بارش برستی ہے۔ چاند کی روشنی ان پکے ہوئے پھلوں میں مٹھاس بھرتی ہے، سمندر میں مدوجزر ہوتا ہے جس سے زیادہ آکسیجن والا پانی نیچے چلا جاتا ہے اور کم آکسیجن والا پانی اوپر آجاتا ہے اور یوں آبی حیات کے کام آتا ہے۔

آسمانی بروج یعنی اجرامِ فلکی کے ٹھکانے اوران کی مقرر کردہ راہوں پر علم نجوم کا مدار بھی ہے۔اس سے مراد ستاروں کا علم ہے کہ ستاروں کا مقام اوران کی چال کیا ہے۔ ستارے کہاں سے حرکت کرتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں اس سے بھی زمین پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ علم نجوم والے یہی اثرات دیکھتے ہیں اور لوگوں کو بتاتے ہیں لیکن یاد رہے کہ اگر اُن کی بات کو حتمی سمجھ کر یقین کیا جائے تو یہ کفر ہے۔ اگر اس کو اندازہ سمجھا جائے اور یہ خیال ہو کہ یہ اندازہ صحیح بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی تو اس میں برائی نہیں ہے۔ یہ یاد رکھا جائے کہ یقینی بات اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہے، اللہ کی کتاب کی ہے۔ اللہ ہی نے ستاروں کے راستے متعین فرمائے ہیں اور کوئی ستارہ قیامت تک اپنے راستے سے نہیں ہٹے گا نہ ہی اس کی رفتار یا اوقات میں تبدیلی آئے گی۔ اس نظام میں ہر چیز اپنے مقررہ اوقات پر کاربند ہے اور رواں دواں ہے۔

اگر اللہ چاہتا تو انسان بھی صرف اس کی اطاعت کرتا اور فرشتوں کی طرح رہتا لیکن اس نے چاہا کہ ساری کائنات تو اس کی حکم کی پابند ہے ایک ایسی مخلوق بھی ہونی چاہیے جو اپنی مرضی سے اس پر فدا ہو۔ اپنے فیصلے سے اس کی اطاعت کرے۔ یہ بہت بڑا مقام تھا جو انسان کو عطا ہوا۔ ساری کائنات میں صرف انسان کو معرفتِ الٰہی کی استعداد عطا ہوئی اور اسی سبب سے اشرف المخلوقات کہلایا۔ سو اگر کوئی اللہ کی عظمت کو جاننا چاہے تو ان اجرامِ فلکی پر ہی غور کر کے دیکھ سکتا ہے کہ اس قادرِ مطلق نے کس خوبصورتی سے یہ نظام ترتیب دیا ہے اور کتنے اہتمام سے یہ چلایا جارہا ہے۔

فرمایا: وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾ اور وہ ذات ہے جس نے رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والے بنائے (اور یہ عمل) اس کے لیے جو سمجھنا چاہے یا شکر ادا کرنا چاہے۔

اللہ کریم نے ایسا نظام بنایا ہے کہ رات اور دن مسلسل آتے چلے جاتے ہیں۔ ہر دن کا اپنا دورانیہ ہے کہ کتنے گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ رہے گا۔ دوسرا دن اس کے برابر نہیں ہوگا یا زیادہ ہوگا یا کم ہوگا۔ اسی طرح ہر رات کا اپنا دورانیہ ہے۔ ہر دن الگ ہے، ہر رات الگ ہے لیکن ہر دن اور ہر رات باقاعدگی سے اپنی باری پر آرہے ہیں اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اس نظام کو دیکھا جائے تو یَتَذَکَّرَ ۔۔۔ نصیحت حاصل کرنے کے لیے تو یہی کافی ہے کہ وہ کیسا قادر ہے کہ ہر لمحہ اس کے دستِ قدرت کا اسیر ہے جس لمحے کو چاہے رات بنادے اور جسے چاہے دن بنادے۔ ہر لمحہ اس کا بنایا ہوا ہے اور اس کے بنائے ہوئے نظام کا پابند ہے اور باقاعدگی سے چل رہا ہے۔ اگر لوگ اللہ کی عظمت جاننا چاہیں اس کا شکر ادا کرنا چاہیں تو اس کی تخلیقات میں غور و فکر، اس کے احسانات کو تسلیم کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔

علمائے کرام اس ضمن میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ بعض لوگ اللہ کی رضا کے لیے تلاوت کرتے ہیں، درود شریف پڑھتے ہیں، وظائف پڑھتے ہیں جو انہوں نے روزانہ اپنے لیے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ اگر کبھی اُن کے معمولات دن میں رہ جائیں تو وہ رات کو کرلیں۔ اگر انہوں نے یہ رات کے لیے مقرر کیا تھا تو کسی وجہ سے، بیماری یا کمزوری سے رہ جائیں تو دن کو کرلیں۔ اگر نماز قضا ہو جاتی ہے تو جیسے وقت ملے قضا پڑھ لو۔ سو فرماتے ہیں کہ یہ دن اور رات ایک دوسرے کے ساتھی ہیں آگے پیچھے آرہے ہیں۔

سو جو شکر ادا کرنا چاہے اور اللہ کی عظمت جاننا چاہے وہ اس نظامِ شب و روز کی باریکیوں کو دیکھ کر اندازہ لگا سکتا ہے کہ اللہ کی شان کتنی بلند ہے۔ اس کی تخلیق سے اس کی عظمت کی دلیل ملتی ہے جیسے کسی کی کاریگری سے کاریگر کا اندازہ ہوتا ہے۔ تصویر کو دیکھ کر مصوّر کا اندازہ ہوتا ہے تو کیا اتنی بڑی بارگاہِ حیات کو دیکھ کر خالق کی عظمت کا اندازہ نہیں ہوتا؟ کیسی عجیب بات ہے۔

عِبَادُ الرَّحْمٰن اور اُن کے اوصاف:

جنہیں اللہ کی عظمت کا اندازہ ہو جاتا ہے وہ پھر اللہ کے بندے بن جاتے ہیں۔ فرمایا: وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ ۔۔۔ اور رحمٰن (اللہ) کے (خاص) بندے وہ ہیں۔ وہ لوگ اس بہت بڑے رحم کرنے والے کے بندے بن جاتے ہیں اور بندہ بن جانے سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کی کامل اطاعت کرتے ہیں۔ اللہ کے مقابلے میں کسی اور کی اطاعت نہیں کرتے۔ اُن کے اوصاف یہ ہیں:

پہلا وصف:

فرمایا: الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا ۔۔۔ جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔

اللہ کے بندوں کی یہ صفت ہے کہ وہ زمین پر ظالمانہ اور جابرانہ تسلط نہیں چاہتے بلکہ وہ تو خود کو بندہ

ثابت کرنے میں کوشاں رہتے ہیں اور اپنے مالک کی پسند کو اپناتے ہیں۔ چنانچہ وہ زمین پر متکبرانہ انداز میں نہیں چلتے۔ اپنی شان و شوکت دکھانے کے لیے نہیں چلتے، اکڑ کر نہیں چلتے بلکہ عظمتِ الٰہی کو سامنے رکھ کر توازن و اعتدال سے نہایت دھیمے انداز میں چلتے ہیں۔ ان کی چال میں بھی ایک ادب ہوتا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ کسی کے بندے ہیں۔

دوسرا وصف:

فرمایا: وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ اور جب جاہل لوگ ان سے (جہالت کی) بات کرتے ہیں تو وہ رفعِ شر کی بات (سلام) کہتے ہیں۔ جب جاہل لوگ جو اللہ کی عظمت سے آشنا نہیں ہوتے ان سے اکھڑی اکھڑی بہکی بہکی بات کرتے ہیں تو یہ اللہ کے بندے اُن کے جاہلانہ اعتراضات کا جواب خوبصورت انداز میں دیتے ہیں۔ اگر جہلاء ان سے الجھنے کی کوشش کریں یا جھگڑا کرنا شروع کر دیں تو یہ اُن سے الجھتے نہیں۔ یاد رہے جہلاء میں وہ لوگ ہیں جو اللہ کی اطاعت سے دور ہیں خواہ کتنے پڑھے لکھے ہوں۔ عبادالرحمن ان جہلاء سے جھگڑتے نہیں کیونکہ اُن کا مقصد اپنا آپ منوانا نہیں ہوتا اور وہ سمجھ جاتے ہیں کہ جو اللہ کی عظمت سے دور ہے اس سے اُن کا کیا جھگڑا! سو وہ انہیں ایسا جواب دیتے ہیں جس میں اُن کی سلامتی کی بات ہو اگر وہ قبول کر لیں۔ کسی سے جھگڑتے نہیں نہ اپنی اَنا میں الجھتے ہیں بلکہ جو سیکھنے کے لیے پوچھتا ہے اس کی تربیت کرتے ہیں اور جو اعتراض کے لیے الجھتا ہے اسے بھی دعا دے کر رخصت کر دیتے ہیں کہ اللہ تمہیں ہدایت دے میں تمہارے ساتھ جھگڑا نہیں چاہتا۔

تیسرا وصف:

فرمایا: وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿۶۴﴾ اور جو راتوں کو اپنے پروردگار کے سامنے سجدہ اور قیام میں لگے رہتے ہیں۔

اللہ کے ان بندوں کی صفت ہوتی ہے کہ ان کی راتیں بھی قیام و سجود سے مزین ہوتی ہیں۔ جنہیں اللہ کی عظمت کا ادراک ہو جاتا ہے وہ جب کاروبارِ حیات سے الگ ہوتے ہیں، محنت مزدوری سے فارغ ہوتے ہیں راتوں کو اپنے گھر میں اپنی کٹیا میں جب آرام کرنے جاتے ہیں تو اُن کا آرام بھی یہ ہے کہ وہ اللہ اللہ کرتے ہیں۔ نوافل ادا کرتے ہیں قیام و سجود میں ہوتے ہیں۔ تلاوت کرتے ہیں تسبیحات کرتے ہیں۔ جب دوسرے لوگ تھک ہار کر سو جاتے ہیں یہ اپنے پروردگار کی عبادت اور شب بیداری میں کوشاں ہوتے ہیں۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ انسان بہت سے کام لوگوں کے سامنے نہیں کر سکتا لیکن تنہائی میں اپنے کمرے میں،

تاریکی میں کرسکتا ہے لیکن یہ اللہ کے بندے تنہائی میں بھی اس کی نافرمانی نہیں کرتے بلکہ اطاعتِ الٰہی پر کاربند رہتے ہیں۔ وہ ایسے نہیں ہوتے کہ لوگوں کے سامنے تو بڑے نیک اور پارسا ہوں اور تنہائی میں من مانی کریں۔ وہ تنہائی میں بھی بارگاہِ الٰہی میں حاضر رہتے ہیں۔ اطاعتِ الٰہی ہی میں قیام وسجود ہے۔

چوتھا وصف:

اللہ کے بندوں کا یہ وصف ہے کہ شب بیداری اور عبادت ان میں فخر پیدا نہیں کرتی بلکہ اللہ کی عظمت سے مزید آگاہ کرتی ہے اور وہ اپنی عبادت کو اس کی شان کے لائق نہیں جانتے اور دعا کرتے ہیں: وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ اور جو یہ دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! دوزخ کے عذاب کو ہم سے دور رکھیو۔ بے شک اس کا عذاب بہت تکلیف کی چیز ہے۔ یقیناً وہ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت بری جگہ ہے۔

یہ لوگ اطاعتِ الٰہی کرتے ہیں، نیکیاں کرتے ہیں اور پھر عظمتِ الٰہی سے ڈرتے ہیں کہ ہماری عبادت اس عظیم بارگاہ کے لائق نہیں ہے۔ جسے ہم نیکی اور عبادت سمجھ رہے ہیں جب اس کی بارگاہ میں جائے گی تو اس کی کیا حیثیت ہوگی تو وہ اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں دوزخ سے بچالے۔ ہم کمزور ہیں، انسان ہیں جو کرسکتے ہیں کررہے ہیں لیکن یہ تیری شان کے لائق نہیں ہے۔ ہمیں اپنی ذات سے دور نہ کر۔ ہم پر اتنی مہربانی فرمادے کہ ہمیں دوزخ کے عذابوں سے بچالے کہ اس کا عذاب بہت دکھ دینے والا تکلیف دینے والا ہے۔ دوزخ بہت ہی بری جگہ اور بہت برا ٹھکانہ ہے۔

یاد رہے! انسان مخلوق ہے اور اللہ کی بارگاہ بہت عالی شان ہے۔ بعض اوقات ہماری عبادتیں بھی گناہ بن جاتی ہیں۔ اب ہم نماز میں اللہ سے بالمشافہ گفتگو کرتے ہیں۔ اس کی تعریف بیان کرتے ہیں اس سے مخاطب ہوتے ہیں کہ اے اللہ! ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی ہر طرح کی مدد چاہتے ہیں۔ اب ہم باتیں اللہ سے کررہے ہوتے ہیں اور سوچیں کہیں اور ہوتی ہیں۔ وعدہ یہ کرتے ہیں اور نماز پڑھ کر جاتے ہیں تو لوگوں کے پاؤں پکڑ لیتے ہیں اُن سے مدد کے طلبگار ہوتے ہیں۔ نماز پڑھ کر جاتے ہیں تو ناجائز ذریعے سے کاروبار کرتے ہیں۔ دوکان پر بیٹھتے ہیں تو ملاوٹ کرتے ہیں یا کم تولتے ہیں۔ مزدوری پر جاتے ہیں تو کام صحیح طرح سے نہیں کرتے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ اس لیے کہ اللہ کی بارگاہ میں پورے خلوص سے حاضر نہیں ہوتے۔ ورنہ کسی عدالت میں یا کسی افسر کے پاس حاضر ہوں تو اپنی بات پورے دھیان سے پیش کرتے ہیں، کبھی خیال اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔

اللہ کے بندے ایسا نہیں کرتے۔ اہل اللہ کی نشانی یہ ہے کہ وہ اطاعت گزار ہوتے ہیں۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر قیام وسجود کرتے ہیں۔ عبادت کرتے ہیں اور پھر ڈرتے رہتے ہیں کہ میری نیکی کہیں اس بارگاہ میں جرم شمار نہ ہو اور اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ عذابِ جہنم سے بچالے وہ جانتے ہیں کہ جہنم بہت ہی بری جگہ ہے نہایت برا ٹھکانہ ہے۔

پانچواں وصف:

فرمایا: وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾ اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو بے جا نہیں کرتے اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔

اللہ کے بندے حلال اور جائز وسائل سے کما کر لاتے ہیں اور جو دولتِ دنیا ان کے پاس ہوتی ہے اُسے اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کرتے ہیں۔ اُسے فضول کاموں میں ضائع نہیں کرتے۔ اپنی شہرت یا دکھاوے کے لیے اُسے فضولیات پر نہیں خرچ کرتے اور نہ ہی بخیل بن کر دولت پر قابض ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ روکھی سوکھی کھاتے رہیں، بچے بھی بھوک سے مرتے رہیں اور یہ دولت جمع کرتے رہیں۔ اللہ کے یہ بندے اللہ کے حکم کے مطابق اعتدال سے اور خوبصورت انداز میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کا نظام درمیان درمیان میں اور بڑا مضبوط ہوتا ہے لہٰذا بڑا آرام دہ ہوتا ہے اس لیے کہ وہ فضول خرچی اور کنجوسی کے درمیان بہترین راستہ اختیار کرتے ہیں جس پر چل کر پریشانی نہیں ہوتی۔

آج کل ہر بندہ پریشان نظر آتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر نظر آنا چاہتا ہے۔ جس کے پاس لاکھوں ہیں، وہ چاہتا ہے کہ وہ کروڑ پتی نظر آئے۔ جو کروڑ پتی ہے وہ چاہتا ہے کہ میری نمائش ایسی ہو کہ لوگ مجھے ارب پتی سمجھیں۔ اس فضول مشغلے میں سوائے پریشانی کے کچھ نہیں ہے۔

اگر حیثیت سے بڑھ کر خرچ کیا جائے گا تو پریشانیاں بڑھیں گی۔ قرضے بڑھیں گے، جائز کاموں پر اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کیا جائے تو کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ آج ہماری سب سے بڑی مصیبت ہی یہ ہے کہ جس کی پانچ ہزار تنخواہ ہے اس کے اخراجات دس ہزار ہیں۔ اسلام نے جو نصابِ حیات دیا ہے اس کی یہ ہدایات ہیں کہ جائز حلال ذرائع سے کماؤ کسی کا چھینو نہیں اور جب خرچ کرو تو مرضیاتِ باری کے مطابق، اپنی حد کے اندر رہ کر خرچ کرو۔ سو اللہ کے بندے فضول خرچ ہوتے ہیں نہ ہی کنجوس بلکہ اعتدال کی راہ اپناتے ہیں۔

چھٹا وصف:

فرمایا: وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۔۔۔ اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کی پرستش

نہیں کرتے۔

اللہ کے بندوں کی یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے برابر کسی کو نہیں جانتے کہ کسی اور کی پسند کا کام کریں۔ وہ غیر اللہ سے امیدیں وابستہ نہیں کرتے بلکہ اپنی تمام امیدیں اللہ سے وابستہ رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جس سے امید وابستہ کی جائے اس کی اطاعت کرنی پڑتی ہے تو اللہ کو چھوڑ کر جس سے بھی امیدیں وابستہ کی جائیں گی وہ آپ کی امیدوں پر پورا نہیں اترے گا۔ اللہ کے بندوں کی امیدوں کا مرکز اللہ ہوتا ہے اور وہ اس کی ہر حال میں اطاعت کرتے ہیں۔ وہ لوگوں سے معاملات بھی اللہ کے منشا کے مطابق کرتے ہیں۔ اس کے دیے ہوئے ضابطوں کے مطابق کرتے ہیں۔ وہ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو پکارتے ہی نہیں۔

ساتواں وصف:

اللہ کے بندے ہر کام اللہ کی رضامندی کے لیے کرتے ہیں اور جن امور سے اللہ نے روک دیا ہے رک جاتے ہیں۔

فرمایا: وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۔۔۔اور جس کے قتل کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے اس کو قتل نہیں کرتے ہاں مگر حق کے ساتھ۔

اللہ کے بندے کسی کو اللہ کی اجازت اور حکم کے بغیر قتل نہیں کرتے یعنی ناروا ظلماً قتل نہیں کرتے۔ ہاں اگر اللہ کسی کے قتل کا حکم دے تو الگ بات ہے۔ کیونکہ جان وہی لے سکتا ہے جس نے جان دی ہے۔ جو زندگی دے نہیں سکتا وہ زندگی لے بھی نہیں سکتا۔

اللہ کریم نے ہر انسان کو زندہ رہنے اور پسند کا عقیدہ رکھنے کا حق دیا ہے۔ کسی کو زبردستی کلمہ نہیں پڑھایا جا سکتا۔ اگر تبلیغ کے باوجود کوئی کفر پر ہی رہنا چاہتا ہے تو رہے۔ اُسے زندہ رہنے کا حق ہے اور اس کے انسانی حقوق بھی بحال رہتے ہیں۔ کوئی اسے قتل کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ اللہ کے بندے کسی کو ناروا قتل نہیں کرتے۔ آج جو لوگ خودکش بمبار بنے ہوئے ہیں اور بے دھڑک لوگوں کو مار رہے ہیں۔ بچے، عورتیں، مرد مر رہے ہیں۔ مسجدوں میں بم پھٹ رہے ہیں، عبادت گاہوں میں پھٹ رہے ہیں، گولیاں چل رہی ہیں، یہ لوگ اللہ کے بندے نہیں ہیں۔ یہ شیطان کے بندے بن گئے ہیں اور وہ کام کر رہے ہیں جو اللہ نے حرام کر دیا ہے۔ جو سخت ممنوع ہے۔

البتہ اِلَّا بِالْحَقِّ ۔۔۔حق اور عدل کے ساتھ یہ حکومتِ وقت کا کام ہے کہ وہ فیصلہ کرے کہ کون سزائے موت کا حق دار ہے۔ یہ اس ادارے کا کام ہے جو معاشرے میں حقوق و فرائض کا نظام قائم رکھنے کا ذمہ دار ہے

جسے حکومت کہا جاتا ہے۔ ہر فرد یہ فیصلہ نہیں کر سکتا نہ ہی قانون ہاتھ میں لے سکتا ہے۔ ہم اگر کسی کو قتل ہوتا دیکھتے ہیں تو ہم عدالت میں گواہی دے سکتے ہیں لیکن قاتل کو قتل نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا کریں گے تو ہم بھی قاتل بن جائیں گے۔ اسی قاتل کو اگر عدالت سزائے موت سنائے اور وہ پھانسی لگ جائے تو عدالت کو کوئی قاتل نہیں کہے گا کیونکہ عدالت کا فیصلہ کرنے کا حق اللہ نے دیا ہے۔ لوگ اگر بندوقیں اٹھا کر دوسروں کو مارنا شروع کر دیں تو یہ حرام ہے اور اس کی پُرسش ہوگی کہ یہ بہت نازک معاملہ ہے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل سے ہم نے فرمایا تھا کہ ایک انسان کا قتل اتنا بڑا جرم ہے گویا قتل کرنے والے نے ساری انسانیت کو قتل کر دیا۔ ہر فرد انسانیت کا جزو ہے اور جزو کا حکم کُل پر نافذ ہوتا ہے۔ سو جس نے جزو کو قتل کیا اُسے کُل کا قاتل سمجھ کر محاسبہ کیا جائے گا۔ اس کی مثال دیکھی جا سکتی ہے کہ جس طرح سرکاری جنگلات محفوظ ہوتے ہیں تو اگر وہاں سے بلا اجازت کوئی شاخ بھی کاٹ لے تو اتنا جرم ہے جتنا درخت کاٹنے کا ہے۔ اس پھر وہی دفعہ لگائی جاتی ہے۔ اسی طرح انسانی زندگی کا معاملہ ہے کہ ایک جان ضائع کرنے والے نے گویا ساری انسانیت کو قتل کر دیا آج ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ قتل و غارت گری کو جہاد کا نام دیا جا رہا ہے جبکہ جہاد راہِ حق کے لیے کوشش کا نام ہے۔

آٹھواں وصف:

فرمایا: وَلَا يَزْنُوْنَ۔۔۔ اور وہ زنا نہیں کرتے۔

اللہ کریم کے بندے بدکاری نہیں کرتے۔ جائز اور حلال وسائل اختیار کرتے ہیں، نکاح کرتے ہیں بدکاری نہیں کرتے۔

انسان میں دو قوتیں بہت غالب ہوتی ہیں ایک ہے قوتِ غضبیہ اور دوسری قوتِ شہوانیہ۔ قوتِ غضبیہ سے مغلوب ہو کر، بھڑک کر انسان دوسروں کو قتل تک کر دیتا ہے۔ قوت شہوانیہ میں لالچ ہوتا ہے چیزیں حاصل کرنے کا، شہوت کا اور اس میں مبتلا ہو کر بدکاری بھی کرتا ہے اور دولت لے کر قتل بھی کر دیتا ہے۔

جو اللہ کے بندے ہوتے ہیں انہیں اللہ کریم یہ طاقت دیتے ہیں کہ وہ ان قوتوں سے مغلوب نہیں ہوتے بلکہ ہر کام اطاعتِ الٰہی میں کرتے ہیں۔ وہ اپنی ان انسانی قوتوں کو مغلوب رکھتے ہیں۔ وہ غضبناک ہو کر کسی کو قتل نہیں کرتے نہ ہی لالچ میں آ کر قتل کرتے ہیں اور نہ ہی برائی یا بدکاری میں ملوث ہوتے ہیں۔ گویا اللہ کے بندوں کی صفت ہے کہ ان کا کردار اللہ کے حکم کے مطابق ہوتا ہے۔ جو لوگ قتلِ ناحق اور بدکاری کرتے ہیں فرمایا: وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ اور جو شخص ایسے اعمال کرے

گا سخت گناہ میں مبتلا ہوگا۔ قیامت کے روز اس کا عذاب بڑھتا ہی جائے گا اور وہ اس میں ہمیشہ ذلیل وخوار رہے گا۔

جو لوگ یہ گھناؤنے جرائم کر رہے ہیں انہیں اندازہ ہی نہیں کہ وہ کتنا بڑا جرم کر رہے ہیں۔ ان دو جرائم کا ذکر قرآن میں روزِ قیامت کے حوالے سے خصوصی طور پر فرمایا ہے کہ ناحق قتل اور زنا، بدکاری کا عذاب قیامت کے دن دوگنا کر کے بڑھا کر دیا جائے گا اور انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آگ میں رہنا ہوگا۔ عجیب بات ہے کہ 'خلود فی النار' آگ میں ہمیشہ رہنے کی سزا تو کفر کی ہے پھر یہ سزا ان جرائم پر سنائی جا رہی ہے۔ حق یہ ہے کہ جو بندہ قتلِ ناحق کرتا ہے وہ اپنی بڑائی کے لیے دوسرے کو تباہ کر دیتا ہے اُسے عظمتِ الٰہی یاد نہیں رہتی۔ اگر کسی کو یہ بات یاد رہے کہ میں اللہ کے سامنے جوابدہ ہوں تو وہ کم از کم قتل ناحق نہیں کرتا۔ اگر کوئی زبانی کلمہ پڑھتا رہے اور یہ جرم کرے تو اس کا دل ایمان سے خالی ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادِ عالی کا مفہوم ہے کہ جب انسان بدکاری کرتا ہے، زنا کرتا ہے تو ایمان اُس کے دل سے نکل جاتا ہے۔ دو چیزیں اکٹھی نہیں رہ سکتیں کہ بندہ بدکاری بھی کر رہا ہو اور اس کے دل میں ایمان بھی موجود ہو۔

اس کا مطلب ہے کہ ناحق قتل کرنا اور بدکاری کرنا کفر ہی کی قسم ہے، انکار ہی کی قسم ہے۔ کافر قتل وغارت گری بھی کرے گا اور ہمیشہ ظالم ہوگا کہ ظلم نہ کرنا مسلمانوں کا شیوہ ہے اور کافر معاشرہ جنسی بے راہ روی کا شکار بھی رہے گا جسے کافر حکومتیں چاہیں بھی تو روک نہیں سکتیں۔ ان سے بچنا مومن کو ایمان کے سبب نصیب ہوتا ہے۔ جو معاشرے ایسے گھناؤنے جرائم میں ملوث ہوتے ہیں وہ ہدایت سے بہت دور ہو جاتے ہیں اور اُن پر عذاب کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔ یومِ حشر سخت ترین عذاب میں نہ صرف گرفتار ہوں گے بلکہ انہیں ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہنا ہوگا۔

ہاں! دنیا میں اس دلدل سے نکلنے کا راستہ ہے، فرمایا: اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا ۔۔۔ مگر جو (شرک وگناہ سے) توبہ کرے اور ایمان بھی لے آئے (عقیدہ درست کر لے) اور نیک کام کرتا رہے۔

اللہ کریم کی رحمت بے پناہ ہے اور ہر شئے سے وسیع تر ہے کہ اتنے بڑے جرائم پر بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا لہٰذا جب تک دنیا ہے، مہلت ہے کہ جو کچھ بھی کر چکا ہے توبہ کر لے۔ توبہ کیا ہے؟ فرمایا: وَاٰمَنَ ۔۔۔ اپنا عقیدہ درست کر لے۔ توبہ صرف زبانی توبہ کرتے رہنے کا نام نہیں ہے بلکہ گزشتہ پر اظہارِ ندامت اور آئندہ کے لیے اپنے کردار کی اصلاح کا نام توبہ ہے۔ چونکہ کردار ہمیشہ نظریات کے تابع ہوتا ہے لہٰذا عقیدہ اور عمل کو ٹھیک کرنے کا نام توبہ ہے۔ جو جرائم اس نے کیے ان کی وجہ سے اس کا ایمان خطرے میں ہے سو سب سے پہلے ایمان درست کرے۔ اللہ کو ویسا ماننے جیسا ماننے کا حکم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم دیتے ہیں۔ تمام ضروریاتِ دین کا اقرار کرے اور سچے دل

سے مانے اور وَعَمِلَ صَالِحًا ۔۔۔اپنے کردار کی اصلاح کر لے اور اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی فرمانبرداری میں آ جائے۔ ایسا کرنے سے اُسے کیا ملے گا؟ فرمایا: فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ۔۔۔تو اللہ ایسے لوگوں کو ان کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائیں گے۔

اللہ کریم کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ جو توبہ کر لے یعنی اپنا عقیدہ اور کردار درست کرے تو اللہ کریم اُس کے گناہوں کے بدلے میں بھی نیکیاں عطا کر دیں گے۔ یعنی نہ صرف گناہ معاف فرمائیں گے بلکہ اس کا نامہءاعمال جو گناہوں سے بھرا ہوا تھا اسے مٹا کر اس میں نیکیاں لکھ دیں گے اور اُن کا اجر عطا فرمائیں گے۔ یہ اس لیے کہ، وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿٧٠﴾ اور اللہ تو بخشنے والے مہربان ہیں۔ اللہ کریم بہت معاف کرنے والے بہت رحم کرنے والے ہیں۔

قرآنِ کریم کے اس انداز کو دیکھیں اور اللہ کریم کے ارشادات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو پتا چلتا ہے کہ جنت کا راستہ تو بڑا آسان ہے اور بہت شاندار ہے۔ حلال کماؤ جائز طریقے سے خرچ کرو۔ لوگوں کی جان مال و آبرو کو بھی اسی طرح جانو جیسے اپنی جان و مال کو سمجھتے ہو تو دنیا میں بھی عزت و احترام ملے گا۔ عمومی طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ نجات کا راستہ مشکل ہے حالانکہ قرآن کے مطابق جہنم جانا زیادہ مشکل ہے۔ زندگی میں دوزخ کے لیے مشقت کرنی پڑتی ہے، قتل کرنا بدکاری کرنا، لوٹ مار کرنا، رشوت لینا الغرض ہر برائی مشکل ہے اور اس کے ساتھ دنیوی مصائب بھی لگے ہوئے ہیں۔ ہر وقت پکڑے جانے سزا اور رسوائی کا ڈر رہتا ہے اور حکومتی ادارے اور قانون پکڑ لے تو جیل جانا پڑتا ہے، کوڑے لگتے ہیں۔ گویا مشکل راستہ تو جہنم کا ہے۔

رحمتِ الٰہی تو اتنی عام ہے کہ وہ توبہ کرنے والوں کے گناہ نہ صرف معاف فرمائے گا بلکہ برائیوں کی جگہ نیکیاں عطا کر دے گا کہ وہ بہت معاف کرنے والا بہت رحم کرنے والا ہے۔ ہم تو دامن چھڑا چھڑا کر عذاب کی طرف بھاگ رہے ہیں اور نتیجتاً ہم پر عذاب نازل ہو رہا ہے۔ ہمارا کردار اس حد تک مسخ ہو چکا ہے کہ ہم سے حلال حرام، جائز ناجائز، نیکی بدی کی تمیز اُٹھ گئی ہے اور صرف دولت کی ہوس آ گئی ہے۔ ہم عجیب لوگ ہیں، آئے روز اپنے ہاتھوں سے میتیں دفن کرتے ہیں پھر کیوں نہیں سوچتے کہ ایک دن ہمیں بھی اس طرح جانا ہے پھر کیوں لوٹتے ہیں؟ اسلامی ملک کہلانے کے باوجود حال یہ ہے کہ گوشت خریدنے بازار جائیں تو کہیں گدھے کا گوشت بیچا جا رہا ہے کہیں کتے کھلائے جا رہے ہیں۔ منڈی میں گرم مرغی اور ٹھنڈی مرغی بیچی جا رہی ہے۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ جو مرغی حرام ہو جائے یعنی مردہ ہو وہ ٹھنڈی مرغی ہے اور اس کے نرخ کم ہیں۔ یہ سب بازار میں بیچا جا رہا ہے۔ اب جو لوگ حرام کھائیں گے تو پھر اُن کا کردار کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ قرآن میں تو یہ قانون ارشاد ہوا ہے:

یَاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۔۔۔(المومنون:51) اے پیغمبرو! (آپ اور آپ کی امتیں) پاکیزہ چیزیں کھائیں اور نیک کام کریں۔

قرآن نے تو حلال کے ساتھ طیب کی قید لگائی ہے۔ یعنی حلال کمایا جائے اور پھر اس میں کوئی ناپاک چیز بھی نہ شامل کی جائے۔ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۔۔۔ اچھے کام کرو، صالح کردار اپناؤ گویا غذا پر کردار کا دارومدار ہے۔ اب جو قوم گدھے، کتے اور مردار گوشت کھا رہی ہو تو اس کا کردار کیا ہوگا اور اس طرح کے کردار پر تو عذاب ہی آئیں گے۔ آج ہم پر یہ کتنا عجیب عذاب ہے کہ ایک دوسرے کو بلاوجہ قتل کر رہے ہیں، قاتل مقتول کو جانتا تک نہیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے۔ خودکش حملہ آور خود بھی تباہ ہوتا ہے اور کتنے بے گناہوں کو تباہ کر دیتا ہے حالانکہ خودکشی پر جہنم کی وعید ہے لیکن وہ ایسا کرتا ہے۔

یہ عذابِ الٰہی ہے لہٰذا ہم سب کو اجتماعی توبہ کرنی چاہیے۔ اپنے کردار کی اصلاح کرنی چاہیے۔ جو لوگ چند پیسوں کے لیے کلمہ گو مسلمانوں کو حرام کھلا رہے ہیں انہیں سوچنا چاہیے کہ آخر کب تک یہ پیسے کھائیں گے۔ ایک بیماری ایسی آجائے تو یہی پیسے تھوڑے پڑ جائیں گے یا ایک مقدمے کے چکر میں پڑ گئے تو اتنے اخراجات ہو جائیں گے کہ یہ پیسے کم پڑ جائیں گے۔

فرمایا: وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ یَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾ اور جو توبہ کرتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے تو بے شک وہ خاص طور پر اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔

اس آیت میں پھر وہی بات دہرائی جا رہی ہے کہ جو توبہ کرے اور اپنے کردار کی اصلاح کر لے تو وہی صحیح توبہ کرنے والا شمار ہوگا اور اللہ کے نزدیک اس کے بندوں میں شمار کر لیا جائے گا۔ عملِ صالح کا معیار اور پہچان ایک ہی ہے۔ جس کام کو جس طرح کرنے کا حکم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا، اسی طریقے سے اس کام کو کرنا عمل صالح ہے۔ جو کردار اس کے خلاف ہے بالکل غلط ہے۔ چنانچہ جس نے توبہ کی اور کردار کی اصلاح کی، وہی صحیح توبہ کرتا ہے، زبانی توبہ توبہ کہنے سے فائدہ نہیں ہوتا۔

نواں وصف:

فرمایا: وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾ اور وہ لوگ بیہودہ باتوں میں شامل نہیں ہوتے اور اگر (اتفاقاً) بیہودہ باتوں کے پاس سے گزر ہو تو سنجیدگی سے گزر جاتے ہیں۔

عباد الرحمن کا اگلا وصف یہ ہے کہ وہ خرافات میں بیہودہ باتوں میں شامل نہیں ہوتے۔ یہ خرافات کون سی ہیں؟ ناچ گانے، ڈھول تماشے، شراب پینے پلانے کی محافل سب اس میں شامل ہیں۔ جھوٹی مجالس جہاں دین پر طعن ہو، مشرکین کے میلے ٹھیلے، باطل یا خلافِ شریعت امور کے ارتکاب کی محافل میں اللہ کے بندے شامل نہیں ہوتے۔ یہ لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے کہ جھوٹی گواہی بھی شہادتِ زور شمار کی گئی ہے۔ اللہ کے بندے ان خرافات میں مبتلا نہیں ہوتے لیکن اگر اتفاقاً ان کا کہیں سے گزر ہو اور وہاں یہ محافل برپا ہوں تو وہ متانت سے گزر جاتے ہیں۔ اس میں نہ شریک ہوتے ہیں نہ تحسین کرتے ہیں اور نہ ہی اُن لوگوں سے جھگڑا کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ جھگڑا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

دسواں وصف:

فرمایا: وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿۷۳﴾ اور جب ان کو ان کے پروردگار کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے (غور و فکر سے سنتے ہیں)

یہ بہت خوبصورت اور غور طلب بات ہے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ میرے بندے وہ ہیں جو قرآنی آیات کے ساتھ اندھے بہروں جیسا سلوک نہیں کرتے۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ جب قرآنی آیات یا اللہ کی بات سنائی جائے تو بالکل توجہ ہی نہ دیں جیسے کوئی اندھا یا بہرہ ہو۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے جلسے منعقد ہوتے ہیں اور علماء تقریر کرتے ہیں یا قرآن بیان کرتے ہیں تو حاضرین جب سن کر نکلتے ہیں اور اُن سے اگر پوچھا جائے کہ بیان میں کیا تھا تو انہیں کچھ یاد نہیں ہوتا۔ بس صرف یہ کہتے ہیں کہ جلسہ بہت بڑا تھا تقریر بہت اچھی تھی لیکن یہ یاد نہیں ہوتا کہ کس بات کا حکم دیا یا کس کام سے روکا تھا۔ یہ رویہ بھی اندھا بہرہ ہو کر گرنے کے برابر ہے کہ مولانا سنا رہے ہیں لوگ سنتے رہیں اور اٹھ کر ہاتھ جھاڑ کر چل دیں بغیر کچھ سیکھے ہوئے۔ قرآن کے ساتھ یہ سلوک سخت ناروا ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ کے بندے بلا تحقیق ہر بتانے والے کی بات پر اندھوں کی طرح ہاتھ پکڑ کر نہیں چل پڑتے۔ آج کل کی ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ بتانے والے بھی اب ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو پڑھتے تو قرآن ہیں لیکن باتیں اپنی پسند کی کرتے ہیں اور قرآن کا اصل مفہوم بیان نہیں کرتے۔ اسی لیے اتنے فرقے بن گئے ہیں حالانکہ سب قرآن ہی پڑھتے ہیں لیکن ہر کوئی اپنی دلیل اور تاویل کر رہا ہے۔

یاد رہے قرآن کریم عام آدمی کو براہ راست نہیں دیا گیا بلکہ اسے اللہ کریم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر پر نازل کیا اور انسانوں کو رسول اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا کہ یہ اللہ کا قرآن ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس کی تشریح بھی بیان فرمائی کہ یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ہی منصب ہے۔ارشاد ہوتا ہے: لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ۔۔۔(النحل:44) تا کہ آپ لوگوں سے کھول کر بیان فرما دیں جو ان کی طرف احکام ومضامین اتارے گئے ہیں۔

بعض اوقات سیرت میں یہ ملتا ہے کہ کبھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے کسی آیت کے نزول کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین سے پوچھ لیا کہ کیا آپ لوگ اس کا مطلب جانتے ہیں تو وہ ہمیشہ عرض کرتے تھے اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ،یعنی اللہ جانتے ہیں یا اس کے رسول جانتے ہیں۔حالانکہ اُن میں بڑے فاضل لوگ تھے اور اُن کی معلومات کا ذخیرہ بہت وسیع تھا لیکن کوئی بڑے سے بڑا صحابیؓ بھی اپنی طرف سے معانی بیان نہیں کرتے تھے جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلّم بیان نہ فرما دیں۔پھر آج کے لوگوں کی کیا حیثیت ہے کہ اپنی طرف سے مفہوم بیان کریں۔

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ کسی کے پیچھے اندھے یا بہرے بن کر نہ بھاگا جائے بلکہ تحقیق کی جائے کہ کیا یہی مفہوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا اور صحابہ کرامؓ نے یہی سمجھا تھا اور پھر سلفِ صالحین اسی پر عمل کرتے تھے۔ اگر تو بتانے والا اس کے مطابق بیان کرے تو چشمِ ما روشن دل ما شاد اور اگر اس کے خلاف سنا رہا ہے تو اس کی تقلید نہ کی جائے۔اللہ کے بندے قرآن کے ساتھ اندھے اور بہروں جیسا سلوک نہیں کرتے۔

گیارھواں وصف:

فرمایا: وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۵﴾ اور وہ لوگ دعا کرتے رہتے ہیں اے ہمار پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک (راحت) عطا فرمایئے اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا دیجیے۔

اللہ کے بندوں کی یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے ربِ جلیل سے یہ دعا مانگتے ہیں کہ اُن کی ازواج اور اولاد اُن کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنے یعنی قربِ الٰہی کے حصول میں اُن کی مددگار بنا دی جائے۔ایسا نہ ہو کہ بیوی بچے اللہ کی راہ میں دیوار بن جائیں اور گناہوں کی طرف لے جائیں بلکہ انہیں صابر وشاکر اور اپنا طالب بنا دے۔اللہ کے بندے اکیلے نہیں چلتے بلکہ اپنے خاندانوں کو سنبھال کر چلتے ہیں۔لوگوں کو قرآن سمجھانے کے ساتھ ساتھ اللہ کے بندوں کو چاہیے کہ اپنے خاندان والوں کو بھی سمجھائیں۔لوگوں کے کردار کی اصلاح چاہتے ہیں تو اپنی بیویوں اور اولاد کی بھی اصلاح کریں اور اُن کے لیے دعا کیا کریں کہ یا اللہ! آپ ان کا کردار ایسا بنا دیں کہ یہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک بن جائیں۔میرے لیے خوشی کا سبب بن جائیں،عزت واحترام کا

باعث بن جائیں۔ یہ میرے لیے سکون کا سبب بن جائیں اور میری آخرت بھی سنور جائے۔ اس سے آگے اب ہر ایک کا نصیب ہے کہ انبیاؑ میں بھی بعض کی بیویاں ایسی تھیں جو ایمان نہیں لائیں لیکن انبیاؑ نے اُن کے ساتھ شفقت برتنے اور سمجھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ سو بیوی بچوں کو دین سکھاؤ، قرآن سکھاؤ، ترجمہ پڑھاؤ، دین سمجھاؤ اور پھر اللہ سے دعا کرو کہ انہیں خوبصورت عقیدہ اور کردار عطا کر دیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دیں۔ کیونکہ ہر بندے نے اپنے خاندان کا حساب دینا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ گرامی ہے: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْؤُلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ (بخاری)

تم میں سے ہر ایک حکمران ہے اور ہر حکمران سے اس کی رعیت کے بارے پوچھا جائے گا۔ کوئی اپنے گھر پر حکمران ہے، اپنی جان پر حکمران ہے۔ کسی کی بات محلے میں گاؤں میں سنی جاتی ہے کسی کی قومی سطح پر حکمرانی ہے سو جہاں تک کسی کا دائرہ اثر ہے وہاں تک اس سے پُرسش بھی ہوگی۔ ان پر محنت بھی کی جائے اور دعا بھی کی جائے کہ اے ہمارے رب! ہمارے دنیا کے رشتوں کو بھی ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دے اور ہمیں نیکوں کا امام بنا دے۔ گویا نیکی میں اور نیک اولاد اور احباب کی راہنمائی کے لیے ہر مومن پیشرو اور امام ہونے کی درخواست اور طلب رکھتا ہے۔

اللہ کی بارگاہ سے جب مانگا جائے تو اللہ کی شان کے مطابق مانگا جائے کہ مانگنے کا بھی مزہ آجائے تو یہ دعا مانگو کہ ہمیں نیکوں کا امام اور پیشوا بنا دے۔ وہ اتنی عظیم بارگاہ ہے تو خوب مانگو کہ ہمیں اتنا نیک کر دے کہ مجھے اور میرے خاندان اور اولاد کو دیکھ کر لوگ ان کے پیچھے چل کر نیکی اختیار کر لیں یعنی ہمیں نیکوں کا پیشوا یا امام بنا دے۔

امام:

امام کو پیشوا یا آج کی زبان میں لیڈر کہتے ہیں۔ عربی میں 'امام' کہا جاتا ہے کہ اگر نیکوں کا امام ہوگا تو بہت نیک ہوگا۔ اگر کوئی بدکاروں کا پیشوا ہوگا تو سب سے زیادہ بدکار ہوگا۔ قرآن میں کافروں کے لیڈر کو بھی امام کہا گیا ہے۔ 'اَئِمَّةُ الْكُفْرِ' کہا ہے۔ امامت شرعی منصب نہیں ہے بلکہ جس شعبے کی بات ہو اس میں جو دوسروں سے زیادہ قابل ہو اور راہنمائی کر سکتا ہو وہ اس شعبے کا امام کہلاتا ہے۔

لمحہ فکریہ:

ہم اپنے بچوں کے لیے کتنی تگ و دو کرتے ہیں۔ انہیں اچھے سے اچھے تعلیمی ادارے میں پڑھانے کی

کوشش کرتے ہیں اور جب وہ تعلیم مکمل کر لیتے ہیں تو انہیں اعلیٰ عہدے دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں ہماری بہت محنت تو لگتی ہے لیکن ہم یکطرفہ محنت کرتے ہیں اور صرف دنیا میں بچوں کی ترقی کے لیے کرتے ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ دنیا تو چند روزہ ہے، جہاں ہمیشہ رہنا ہے وہاں میرے بچوں کا مقام کیا ہوگا، وہاں میرا کیا مقام ہوگا۔ کیا وہاں کوئی ہماری عزت کرے گا، ہمیں سلام کرے گا؟ کہیں ہم سزا میں تو نہیں پھنس جائیں گے؟ یہ ہم بھول جاتے ہیں اور یہی بات یہاں سمجھائی جا رہی ہے کہ اولاد کے لیے دنیا میں بھی محنت کرو اور دین بھی سکھاؤ اور اللہ سے اُن کے حق میں دعا بھی کرو کہ وہ نیکی میں اتنے بڑھ جائیں کہ نیکوں کے امام بن جائیں۔

عِبَادُ الرَّحمٰن کے لیے انعامات:

فرمایا: اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ ان لوگوں کو صبر کے بدلے اونچے اونچے محل دیے جائیں گے اور وہاں (فرشتے) ان سے دعا و سلام کریں گے۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے وہ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت ہی عمدہ جگہ ہے۔

اللہ کریم کے ان بندوں کو جن کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں انہیں جنت میں محلات عطا ہوں گے، انہیں جنت کے بالا خانوں میں ٹھہرایا جائے گا جو قربِ الٰہی کے مظہر بھی ہوں گے اور اللہ کی نعمتوں سے بھرے ہوئے ہوں گے۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے دنیا میں صبر اختیار کیا، اپنی خواہشات اور آرزوؤں کو اللہ کے احکام کے مقابلے میں اہمیت نہ دی۔ مشکلات یا تکلیف سے گھبرا کر اللہ کی اطاعت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی غلامی سے منہ نہ موڑا، اللہ کی یاد اس کے ذکر پر قائم رہے اس کی طلب میں جیئے اور اس کی رضا کو طلب کرتے دنیا سے گزر گئے۔

قرآن میں صبر کا یہی مفہوم ہے کہ اللہ کی نافرمانی سے خود کو روک لینا۔ ایسے لوگوں کو بلند و بالا محلات، مقامات و منازل عطا ہوں گے اور اُن پر ہمیشہ اللہ کی طرف سے رحمتیں اور سلامتی نازل ہوگی، ہر آن سلامتی نچھاور ہوگی، فرشتے مبارکبادیں بھی دیں گے اور سلام بھی کریں گے۔ وہاں ہر کام میں سلامتی ہوگی، لباس، غذا، رہائش، میل ملاقات الغرض ہر چیز میں خیر ہوگی۔ دکھ اور تکلیف کا شائبہ تک نہ ہوگا۔ سب سے بڑھ کر کہ یہ نعمت ہمیشہ رہے گی اور ان لوگوں کو کبھی بھی ان محلات سے نکالا نہیں جائے گا۔ یہ ان عالی شان محلات میں ہمیشہ رہیں گے۔

یہ رہنے کے لیے کیا خوبصورت مقام ہے اور ٹھہرنے کے لیے کیا خوبصورت جگہ ہے۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی میں ایک پہلو ٹھیک ہوتا ہے تو دوسرے سے کوئی تکلیف آجاتی ہے۔ کھانا مل جاتا ہے تو ہضم نہیں ہوتا بیماری آجاتی ہے، لباس مل جاتا ہے تو موسم ایسا ہو جاتا ہے کہ وہ پہنا نہیں جاتا۔ پھول توڑو تو کانٹا بھی چبھ جاتا ہے لیکن وہاں سب سلامتی کے پہلو ہی ہوں گے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عیش نصیب ہوگی۔ دنیا کی چند روزہ زندگی جس میں سے بلوغت تک پندرہ یا اٹھارہ سال نکل گئے۔ اس کے بعد پچاس سال تک کی عمر ہے کام کی جبکہ پچاس کے بعد پھر انسان سہارے ڈھونڈتا ہے اور باقی حصّہ بڑھاپے کی نذر ہو جاتا ہے۔ جو بیچ میں بیس سال عمر بچتی ہے اس میں اللہ کی نافرمانی سے خود کو روک لینا، صبر کر لینا ہمیشہ کے انعامات اور سلامتی کا باعث ہے۔

اللہ بے نیاز ہے:

جو لوگ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت نہیں کرتے اور اس چند روزہ زندگی میں اپنی پسند سے جینا چاہتے ہیں فرمایا: قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ۔۔۔ فرما دیجیے کہ اگر تم (اللہ کو) نہیں پکارتے تو میرا پروردگار بھی تمہاری کچھ پروا نہیں کرتا۔

اللہ کریم کو کسی کی عبادت کی احتیاج نہیں ہے۔ اگر ساری دنیا سربسجود ہو جائے تو اس کی شان بڑھتی نہیں اور اگر ساری دنیا کفر پر آجائے اللہ اللہ نہ کرے تو اس کی شان کم نہیں ہوتی۔ اس کی ذات مخلوق سے بالاتر ہے اور مخلوق کے اعمال سے متاثر نہیں ہوتی۔ یہ اللہ کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور نہ ہی اُسے کسی کی عبادت کا انتظار ہے۔ جو بھی عبادت کرتا ہے وہ ساری محنت اپنی ذات کے لیے کرتا ہے جس کا بدلہ وہ خود پاتا ہے۔ سوز اگر کوئی نمازیں پڑھتا ہے یا روزے رکھتا ہے تو اُسے مخلوق پر احسان جتانا چاہیے نہ ہی اللہ پر جتانا چاہیے بس اللہ سے دعا کرے کہ وہ اس کی عبادت قبول فرمالیں اور اُسے اجر عطا کر دیں۔ بہر حال اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ لوگ بھلے کام کیوں نہیں کرتے، اچھے کردار کے مالک کیوں نہیں ہیں یا اچھی دعا کیوں نہیں کرتے اس لیے کہ یہ انسان کی ضرورت ہے اور اُسے جو کرنا ہے اپنے بھلے کے لیے کرنا ہے۔

فرمایا: فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾ یقیناً تم نے جھٹلایا ہے سو اس کی سزا (تمہارے لیے) جلد لازم ہوگی۔

تم نے اے کفار احکام الٰہی اور سنتِ پیغمبر کو جھٹلا دیا، انکار کر دیا اختیار نہیں کیا تو بہت جلد اس کا بدلہ بھگتنا پڑ جائے گا، اس میں کوئی دیر نہیں ہے۔

یاد رہے تکذیب کے بھی کئی درجے ہیں ایک قسم تو سرے سے انکار کی ہے جو کفر ہے۔ ایک قسم یہ بھی ہے کہ بندہ زبانی کہہ دے کہ میں مانتا ہوں لیکن اس پر عمل نہ کرے۔ اگر ہم اس کا تجربہ کریں تو بات سمجھ آتی ہے کہ زبانی اقرار اور عملاً نافرمانی انکار سے بھی زیادہ بری محسوس ہوتی ہے۔ ہم کسی بچے سے کہیں کہ وہ ہمیں پانی پلا دے اور وہ کہے کہ ابا جی ابھی لاتا ہوں لیکن پانی لا کر نہ دے تو یہ زیادہ برا لگے گا کہ اس نے کہہ کر بھی اس پر عمل نہیں کیا۔ ہم خوش ہو جاتے ہیں کہ کافروں کے لیے بڑی سخت وعید ہے لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم وہ بدنصیب ہیں جو زبانی اقرار کرتے ہیں اللہ کی توحید کا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت کا لیکن جب عمل کی باری آتی ہے تو من مانی کرتے ہیں۔ یہ رویہ بھی جھٹلانے کی ایک قسم ہے اور بہت جلد اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ سو توبہ کا دروازہ کھلا ہے اپنا عقیدہ اور عمل درست کر لو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا دامانِ رحمت تھام لو تو اللہ کریم بھی بہت رحم کرنے والے ہیں۔ وہ برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیتے ہیں۔

اللہ کریم ہماری خطاؤں سے درگزر فرمائیں، نیکی کی توفیق ارزاں فرمائیں۔ اس ملک کو قائم رکھیں اور اس میں امن قائم فرمائیں اور اس سے عذاب ہٹا لیں۔

سورۃ الشعرآء رکوع 1 آیات 1 تا 9

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰسٓمّٓ ① تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ② لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ③ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ④ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ⑤ فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑥ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ⑦ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ⑧ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ⑨

طٰسٓمّٓ۔ ﴿۱﴾ یہ ایک روشن کتاب (قرآن) کی آیتیں ہیں۔ ﴿۲﴾ شاید آپ ان کے ایمان نہ لانے پر (رنج کرتے ہوئے) اپنی جان ہی دے دیں گے ﴿۳﴾ اگر ہم چاہیں (ان کے ایمان لانے کے لیے) تو ان پر آسمان سے ایک بڑی نشانی اتار دیں تو اس کے آگے ان کی گردنیں جھک جائیں ﴿۴﴾ اور ان کے پاس تازہ نصیحت رحمٰن (اللہ) کے پاس سے نہیں آتی جس سے یہ منہ نہ پھیر لیتے ہوں ﴿۵﴾ سو انہوں نے تو (دینِ حق کو) جھوٹا بتایا پس عنقریب ان کو اس بات کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے تھے ﴿۶﴾ کیا انہوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اس میں کتنی ہی نفیس چیزوں کے جوڑے اگائے ہیں ﴿۷﴾ بلاشبہ اس میں (توحید کی) ایک بڑی دلیل ہے اور ان کے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے ﴿۸﴾ اور یقیناً آپ کا پروردگار غالب (اور) مہربان ہے ﴿۹﴾

تفسیر ومعارف

سورۃ الشعرآء بھی ان سورتوں میں سے ہے جو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں مکّی سورتوں میں عموماً زیادہ بحث عقائد پر ہے اور جو سورتیں مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں ان میں احکام وشرائع زیادہ بیان ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے سورۃ الفرقان گزری۔ اس میں کفار کے انکار اور اس کے نتائج پر بات چل رہی تھی۔ یہاں اسی تسلسل کو قائم رکھا گیا ہے۔

طٰسٓمٓ ① یہ حروفِ مقطعات ہیں جو قرآن کریم کی مختلف سورتوں کے شروع میں آتے ہیں۔ سورۃ البقرہ کی ابتدا بھی حروفِ مقطعات سے ہوتی ہے۔ یہ سورہ بھی انہی حروف سے شروع کی گئی ہے۔ حروف مقطعات کا پڑھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا باقی قرآن کریم کا پڑھنا ضروری ہے۔ ان کا ثواب بھی اتنا ہی ہے اور اثر بھی اتنا ہی ہے۔ ان کے پڑھنے سے کیفیات بھی نصیب ہوتی ہیں۔ ان کے معانی کیا ہیں؟ یہ اللہ کے علم میں ہے، اللہ کریم کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم بہتر جانتے ہیں یا اللہ کے وہ خاص بندے جنہیں اللہ کریم بتانا چاہیں۔

ارشادِ باری ہے: تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ② یہ ایک روشن کتاب (قرآن) کی آیتیں ہیں۔

یہ ایک ایسی کتاب کی آیات ہیں جو کسی بات کے بارے لگی لپٹی نہیں رکھتیں۔ اس کا کوئی مفہوم پوشیدہ نہیں بلکہ ہر بات کو کھول کر، واضح کر کے بیان کر دیتی ہے۔ یہ ایک بے مثل و بے مثال کتاب ہے۔ کائنات میں یہ اکیلی کتاب ہے جس کی مثال ملنا ممکن نہیں۔ اس جیسی کوئی دوسری کتاب ہے ہی نہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مُبِيْنِ ہے۔ ہر بات کو بڑی وضاحت سے بیان کر دیتی ہے۔ اس واضح کتاب کو سمجھنے کے لیے اللہ نے انسان کو شعور دیا ہے اگرچہ سمجھ وشعور اور کردار کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے یعنی یہ کہ بندہ حلال کھاتا ہے یا نہیں، پاکیزہ ہے یا نہیں، اس کے دن بھر کے کام جو وہ کرتا ہے وہ جائز ہیں یا ناجائز، اس کی سوچیں مثبت ہیں یا منفی۔ یہ سارے امور انسانی مزاج پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس شعور کو متاثر کرتے ہیں جو قرآنِ کریم کو سمجھنے کے لیے چاہیے۔ اگر یہ سب کام جائز ہوں۔ اللہ کے حکم کے مطابق ہوں، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اتباع میں ہوں تو پھر اس کے شعور کو جلا بخشتے ہیں۔ اگر غذا حرام، ناجائز یا مکروہ ہو، باتیں بھی منفی ہوں، کردار صحیح نہ ہو تو پھر یہ اس استعداد کو دھندلا دیتی ہیں۔ جیسے آئینہ پر غبار آجائے، شیشے پر میل جم جائے۔ اس طرح ہر آدمی کا اپنا، اپنا شعور ہے، اپنی اپنی استعداد ہے۔

برائی کرنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو دکھ پہنچانا ہے:

ارشادِ باری ہے: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ③ شاید آپ ان کے ایمان نہ لانے پر

(رنج کرتے ہوئے) اپنی جان ہی دے دیں گے۔

فرمایا، آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) اپنی جانِ عزیز ہی دے دیں گے کہ یہ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ اللہ کریم اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم سے فرما رہے ہیں کہ منکرین قرآنِ کریم کو نہیں مانتے، قرآن کی تکذیب کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات کی پروا نہیں کرتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تکریم نہیں کرتے بلکہ مذاق اڑاتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو ان کے انجامِ بد کا اتنا دکھ ہوتا ہے کہ گویا آپ کی جانِ عزیز ہی چلی جائے۔

اللہ کریم نے اپنی مخلوق خود پیدا فرمائی ہے۔ تکوینی طور پر جسے جیسا چاہتا ہے بناتا ہے۔ پیدا ہونے، شکل وشباہت، قد کاٹھ، عقل وشعور، صحت و بیماری، قوت وکمزوری، رزق واولاد زندگی اور موت کسی میں کسی کا اختیار نہیں چلتا۔ جیسے اللہ چاہتا ہے تقسیم فرما دیتا ہے۔ جہاں بات ماننے یا نہ ماننے کی آتی ہے، ایمان وکفر میں انتخاب کرنے کی آتی ہے وہاں اللہ نے بندے کو اختیار دے دیا ہے۔ اب وہ اپنی پسند سے چاہے تو ایمان قبول کر لے نہ چاہے تو انکار کر دے۔ انکار کرے گا تو انکار کا نتیجہ بھگتے گا، قبول کرے گا تو اس کا انعام پائے گا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم ان باتوں کو سب سے بہتر جاننے والے ہیں۔ یہ سب باتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے لوگوں کو تعلیم فرمائیں۔ یہ سب جاننے کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم اتنا دکھ کیوں محسوس فرماتے تھے؟ اس لیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی نگاہ میں وہ حقائق تھے جن تک ان لوگوں کی رسائی نہیں تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم منکرین کے انکار کے انجام سے دکھی ہوتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قلبِ اطہر پر دکھ کا ایسا پہاڑ ٹوٹتا تھا کہ کوئی اور ہوتا تو اس کے باعث دنیا سے گزر جاتا۔

کفر ایسی مصیبت ہے کہ جہنم میں پہنچا کر رہتی ہے۔ ایک چھوٹا سا اندازہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جہنم کے عذاب کیسے ہوں گے۔ جدید سائنسی تحقیق کے مطابق وجودِ انسانی خلیوں کا مجموعہ ہے۔ پاؤں کے ناخنوں سے لے کر چوٹی تک دس کھرب خلیے (Cell) جڑ کر ایک وجود بنتا ہے۔ یہ ہر روز بنتے اور مرتے رہتے ہیں۔ کسی کی عمر چھ ماہ سے زائد نہیں ہوتی۔ گویا چھ مہینے بعد انسان کا سارا وجود نیا ہو جاتا ہے۔

آخرت میں جب حساب ہوگا تو جس (سیل) خلیہ کے ذریعے گناہ ہوا ہوگا اس کو سزا ملے گی۔ اللہ کریم سے یہ اُمید تو نہیں رکھی جا سکتی کہ گناہ کرتے وقت جسم کے خلیے (سیل) اور تھے اور سزا بھگتتے وقت کوئی اور ہوں۔ جس نے جو گناہ کیا تھا وہ اس کی سزا پائے گا۔

اس حساب سے اگر کوئی ساٹھ سال کا ہو کر فوت ہوا تو جس گناہ میں، جس جرم میں، جس کفر وشرک میں جو خلیہ

(سیل) شریک تھا وہی اس کی سزا پائے گا تو دوزخ میں محض جلنا نہیں ہوگا، ہر خلیہ الگ طرح کی اذیت میں ہوگا۔ دوزخ میں ہر خلیہ (Cell) پر آگ مختلف قسم کی ہوگی۔ جہنم کی تکلیف ایک ہی وقت میں کروڑوں قسم کی ہوگی۔ اندازہ کیجیے! کسی کے ہر خلیہ (Cell) میں الگ طرح کا درد ہو رہا ہو تو اس کا کیا عالم ہوگا، کیا حالت ہوگی! جو لوگ اللہ کا انعام پائیں گے اور جنت جائیں گے تو ان کے ہر خلیہ (Cell) کو اپنے اعمال کے مطابق لذت نصیب ہوگی۔ اس لذت میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نگاہ پاک تو آخرت کو دیکھ رہی تھی کہ منکرین کے ساتھ جہنم میں کیا ہوگا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو دکھ ہوتا تھا کہ کاش یہ وہاں نہ جائیں یہ ان عذابوں سے بچ جائیں۔

اُمتیوں کے لیے مقامِ فکر:

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم تو کافروں کے دکھ میں گھلتے تھے۔ آج ہم اُمتی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہوئے جو کچھ کر رہے ہیں اس سے آج آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قلبِ اطہر پر کیا گزرتی ہوگی؟ ہر طرح کی بددیانتی، فریب، لوٹ مار، قتل وغارت گری دہشت گردی، یہ سب کچھ ہم مسلمانی کے دعوے کے ساتھ کر رہے ہیں بلکہ بعض گناہوں کو تو ہم نے جہاد کا، ثواب کا نام دے رکھا ہے۔

برائی کر کے بندہ صرف اللہ کی نافرمانی نہیں کرتا، صرف اللہ کو ناراض نہیں کرتا بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا دل بھی دُکھاتا ہے۔ یہ بہت فکر کی بات ہے اور اس کا علاج حصولِ یقینِ آخرت ہے۔ آخرت پر یقین کے بغیر ایمان مکمل ہی نہیں ہوتا۔ یقینِ آخرت اتنا اہم ہے کہ سورۃ البقرہ میں جہاں تمام ضروریاتِ دین کو چند آیات میں سمو دیا وہاں یقینِ آخرت کو دوبارہ بیان کیا۔ ارشاد باری ہے: وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (البقرہ:4) اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ پر نازل کی گئی اور جو آپ سے پہلے نازل کی گئی اور وہ آخرت کا یقین رکھتے ہیں۔

اس آیہ مبارکہ میں تمام ضروریاتِ دین آ گئیں۔ ذاتِ باری تعالیٰ، نبوت ورسالت، الہامی کتابیں، ملائکہ آخرت، عرش وکرسی، ثواب عذاب سب پر ایمان کا تذکرہ ہوا اس کے باوجود الگ سے فرمایا کہ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یقین سے مراد ہے وہ قوت جو بندے کو اللہ کی نافرمانی سے روک لے اور اطاعت پر کاربند کر دے۔ اگر کسی کو یہ یقین دلا دیا جائے کہ فلاں کام کرو گے تو تمہارے وجود کے ہر خلیہ (Cell) کو الگ الگ آگ میں جلایا جائے گا تو وہ ہرگز اس کام کے قریب نہ جائے گا۔ آج کلمہ پڑھنے کے باوجود، حج عمرہ اور دیگر عبادات کرنے کے

باوجود جھوٹ، رشوت اور دیگر خبائث میں ملوث ہیں۔اس کا سبب آخرت کے یقین میں کمی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی فطری رحمدلی کے باعث انسانوں کے لیے دکھ محسوس فرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو بہت تکلیف ہوتی کہ ان کو پتا ہی نہیں کہ اللہ کے نبیؐ اور اللہ کے پیغام کا انکار کر کے یہ کس انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اللہ کریم نے فرمایا کہ میرے حبیب! (صلی اللہ علیہ وسلّم) اگر منوانا ہی مقصود ہوتا تو جب اللہ تعالیٰ ایسا حکماً کر دیں تو کون انکار کر سکتا ہے لیکن اللہ نے اس کا اختیار بندے کو دے دیا ہے۔

ماننا وہی ہے جو اپنے اختیار سے مانا جائے:

ارشاد ہے: اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ۝۴ اگر ہم چاہیں (ان کے ایمان لانے کے لیے) تو ان پر آسمان سے ایک بڑی نشانی اتار دیں تو اس کے آگے ان کی گردنیں جھک جائیں۔

اگر ہم چاہتے تو آسمان سے کوئی ایسی نشانی نازل کر دیتے جس کے سامنے ان کی گردنیں جھکی رہ جاتیں۔ وہ قادر ہے وہ چاہتا تو دوزخ کو کھول کر سامنے کر دیتا۔ پھر کس کی جرأت ہوتی جو اس طرف رخ کرتا۔ وہ چاہتا تو ایسا حکم دے دیتا کہ جو اللہ کی اطاعت نہیں کرے گا وہ کھانا نہیں کھا سکے گا اس کی نظر بند ہو جائے گی، یا سینے میں درد ہو جائے گا۔ وہ کوئی شرط لگا دیتا تو ہر کوئی اطاعت کرتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ فرمایا، میں نے ساری مخلوق میں سے صرف انسان کو جب یہ استعداد دی کہ وہ میری معرفت حاصل کر سکتا ہے تو پھر میں نے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ اسے اختیار دے دیا کہ وہ اپنی خواہشِ نفس کے پیچھے جاتا ہے، شیطان کے پیچھے چلتا ہے یا میری عظمت کو مان کر میری اطاعت کرتا ہے۔ اللہ نے خود یہ اختیار بندے کو دے دیا ورنہ اللہ کے حکم پر پیدا ہوتے ہیں، اس کے حکم سے مر جاتے ہیں، اس کے حکم سے بیمار ہوتے ہیں، اس کے اختیار سے صحت پاتے ہیں، اس کے حکم سے زندگی کے سارے مرحلے طے کرتے ہیں وہ زبردستی منوانا چاہے تو کون ہے، کس کی جرأت ہے کہ انکار کرے۔ اور یہ آج کی بات نہیں۔ میرے حبیب! (صلی اللہ علیہ وسلّم) ایسا تو گزشتہ انبیاؑ کے ساتھ بھی ہوا۔ آپ گزشتہ انبیاؑ اور ان کی اُمتوں کے احوال دیکھیں جب بھی کوئی نیا نبیؑ مبعوث ہوا، نئی کتاب آئی تو بدنصیب لوگوں نے انہیں جھٹلایا۔

رحمانیت ایمان سے مشروط ہے:

فرمایا: وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ۝۵ اور ان کے پاس تازہ نصیحت رحمٰن (اللہ) کے پاس سے نہیں آتی جس سے یہ منہ نہ پھیر لیتے ہوں۔

اللہ رحمان ورحیم ہے۔ اللہ کے احسانات بے پناہ ہیں۔ وہ اپنی ربوبیت کے تقاضے پورے فرما رہا ہے۔ اس دنیا میں کافر بھی اس کی رحمتِ عامہ سے مستفید ہو رہا ہے۔ زندگی، رزق، اولاد، ساری نعمتیں اس کی رحمانیت سے پا رہا ہے۔

پالن والا سر تے حاضر کُل جیاں نوں پالے
عیبی ویکھ نہ دھکے در توں رِنج برات نہ ٹالے

وہ ایسا کریم ہے کہ ساری مخلوق کو پال رہا ہے۔ جو کفر کرتے ہیں، گناہ کرتے ہیں ان کی بھی روزی بند نہیں کرتا۔ کسی کو گناہگار سمجھ کر محروم نہیں کرتا، ناراض ہو کر اس کا رزق بند نہیں کرتا۔ ربّ کریم اپنی طرف سے کمی نہیں کرتا۔ یہ انسان سے جو ناشکرا ہے جو کفر کرتا ہے یا گناہ میں ملوث ہو جاتا ہے۔

اللہ کریم کی رحمانیت کا یہ نظام البتہ اس عالم دنیا تک رہے گا۔ جب موت آتی ہے تو پھر بندہ اس عالم رحمانیت سے آگے چلا جاتا ہے۔ وہاں رحمت مشروط ہے ایمان کے ساتھ، ایمان ہوگا تو رحمت نصیب ہوگی۔ رحمت نصیب ہوگی تو ساری آسانیاں ہوں گی۔ محرومی عذاب کا سبب بن جائے گی۔

فرمایا، جب بھی اللہ کا کوئی نبیؑ مبعوث ہوتا یا نئی کتاب نازل ہوتی تو یہ ایسے ناشکرے لوگ تھے کہ اس کا انکار کر دیتے۔ منہ پھیر کر چل دیتے۔ یہ ایسے بدنصیب تھے کہ ماننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ فرمایا: فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ سو انہوں نے دینِ حق کو جھوٹا بتایا پس عنقریب ان کو اس بات کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے تھے۔

اللہ تو رحمان ہے۔ منکرین پر بھی اس کی رحمانیت عام ہے اور یہ ایسے ناشکرے ہیں کہ اس رحمان ربّ کے دین کا انکار کر دیتے ہیں۔ انکار تو انہوں نے کر لیا۔ یہ جرأت انہوں نے کر لی لیکن جس قیامت، جس حساب کتاب کا یہ مذاق اڑاتے تھے بہت جلدی انہیں اس سے سابقہ پڑنے والا ہے۔ بہت جلد وہ سب کچھ سامنے آ جائے گا۔ قیامت تو ایک عظیم حادثہ ہے جب ساری کائنات تباہ ہو جائے گی تو پھر دوبارہ زندگی عطا ہوگی لیکن ہر مرنے والے کے لیے دارِ عمل ختم ہو جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ عالی ہے: اِذَا مَاتَ اَحَدُ كُمْ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ جو مرتا ہے ایک طرح سے اس کی قیامت تو قائم ہو جاتی ہے۔ برزخ سامنے آ جاتی ہے، عذاب ثواب شروع ہو جاتا ہے تو ایک طرح سے چھوٹی قیامت تو اس پر گزر جاتی ہے۔ زندگی گزرنے والی چیز ہے۔ وقت ٹھہرتا نہیں رواں رہتا ہے۔ کسی سے مستقبل کے لیے کوئی وعدہ کریں کہ میں آپ کا فلاں کام پانچ سال بعد کروں گا تو وہ شخص چکرا کے رہ جاتا ہے۔ پانچ سال کا عرصہ بہت لمبا لگتا ہے لیکن کسی بڑی عمر کے شخص سے پوچھیں تو وہ کہتا ہے کہ کل ہی کی بات ہے کہ ہم سکول میں

تھے۔ معلوم ہی نہیں ہوا یہ وقت کیسے گزر گیا۔ زندگی کے ساٹھ، ستر سال اس طرح نکل گئے جیسے ہاتھ سے ریت پھسل جاتی ہے۔ اسی طرح زندگی تو ہاتھ سے نکل جائے گی۔ آخرت سامنے آجائے گی۔ جس چیز کا یہ مذاق اڑاتے تھے وہ سچ سامنے آجائے گا۔ پھر انہیں پتا چلے گا کہ آخرت کا مذاق اڑانے کا نتیجہ کیا ہے۔

نظامِ کائنات توحیدِ باری پر گواہ ہے:

فرمایا: اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الۡاَرۡضِ کَمۡ اَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍ کَرِیۡمٍ ۝۷ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَمَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۝۸

کیا انہوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اس میں کتنی ہی نفیس چیزوں کے جوڑے اگائے ہیں۔ بلاشبہ اس میں (توحید کی) ایک بڑی دلیل ہے اور ان کے اکثر ایمان نہیں لاتے۔

انسانوں کو عظمتِ الٰہی کی طرف متوجہ کرنے کے لیے دلائل ارشاد ہو رہے ہیں۔ قرآن حکیم اپنے قاری سے مخاطب ہے کہ کیا تم نے کبھی زمین پر نگاہ نہیں ڈالی کہ دیکھتے اور غور کرتے۔ کس طرح اللہ کریم نے زمین پر پھیلی روئیدگی میں، جڑی بوٹیوں تک میں نر اور مادہ پیدا کیے۔ ان میں بھی نسل چلتی ہے۔ بیج بنتے ہیں پھر پھوٹتے ہیں اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اللہ کے اس نظامِ قدرت میں ہر شئے اس کے تابع فرمان ہے۔ گھاس کا ایک تنکا بھی ربّ کی نافرمانی نہیں کرتا۔ جو کام جس کے ذمے ہے وہ اپنا کام ذمہ داری سے کر رہا ہے تو اے انسان! تمہیں تو اس نے انسان بنا کر اشرف المخلوقات قرار دیا۔ بے شمار کمالات و صلاحیتیں عطا کیں۔ تمہیں یہ جرأت رندانہ دی، توفیق و استعداد دی کہ تم اس کی ذات کی طلب کر سکتے ہو۔ ساری کائنات اس کے حکم کے تابع ہے۔ حاکم کیسا ہے اس کی ذات کیسی ہے، صفات کیسی ہیں، یہ جرأت ملائکہ کی بھی نہیں۔ یہ نگاہ کوئی نہیں اٹھا سکتا سوائے انسان کے۔ عالمِ انسانیت کو پھر اللہ نے نبوت سے سرفراز فرمایا۔ اِس میں انبیاؑ و رسل بھیجے، اپنا ذاتی کلام نازل فرمایا۔ اس قدر بلند مقام عطا فرمایا۔ اس سب کے باوجود تم ہو کہ شیطان کی بات مانتے ہو، نفس کی مانتے ہو۔ برائی اور گناہ کرتے ہو اور اللہ کے احکام کا انکار کر دیتے ہو۔

اسلام کے دعویداروں کے لیے مقامِ غور:

کافر نے تو زبان سے انکار کر دیا اس لیے وہ کافر کہلایا لیکن جب مسلمان گناہ کرتا ہے تو عملاً اللہ کے حکم کا تو انکار ہی کر رہا ہوتا ہے۔ زبانی کہتا رہے کہ میں مانتا ہوں لیکن جہاں بھی کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت کا دامن عملاً چھوٹا تو عملاً انکار ہو گیا۔

اللہ کریم کی اتنی مخلوق جو روئیدگی کی صورت میں ہمارے پاؤں تلے روندی جاتی ہے۔ کتنے چھوٹے چھوٹے

پودے، جڑی بوٹیاں ہیں۔ سب اللہ کی اطاعت کر رہے ہیں اور اس کے پروگرام کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ عظمتِ الٰہی کی اتنی بڑی دلیل دیکھ کر بھی انسانوں کی اکثریت ایمان نہیں لاتی۔ اکثریت ہمیشہ انکار کی طرف رہی ہے۔ یہ انسان کی بدنصیبی اور بدبختی کی انتہا ہے کہ وہ عظمتِ الٰہی کا قائل نہ ہو سکا لیکن حیرت اپنے آپ پر ہوتی ہے۔ ہم جو اسلام کے دعویدار ہیں۔ مسلمانی کا دعویٰ رکھتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت پر ایمان لاتے ہیں، قرآن کو اللہ کی کتاب سمجھتے ہیں اور پھر ہم اللہ ہی کی نافرمانی کرتے ہیں! حد تو یہ ہے کہ اب مسلمان کہتے ہیں کہ آپ دعا کریں میں نماز پڑھنے لگ جاؤں۔ نماز تو اللہ کی عظمت کو مان کر اس کی اطاعت کرتے ہوئے اس کے حکم کے مطابق پڑھنی ہے اور اس نے نماز میں اپنے ربّ سے کچھ لیتا ہے اور ربّ مانگنے والے کو کبھی خالی نہیں لوٹاتا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ کوئی یہ نہیں کہتا دعا کریں میں تنخواہ لے لوں۔ یہ ہر ایک کو پتا ہے کہ مجھے تنخواہ لینی ہے، کبھی کسی نے نہیں کہا کہ دعا کریں صبح و شام کھانا کھالوں تو پھر نماز کے لیے کیوں کہتے ہیں؟ نماز کوئی جرمانہ تو نہیں جس سے بچاؤ کے لیے دعا کروائی جاتی ہے۔

صلوٰۃ جسے عرف عام میں نماز کہہ دیتے ہیں اس کا ہر لفظ پر جو پڑھا جاتا ہے ہر رکوع ہر سجدے پر اللہ کا انعام ملتا ہے، اللہ کا قرب ملتا ہے، اللہ کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ اس کے لیے دعائیں کروانے کا مطلب ہے کہ آپ کو یقین نہیں ہے کہ آپ کو صلوٰۃ میں کچھ مل رہا ہے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں مساجد بارگاہِ الٰہی ہیں۔ ارشاد ہے: مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۔۔۔(البقرہ:114) ان کو لازم تھا کہ مساجد میں ڈرتے ہوئے داخل ہوتے۔

مسجد میں جو کوئی داخل ہوتا ہے اسے زیب نہیں دیتا سوائے اس کے کہ وہ لرزاں و ترساں مسجد میں داخل ہو کہ یہ بارگاہِ الٰہی ہے۔ یہاں میں نے اللہ کے روبرو کھڑا ہونا ہے۔ دنیوی رعب داب رکھنے والے مقتدر لوگوں کے سامنے پیش ہونا پڑے، کسی جج کے روبرو کھڑا ہونا پڑے، کسی پولیس افسر کے سامنے جانا پڑے تو بندہ کانپ جاتا ہے کہ پتا نہیں وہ کیا کہتا ہے اور میں کیا کہتا ہوں اور صلوٰۃ میں تو ربُّ العالمین کے روبرو کھڑا ہونا ہے۔ یہاں دیدہ دلیری کیسی!

اللہ کی رحمانیت کے مظاہر دیکھ کر، ساری نشانیاں اور دلائل دیکھ کر بھی لوگ ایمان نہیں لاتے۔ فرمایا: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ بلاشبہ اس میں توحید کی ایک بڑی دلیل ہے اور ان کے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ اللہ کریم نے اس آیہ مبارکہ میں فرمایا ہے کہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے اور دوسری جگہ فرمایا ہے: وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (سبا:13) اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہیں۔ حق یہ ہے کہ لوگ اس بات کو بھول رہے ہیں کہ ان کے انکار سے کس کا نقصان ہوگا۔ اللہ کریم کی ذات تو ایسی بے نیاز ہے کہ اگر سارے

انسان مخلص مسلمان بن جائیں تو اللہ کی شان بڑھ نہیں جائے گی اور اگر ساری دنیا کفر پر متفق ہو جائے تو اللہ کی شان میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ اس کی شان اسی کو زیبا ہے۔ ہم جان ہی نہیں سکتے۔ یہ ہماری عقل، ہمارے دائرہ اختیار سے بالاتر اور باہر ہے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ اور یقیناً آپ کا پروردگار غالب (اور) مہربان ہے۔ انہیں یہ بات بھول رہی ہے کہ آپ کا پروردگار ہر کام پر غالب ہے۔ وہ یہ بھول رہے ہیں کہ اللہ کے انکار سے اللہ کے اختیار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ وہ جانتا ہے، دیکھتا ہے، غالب ہے اور ہر شئے پر قادر ہے۔ قدرت کاملہ کے باوجود درگزر فرماتا ہے۔ ایسا رحیم وکریم ہے کہ سارا نظام اس کی رحمت کے سہارے چل رہا ہے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ آتا ہے کہ اگر ہم ہر گناہ پر گرفت شروع کر دیتے تو زمین پر چلنے والا بھی کوئی نہ رہتا۔ یہی نہیں بلکہ درگزر فرماتا رہتا ہے۔ رحم کرتا ہے، بخشتا ہے۔ اگر کوئی توبہ کر لے، توبہ کی توفیق نصیب ہو جائے تو سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ خود ارشاد فرماتا ہے: فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ۔۔۔ (الفرقان: 70) تو اللہ ایسے لوگوں کو ان کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائیں گے۔

وہ ایسا رحم فرمانے والا ہے کہ توبہ کرنے والوں کو انعامات سے نواز دیتا ہے۔ انہوں نے تو جرم کیے۔ اللہ نے بدل کر ان کی نیکیاں بنا دیں۔ ہر ایک پر اس کا رحم وکرم عام ہے۔ سب اس کے سہارے جیئے جا رہے ہیں اور اسی کا شکر نہیں کرتے۔ وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ سب کچھ سامنے آ جائے گا۔ ہر بات کا حساب ہو جائے گا۔

سورۃ الشعرآء رکوع 2 آیات 10 تا 32

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۙ﴿۱۰﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا
يَتَّقُوْنَ﴿۱۱﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ۖ﴿۱۲﴾ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا
يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ﴿۱۳﴾ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ
يَّقْتُلُوْنِ ۚ﴿۱۴﴾ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ﴿۱۵﴾ فَاْتِيَا
فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۱۶﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ ؕ﴿۱۷﴾ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ
سِنِيْنَ ۙ﴿۱۸﴾ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ﴿۱۹﴾ قَالَ
فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ؕ﴿۲۰﴾ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ
رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴿۲۱﴾ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ﴿۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ﴿۲۴﴾ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا
تَسْتَمِعُوْنَ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ
الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ﴿۲۷﴾ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا
بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴿۲۸﴾ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ
مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ﴿۲۹﴾ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ۚ﴿۳۰﴾ قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ
كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ﴿۳۱﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۖ﴿۳۲﴾

اور جب آپ کے پروردگار نے موسیٰ (علیہ السلام) کو فرمایا کہ ظالم لوگوں کے پاس جائیں ﴿۱۰﴾ (یعنی) قومِ فرعون کے پاس، کیا یہ ڈرتے نہیں؟ ﴿۱۱﴾ انہوں نے عرض کیا اے میرے پروردگار! بے شک میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھوٹا سمجھیں ﴿۱۲﴾ اور (طبعی طور پر) میرا دل تنگ ہونے لگتا ہے اور میری زبان (اچھی طرح) نہیں چلتی تو اس لیے ہارون (علیہ السلام) کو بھی وحی بھیج دیجیے ﴿۱۳﴾ اور میرے ذمہ ان لوگوں کا ایک جرم بھی ہے (قبطی کا قتل) تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے (تبلیغِ رسالت سے پہلے ہی) قتل کر ڈالیں ﴿۱۴﴾ فرمایا ہرگز نہیں! پس آپ دونوں ہماری نشانیاں لے کر جائیں یقیناً ہم آپ کے ساتھ ہیں (سب کچھ) سنتے ہیں ﴿۱۵﴾ سو دونوں فرعون کے پاس جایئے پھر اس سے کہیے ہم تمام جہانوں کے مالک کے پیغمبر ہیں ﴿۱۶﴾ (اور اس لیے آئے ہیں) کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دو ﴿۱۷﴾ کہنے لگا کیا ہم نے تم کو بچپن میں پرورش نہیں کیا اور تم نے ہمارے ہاں برسوں عمر بسر نہیں کی ﴿۱۸﴾ اور تم نے وہ کام کیا جو کیا تھا (یعنی قبطی کا قتل) اور تم ناشکرے ہو ﴿۱۹﴾ (موسیٰ علیہ السلام نے) فرمایا ہاں وہ حرکت تب مجھ سے ہوئی تھی اور مجھ سے غلطی ہوئی ﴿۲۰﴾ جب مجھے تم سے ڈر ہوا تو مَیں تم سے بھاگ گیا پھر میرے پروردگار نے مجھے حکمت (نبوت) عطا کی اور مجھے پیغمبروں میں شامل فرمایا ﴿۲۱﴾ اور کیا یہی احسان ہے جو تم مجھ پر رکھتے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے ﴿۲۲﴾ فرعون نے کہا کہ جہانوں کا پروردگار کیا ہے؟ (یعنی اس کی حقیقت کیا ہے؟) ﴿۲۳﴾ انہوں نے فرمایا آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے اس کا پروردگار، اگر تم کو یقین کرنا ہو تو ﴿۲۴﴾ اس (فرعون) نے اپنے گِرد والوں سے کہا، کیا سنا تم نے؟ ﴿۲۵﴾ انہوںؑ نے فرمایا وہ پروردگار (اللہ) ہے تمہارے اور پروردگار ہے تمہارے پہلے باپ دادا کا ﴿۲۶﴾ (فرعون) کہنے لگا کہ تمہارا یہ پیغمبر جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے ضرور پاگل ہے ﴿۲۷﴾ انہوں نے فرمایا مشرق اور مغرب اور جو کچھ ان کے

درمیان ہے اس کا پروردگار (اللہ) ہے اگر تم میں عقل ہو تو ﴿۲۸﴾ (فرعون جھلا کر) کہنے لگا اگر تم نے میرے علاوہ کسی اور کو معبود بنایا تو مَیں ضرور تم کو قید میں ڈال دوں گا ﴿۲۹﴾ انہوں نے فرمایا خواہ میں تمہارے پاس واضح دلیل (معجزہ) بھی لاؤں تو! ﴿۳۰﴾ کہنے لگا اگر تم سچے ہو تو اس کو لے آؤ ﴿۳۱﴾ پس انہوں نے اپنی لاٹھی ڈالی تو وہ اُسی وقت بہت بڑا اژدھا بن گئی ﴿۳۲﴾

تفسیر ومعارف

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی شفقت کہ آپ کفار کا بھی دکھ محسوس فرماتے تو اللہ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تشفی فرمائی کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) اپنے سے پہلے انبیاؑ کی طرف خیال فرمایے۔ موسیٰ (علیہ السلام) کا واقعہ دیکھیے جب اللہ نے انہیں حکم دیا کہ فرعون کے پاس جایئے جو بہت ظالم ہے۔

واقعہء موسیٰ علیہ السلام:

فراعنہء مصر ملک پر چار پانچ صدیاں مسلّط رہے۔ چار سو سال کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں تباہ ہوئے۔ یہ بہت ظالم سخت گیر لوگ تھے۔ فرعون ان کا لقب تھا۔ یکے بعد دیگرے یہ اقتدار میں آئے۔ جو اقتدار میں آجاتا وہ فرعون کہلاتا تھا۔ اقتدار میں آتے ہی اپنے خدا ہونے کا دعویٰ کرتا، خود کو سجدے کرواتا تھا۔ اس کے علاوہ عوام پر تشدد کرواتا۔ بنی اسرائیل اس کے ظلم کی چکی میں بری طرح پس رہے تھے تو اللہ کریم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا: وَاِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰٓی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۙ﴿۱۰﴾ اور جب آپ کے پروردگار نے موسیٰ (علیہ السلام) کو فرمایا کہ ظالم لوگوں کے پاس جائیں۔ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا یَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾ یعنی قومِ فرعون کے پاس، کیا یہ ڈرتے نہیں؟

یہ لوگ اتنے دیدہ دلیر ہو گئے ہیں۔ اللہ کی نافرمانی پر کمر بستہ ہیں۔ غریبوں کو تنگ کر رہے ہیں، لوٹ مار اور قتلِ عام کر رہے ہیں۔ لوگوں کی جان، مال، آبرو سے کھیل رہے ہیں۔ کیا انہیں عظمتِ الٰہی سے ڈر نہیں لگتا۔ انہیں اللہ کا کوئی خوف نہیں۔ انہیں اس بات کا قطعاً احساس نہیں کہ جن پر یہ ظلم وزیادتی کر رہے ہیں وہ بھی اس کی مخلوق ہیں جس نے انہیں بھی پیدا کیا ہے۔ وہی اکیلا مالک ہے۔ کل اسی کے سامنے جواب بھی دینا ہوگا۔

فرعونی جو ظلم کرتے تھے آج کل دہشت گرد وہی ظلم ڈھا رہے ہیں۔ وہ بے گناہ بچوں کو قتل کر دیتے تھے

آج بھی لوگ بے گناہ مارے جارہے ہیں۔ امیروں کو کسی حد تک تحفظ حاصل ہے کہ وہ اپنے لیے سیکورٹی گارڈ، ذاتی محافظ رکھ لیتے ہیں لیکن غریب جو گھر سے سودا لینے نکلا وہ دہشت گردوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس میں اس کا کیا قصور تھا؟ یہ فرعونیت ہے۔

اللہ کریم نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ اس ظالم قوم کی طرف جائیں جنہیں موت کا کوئی اندازہ نہیں، بعد از موت کا کوئی خوف نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی: قَالَ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّکَذِّبُوۡنِ ﴿۱۲﴾ انہوں نے عرض کیا! اے میرے پروردگار! بے شک میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھوٹا سمجھیں۔ وَیَضِیۡقُ صَدۡرِیۡ وَلَا یَنۡطَلِقُ لِسَانِیۡ فَاَرۡسِلۡ اِلٰی ہٰرُوۡنَ ﴿۱۳﴾ اور (طبعی طور پر) میرا دل تنگ ہونے لگتا ہے اور میری زبان (اچھی طرح) نہیں چلتی تو اس لیے ہارون (علیہ السلام) کو بھی وحی بھیج دیجیے۔

موسیٰ علیہ السلام نے تبلیغِ دین میں سہولت کے لیے اسباب طلب کیے۔ عرض کی کہ مہربانی کیجیے، تبلیغ کے لیے ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت عطا کر دیجیے۔ آپؑ کی زبانِ مبارک میں بچپن کے ایک واقعہ کے باعث لکنت آ گئی تھی۔ آپؑ معصوم بچے تھے، فرعون نے ایک مرتبہ آپؑ کو گود میں بٹھا لیا تو آپؑ نے اس کی داڑھی نوچ لی۔ وہ خفا ہو گیا اور حکم دیا کہ یہ بچہ قتل کر دیا جائے۔ اس کی اہلیہ نے سمجھایا کہ معصوم بچہ ہے اسے کیا معلوم۔ اس پر آپؑ کی معصومیت ثابت کرنے کے لیے دو تھال منگوائے گئے ایک میں جواہرات اور دوسرے میں انگارے تھے کہ دیکھتے ہیں یہ بچہ کس پر ہاتھ ڈالتا ہے تو موسیٰ علیہ السلام نے بحکمِ الٰہی آگ کا انگارہ اٹھا کر زبانِ مبارک پر رکھ لیا۔ زبان جل گئی جس کی وجہ سے زبان میں لکنت آ گئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں اس لکنت کا بھی ذکر کیا۔ مزید عرض کی: وَلَہُمۡ عَلَیَّ ذَنۡۢبٌ فَاَخَافُ اَنۡ یَّقۡتُلُوۡنِ ﴿۱۴﴾ اور میرے ذمہ ان لوگوں کا ایک جرم بھی ہے (قبطی کا قتل) تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے (تبلیغِ رسالت سے پہلے ہی) قتل کر ڈالیں۔

اس آیہء مبارکہ میں ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ ہوا یوں کہ موسیٰ علیہ السلام کہیں سے گزر رہے تھے تو ایک فرعونی کو کسی اسرائیلی پر ظلم ڈھاتے دیکھ لیا۔ آپؑ اسے بچانے کے لیے چھڑانے لگے لیکن وہ فرعونی باز نہ آیا۔ آپؑ نے اسے مُکا دے مارا۔ فرعونی مر گیا۔ اسرائیلی گھر چلا گیا۔ بات ختم ہو گئی لیکن فرعونی کا مرنا بڑی بات تھی۔ بہت شور ہوا۔ دوسرے دن موسیٰ علیہ السلام کا گزر ہوا تو وہی اسرائیلی کسی دوسرے فرعونی سے جھگڑا کر رہا تھا اور اب مار کھا رہا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے، اسے تنبیہ کی کہ تم آئے روز فساد کرتے رہتے ہو۔ اسے بچانے کے لیے فرعونی کی طرف بڑھے تو اسرائیلی چیخ اٹھا کہ کل بھی آپ نے ایک فرعونی قتل کر دیا تھا۔ آج بھی آپ ظلم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی یہ بات لوگوں نے سنی، فرعون تک پہنچ گئی۔ فرعون اور اہلِ دربار نے فیصلہ دے دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا

جائے۔ایک شخص نے یہ خبر سن کر موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع کر دی اور آپؑ فرعون کی سلطنت سے نکل کر مدین چلے گئے شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچ گئے۔اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کی کہ ان لوگوں کا ایک جرم مجھ پر ادھار ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ آپ کا پیغام پہنچانے سے پہلے ہی، میری بان سننے سے پہلے ہی وہ میری گردن مار دیں گے۔میرے قتل کا حکم تو فرعون کئی سال پہلے دے چکا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اس پر عملدرآمد کریں گے۔

اصل طاقت معیتِ باری ہے:

اللہ کریم نے فرمایا: قَالَ كَلَّا ۔۔۔فرمایا، ہرگز نہیں۔آپ بے خطر ہو کر جائیں ان کی کیا جرأت، وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکیں گے۔ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾ پس آپ دونوں ہماری نشانیاں لے کر جائیں یقیناً ہم آپ کے ساتھ ہیں (سب کچھ) سنتے ہیں۔

فرمایا، آپؑ کو بے شمار معجزات عطا کر دیے گئے ہیں۔آپ دونوں بھائی میری نشانیاں لے کر جائیں میں خود آپ کے ساتھ ہوں، سب کچھ سن رہا ہوں، جو ہوگا میرے سامنے ہوگا۔حق یہی ہے کہ اصل طاقت معیتِ باری ہے۔ اللہ کا ساتھ، کس کو کتنا نصیب ہے، کس کو اللہ کی طرف سے کتنی قوت حاصل ہے۔انبیاؑ کی نبوت ان کی ذاتی صفت ہوتی ہے۔ نبیؑ ہمیشہ سے نبیؑ ہوتے ہیں۔ پشت پدر میں، شکم مادر میں، پیدائش سے بعثت تک نبیؑ ہی ہوتے ہیں۔ مبعوث ہونا الگ بات ہے جب تبلیغ کا حکم دیا جاتا ہے تو نبیؑ مبعوث ہوتا ہے۔ نبیؑ ازل سے نبیؑ ہے۔ دنیا میں نبیؑ ہے، برزخ میں نبیؑ ہے، قیامت کو نبیؑ ہی ہوگا اور نبیؑ جنت میں بھی نبیؑ ہی ہوگا۔اس کی نبوت کی عظمت اس کا وصفِ ذاتی ہوتی ہے۔ جب نبوت وصفِ ذاتی ہے تو معیتِ باری بھی وصفِ ذاتی بن جاتی ہے۔ نبیؑ کو ہمہ وقت اللہ کی معیت نصیب ہوتی ہے لیکن بڑی عجیب بات یہ ہے کہ نبیؑ کو جو معیت نصیب ہوتی ہے وہ ذاتی نہیں صفاتی ہوتی ہے۔

آس آیہء مبارکہ میں معیتِ باری کا ذکر ہے کہ ہم آپ دونوں کے ساتھ ہیں، سن رہے ہیں۔ یہاں لفظ مُّسْتَمِعُوْنَ استعمال ہوا ہے۔ اسْتَمَاعٌ ذاتِ باری کی صفت ہے۔ انبیاؑ کو معیتِ باری دائمی نصیب ہوتی ہے، ہمیشہ معیتِ باری رہتی ہے لیکن معیت صفاتی ہوتی ہے۔ معیتِ ذاتی کا شرف انبیاؑ میں صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی خصوصیت ہے اور غیر انبیاؑ میں یہ شرف حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حاصل ہوا ہے جب غارِ ثور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے صدیق اکبرؓ سے فرمایا: لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۔۔۔لفظ معنا میں دونوں طرف ذوات ہیں۔ ایک طرف اللہ کریم کی ذات ہے دوسری طرف گروہ انبیاؑ کے امام حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ پاک ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے طفیل آپ کے امتیوں میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ذات ہے۔

حکم ہوا فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ ۔۔۔سو دونوں فرعون کے پاس جایئے۔ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ پھر اس سے کہیے کہ ہم تمام جہانوں کے مالک کے پیغمبر ہیں۔ارشادِ باری تعالیٰ کی تعمیل میں دونوں حضرات، موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام تشریف لے گئے۔فرعون کے دربار میں پہنچ کر فرمایا، ہم دونوں تمہاری طرف اللہ کے فرستادہ ہیں۔آپؑ کی دعوت کی بنیاد دو باتیں تھیں۔ایک یہ کہ اللہ کی عظمت کو قبول کرو۔اپنی خدائی کا دعویٰ چھوڑ دو، توبہ کرو اور دوسرا یہ کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ کر دو: اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾ (اور اس لیے آئے ہیں) کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دو۔

موسیٰ علیہ السلام نے تقاضا کیا کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دیں۔ان کا اصل وطن تو ملکِ شام ہے ہم انہیں وہاں جا کر آباد کر دیں گے۔ بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی اولاد تھے۔ جب یوسف علیہ السلام برسرِ اقتدار آئے تو آپؑ نے والدین اور بھائیوں کو اپنے پاس مصر بلوا لیا پھر ان کی اولاد وہیں رچ بس گئی۔ یوسف علیہ السلام دنیا سے کوچ کر گئے۔فرعونوں کے جبر و استبداد کا دور آ گیا اور یہ دور چار سو سال پر محیط ہوا۔ان چار سو سالوں میں بنی اسرائیل بھی بڑھتے بڑھتے کثیر تعداد میں ہو گئے۔قبطیوں نے انہیں غلام بنا رکھا تھا۔ عمارات بنانے سے لے کر گھریلو کاموں تک اسرائیلیوں سے ہی بیگار لی جاتی تھی۔ اسرائیلی بہت بُری غلامی میں جکڑے ہوئے تھے۔ان سے ان کی استطاعت سے زیادہ کام لیا جاتا، کھانے کو اسی قدر ملتا کہ زندہ رہ سکیں بری طرح پیٹا جاتا اور تذلیل کی جاتی تھی۔ اللہ کریم نے ان کی خلاصی کے لیے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا۔ موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکلے تو علماء کے نزدیک بنی اسرائیل کی تعداد تقریباً سوا چھ لاکھ ہو چکی تھی۔

مناظرہ:

فرعون کے پاس چونکہ سچائی نہیں تھی اس لیے دلائل بھی نہیں تھے تو وہ اپنے امرائے دربار کے سامنے خود کو سچا کرنے کرنے کے لیے مناظرے پر اتر آیا۔لفظ مناظرہ، نظیر سے مشتق ہے۔نظیر پیش کر کے، مثال پیش کر کے دلائل دے کر اپنی بات کو سچ ثابت کیا جاتا ہے اور مخالف کی بات کو غلط ثابت کیا جاتا ہے۔مناظرے میں جس فریق کے پاس دلائل ہوتے ہیں وہ دلائل پیش کرتا ہے جس کے پاس دلائل نہ ہوں وہ کج بحثی کرتا ہے۔اِدھر کی بات اُدھر کر دی اور غیر متعلقہ بات چھیڑ دی۔اصل بات چھوڑ کر کوئی اور بات چھیڑ دی۔فرعون کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی کہ وہ کہتا کہ آپ (علیہ السلام) نبی نہیں ہیں۔اس پر بھی کوئی دلیل نہیں تھی کہ کہتا کہ مَیں ہی اللہ ہوں، مَیں ہی پروردگار ہوں۔ ان دونوں باتوں کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی اس نے کج بحثی کی ابتدا کی: قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا

وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ کہنے لگا، کیا ہم نے تم کو بچپن میں پرورش نہیں کیا اور تم نے ہمارے ہاں برسوں عمر بسر نہیں کی۔ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ اور تم نے وہ کام کیا جو کیا تھا (یعنی قبطی کا قتل) اور تم ناشکرے ہو۔

فرعون نے اپنے احسانات جتلائے۔ طعنہ دیا کہ آپ کو تو ہم نے ننھا منا بچہ لیا تھا، آپ کی پرورش کی۔ جوان ہونے تک ہمارے محلات میں پرورش پاتے رہے۔ آپ نے ہماری نیکی کا اچھا بدلہ دیا کہ ہمارا ہی ایک بندہ قتل کر دیا۔ آپ تو یقیناً بہت ہی ناشکرے نکلے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، میں اس قبطی کو قتل کرنے کے ارادے سے وہاں نہیں گیا تھا نہ میں اسے مارنا چاہتا تھا۔ وہ ظلم کر رہا تھا میں بیچ بچاؤ کرا رہا تھا اس نے مجھ سے بھی جھگڑا کیا، میں نے اسے مکا مار دیا اور وہ مر گیا۔ میں نے ارادتاً اسے قتل نہیں کیا۔ یہ قتلِ عمد نہیں تھا۔ پھر بھی یہ میری غلطی تھی۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے جب اطلاع ہوئی کہ آپ لوگوں نے میرے قتل کا فیصلہ کیا ہے تو میں اس ڈر سے آپ کا ملک ہی چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے بعد مجھے اللہ کریم نے اپنے رسولوں اور پیغمبروں میں شامل کر لیا۔ مجھے نبوت، حکمت و دانش عطا کر دی اور علوم کے خزانے عطا فرما دیے۔ غلطی کا ارتکاب اتفاقاً ہو جانا نبوت کے منافی نہیں۔ نبی معصوم عن الخطا ہوتا ہے۔ نبیؑ عمداً خطا نہیں کرتا۔ اتفاقاً یا بتقاضائے بشریت کوئی ایسا کام جو خلافِ مصلحت ہو، ہونا ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے۔ اور یہ نبوت کے منافی نہیں ہے۔ قَالَ ۔۔۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾ ہاں! وہ حرکت تب مجھ سے ہوئی تھی اور مجھ سے غلطی ہوئی۔ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾ جب مجھے تم سے ڈر ہوا تو میں تم سے بھاگ گیا پھر میرے پروردگار نے مجھے حکمت (نبوت) عطا کی اور مجھے پیغمبروں میں شامل فرمایا۔

پیغمبرؑ کے دلائل:

فرمایا: وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾ اور کیا یہی احسان ہے جو تم مجھ پر رکھتے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، یہ جو تم مجھ پر احسان کر رہے ہو کہ تم نے مجھے ایک دن کا بچہ لے کر پالا تو پہلے یہ جواب دو کہ میں ایک دن کا بچہ تمہارے پاس کیوں آیا؟ میری والدہ ماجدہ کو کیا ضرورت تھی کہ وہ اپنا ایک دن کا بچہ دریا میں ڈال دیتیں۔ یہ تم ہی تھے جو بنی اسرائیل کے بیٹے قتل کروا دیتے تھے۔ تم نوزائیدہ بچوں کے قاتل تھے اور تمہارے اس فیصلے کے ڈر سے میری والدہ ماجدہ نے مجھے دریا میں ڈال دیا۔ تم نے اتفاقاً دیکھا تو مجھے پکڑ لیا۔ یہ تمہارا

مجھ پر کوئی احسان نہیں تھا۔ تمہارے ظلم کے نتیجے میں، مَیں دریا میں بہہ کر تمہارے پاس آ گیا۔ جسے تم اپنا احسان بتا رہے ہو، یہ تمہارے ظلم کا نتیجہ تھا۔ اگر تم یہ ظلم نہ کرتے تو میری والدہ مجھے دریا میں نہ ڈالتیں۔ یہ تو میرے ربّ کی قدرت تھی کہ جس کو تم قتل کرنا چاہتے تھے اور جس کے لیے تم نے ہزاروں بچے قتل کرا دیے اس قادر نے تمہیں اس بچے کی خدمت پر لگا دیا۔ تم اسی کو پالتے رہے جس کو قتل کرنا چاہتے تھے۔

آپؑ نے دلائل سے بات کی اور اس پر ثابت کر دیا کہ یہ اس کا احسان نہیں اس کے ظلم کا نتیجہ تھا۔ جب وہ اس طرف سے عاجز ہو گیا تو: قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾ فرعون نے کہا کہ جہانوں کا پروردگار کیا ہے؟ (یعنی اس کی حقیقت کیا ہے؟)

'مَا' سے مراد ہے کیا۔ اس نے کہا، جسے تم ربّ العالمین، سارے جہانوں کا ربّ کہتے ہو وہ کیا ہے؟ اس کی کُنہ، اس کی ذات کیا ہے، وہ انسان ہے، فرشتہ ہے، جنّ ہے، کیا ہے؟

ذاتِ باری کی کُنہ، انسانی علوم اور انسانی عقل میں نہیں آ سکتی اس لیے کہ وہ خالق ہے اور ساری کائنات مخلوق ہے۔ انسان، جنّ اور فرشتے ہر چیز مخلوق ہے۔ مخلوق کا علم بھی مخلوق ہے۔ اسے جو عطا ہوا ہے اس کی استعداد کے مطابق ہے۔ جو چیزیں مخلوق کے علم کے اندر آ جائیں وہ بھی مخلوق ہیں۔ چونکہ خالق، مخلوق کے اندر نہیں سما سکتا اس لیے ذاتِ باری پر بحث نہیں کی جاتی۔ کوئی سمجھ سکتا ہے نہ سمجھا سکتا ہے۔ صفاتِ باری پر بات ہوتی ہے۔ صفات سے ذات کی پہچان نصیب ہوتی ہے کہ اللہ قادر ہے، خالق ہے، رازق ہے، رحم کرنے والا ہے، حساب لینے والا ہے۔

فرعون کو تو صرف کج بحثی کرنا تھی اس لیے اس نے یہ جاننے کے بجائے کہ اللہ، ربّ العالمین کون ہے، کیسا ہے یہ کہا کہ ربّ العالمین کیا ہے وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۴﴾ موسیٰ علیہ السلام نے جو جواب دیا وہ حقائق پر مبنی تھا۔ وہ ایک دلیل تھی۔ فرمایا: قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۴﴾ انہوں نے فرمایا آسمانوں اور زمین میں اور جو کچھ ان میں ہے اس کا پروردگار، اگر تم کو یقین کرنا ہو تو۔

آپؑ نے اللہ کریم کی صفات کی بات کی کہ وہ پالنہار ہے۔ ساری کائنات کا پالنے والا ہے۔ ساری کائنات کو بنانے والا، قائم رکھنے والا، تمام مخلوقات کو پیدا کرنے والا پالنے والا وہی ہے۔ اگر تمہیں یقین کرنا ہو تو اس پر غور کرو کہ آسمان اتفاقاً نہیں بن گیا۔ یہ ایک نظام کے تحت ہے۔ تمہارے پاس ایک سیارہ زمین ہے۔ اسی کی وسعتوں کا اندازہ کر لو اس میں کتنی تخلیق ہے۔ جڑی بوٹیوں، گھاس، روئیدگی سے لے کر پہاڑوں، دریاؤں، چشموں، نہروں تک۔ انسان، حیوانوں، پرندوں سے ننھی ننھی مخلوقات تک اتنی بے شمار مخلوق ہے، ان کی اتنی قسمیں ہیں کہ تم گن نہیں سکتے۔ ان سب کو کسی نے بنایا ہے۔ ان سب کو کوئی پال رہا ہے، حیات و موت سے گزار رہا ہے، روزی و رزق دے رہا

ہے، دن اور رات کے نظام کو جو کوئی چلا رہا ہے وہی ربّ ہے۔ میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔ اگر تمہارا ارادہ سمجھنے کا ہو تو یہ ساری کائنات اور اس کا ایک ایک ذرہ اس کی عظمت کا گواہ ہے۔ جھگڑا کرنا تو ایک اور بات ہے لیکن اگر تمہیں سمجھنا ہے، ماننا ہے تو قدرت باری کے مظاہر اس کی ذات پر گواہ ہیں لیکن وہ تو سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ بات کو الجھانا چاہتا تھا تو: قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾ اس (فرعون) نے اپنے اردگرد والوں سے کہا، کیا سنا تم نے؟

وہ اپنے اہل دربار سے جو اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے کہنے لگا، سن رہے ہو؟ میں نے پوچھا کیا ہے اور یہ جواب کیا دیتے ہیں۔ میں نے پوچھا ہے وہ ہے کون اور یہ کہتے ہیں وہ خالق ہے، مالک ہے، رازق ہے۔ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾ انہوں نے فرمایا وہ پروردگار (اللہ) ہے تمہارا اور پروردگار ہے تمہارے پہلے باپ دادا کا۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا وہ تمہارا بھی ربّ ہے۔ تمہیں بھی اسی نے پیدا کیا۔ اگر تم پیدا کرنے والے ہوتے تو خود کیوں مرتے۔ چار صدیوں میں کتنے ہی تمہارے آباء واجداد آئے اور مر گئے۔ چار سو سال میں کم از کم بارہ پشتیں گزر گئیں۔ تم نے بھی مر جانا ہے۔ تم پیدا کرنے والے ہوتے تو خود نہ مرتے۔ جو مر جاتا ہے وہ پیدا کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ اسی نے تمہیں پیدا کیا، پرورش کیا۔ تمہارے پاس جو دولت و اقتدار ہے سب اسی کا دیا ہوا ہے۔ جس کی طرف میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں وہی تمہارا بھی خالق و مالک ہے اور تمہارے آباء واجداد کا خالق و مالک بھی وہی ہے۔ یہ سن کر: قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾ (فرعون) کہنے لگا کہ تمہارا یہ پیغمبر جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے ضرور پاگل ہے۔

فرعون جو اپنی ربوبیت کا مدعی تھا یہاں بھی لاجواب ہو گیا۔ اب کیسے کہتا کہ یہ آسمان اور زمین میں نے بنائے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے دلائل سے عاجز ہو چکا تھا کیسے کہتا کہ میں ہی خالق ہوں میں نے ہی زمین و آسمان اور مخلوقات پیدا کی ہیں، میں ہی مالک ہوں۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا اس لیے موسیٰ علیہ السلام پر کج بحثی کا الزام لگا دیا اور کہا کہ میں سوال اور کرتا ہوں یہ جواب اور دیتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام ایک کے بعد ایک دلیل دیتے رہے: قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ انہوں نے فرمایا مشرق اور مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کا پروردگار (اللہ) ہے اگر تم میں عقل ہو تو۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اگر تم میں عقل کی رمق ہے، تمہارا ذہن کام کرتا ہے تو سوچو کہ کون ہے جو سورج کو طلوع کرتا ہے، کون ہے جو سورج کو غروب کرتا ہے؟ کس نے سورج کو روشنی دی، کس نے رات کو تاریکی بخشی، چاند کس کے حکم سے روشن ہے، کون ستارے نکالتا ہے۔ شب و روز کس کے حکم سے، کس کی

قدرتِ کاملہ سے چل رہے ہیں؟ یہ سارے کام اسی ایک واحد و لاشریک ربّ کے حکم سے اس کی قدرتِ کاملہ سے ہو رہے ہیں۔

فرعون پہلے تو بات بدل بدل کر کج بحثی کرتا رہا۔ اب اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ رہا۔ بالکل ہی لاجواب ہو گیا تو جھلایا: قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾ (فرعون جھلا کر) کہنے لگا اگر تم نے میرے علاوہ کسی اور کو معبود بنایا تو میں ضرور تم کو قید میں ڈال دوں گا۔

موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ:

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ انہوں نے فرمایا خواہ میں تمہارے پاس واضح دلیل (معجزہ) بھی لاؤں تو!

آپؑ نے فرمایا، ابھی تک میرے دلائل زبانی تھے۔ میرے تمام دلائل مضبوط تھے۔ تمہارے پاس کسی دلیل کا کوئی جواب نہیں تھا تم صرف کج بحثی کرتے رہے۔ اس کے بعد اگر میں کوئی ایسی واضح دلیل دکھا دوں جو میری نبوت کی دلیل ہو تو پھر! قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ کہنے لگا اگر تم سچے ہو تو اس کو لے آؤ۔

کہنے لگا اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو دکھاؤ، تمہارے پاس کیا ہے؟ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۳۲﴾

پس انہوں نے اپنی لاٹھی ڈالی تو وہ اسی وقت بہت بڑا اژدھا بن گئی۔

موسیٰ علیہ السلام کے زیر استعمال لکڑی کی ایک لاٹھی تھی۔ اس کے اوپر کے سرے پر دو شاخیں تھیں۔ عام لکڑی کی لاٹھی تھی لیکن جب آپؑ نے اسے فرعون کے دربار میں فرش پر ڈالا تو وہ بہت بڑا اژدھا بن گئی۔

سورۃ الشعرآء رکوع 3 آیات 33 تا 51

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۳۳﴾ قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ
عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾
قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ
عَلِيْمٍ ﴿۳۷﴾ فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ
اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾ فَلَمَّا
جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾ قَالَ
نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ
مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ
الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۴۵﴾ فَاُلْقِيَ
السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾
قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ
السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ
وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۹﴾ قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۚ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّا
نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۱﴾

اور اپنا ہاتھ (بغل میں دے کر) نکالا تو اُسی دم دیکھنے والوں کے لیے سفید براق ہو گیا (نظر آنے لگا) ﴿۳۳﴾ اپنے اردگرد کے سرداروں سے کہنے لگا کہ یقیناً یہ بڑا

ماہرِ فن جادوگر ہے ﴿۳۴﴾ چاہتا ہے کہ اپنے جادو سے تمہیں تمہارے ملک سے
نکال دے سو تمہاری کیا رائے ہے؟ ﴿۳۵﴾ انہوں نے کہا کہ ان کو اور ان کے
بھائی کو لوٹا دیں اور شہروں میں بلانے والے بھیج دیں ﴿۳۶﴾ کہ سب ماہر
جادوگروں کو آپ کے پاس لے آئیں ﴿۳۷﴾ غرض وہ جادوگر ایک مقررہ دن کے
خاص وقت پر جمع کیے گئے ﴿۳۸﴾ اور (فرعون کی طرف سے) لوگوں سے بھی کہا
گیا کہ تم سب لوگ (بھی) جمع ہوؤ گے ﴿۳۹﴾ تا کہ اگر جادوگر جیت جائیں تو ہم
ان کی پیروی کریں (جیسے پہلے کر رہے تھے) ﴿۴۰﴾ پھر جب جادوگر آ گئے تو
فرعون سے کہنے لگے کہ اگر ہم جیت گئے تو کیا ہم کو کوئی بڑا انعام ملے گا؟ ﴿۴۱﴾ اس
نے کہا ہاں اور تب تم (ہمارے) مقرب لوگوں میں شامل ہو جاؤ گے ﴿۴۲﴾ موسیٰ
(علیہ السلام) نے اُن سے فرمایا کہ تم کو جو کچھ ڈالنا ہو (میدان میں) ڈالو ﴿۴۳﴾
پس انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں اور کہنے لگے کہ فرعون کے اقبال سے
بے شک ہم ہی غالب رہیں گے ﴿۴۴﴾ پھر موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنا عصا ڈالا تو
تبھی وہ ان کے بنے بنائے دھندے کو نگلنے لگا ﴿۴۵﴾ سو جادوگر (یہ دیکھ کر)
سجدے میں گر پڑے ﴿۴۶﴾ کہنے لگے ہم ایمان لائے جہانوں کے پروردگار
پر ﴿۴۷﴾ جو موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کا پروردگار ہے ﴿۴۸﴾ (فرعون
نے) کہا کہ مجھ سے اجازت حاصل کرنے سے پہلے تم اُس پر ایمان لے آئے،
بے شک یہ تمہارا بڑا (استاد) ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے تمہیں (اس کا نتیجہ)
جلد ہی پتہ چل جائے گا مَیں ضرور تمہارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا دوں
گا اور ضرور تم سب کو سُولی دے دوں گا ﴿۴۹﴾ انہوں نے کہا کوئی حرج نہیں
بے شک ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں ﴿۵۰﴾ یقیناً ہم امید

رکھتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہماری خطائیں معاف فرمائے گا کہ ہم (اس موقع پر)
سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں ﴿۵۱﴾

تفسیر ومعارف

موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کا تسلسل:

پہلے عصا ڈالا جو اژدھا بن گیا پھر: وَنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۳۳﴾ اور اپنا ہاتھ (بغل میں دے کر) نکالا تو اسی دم دیکھنے والوں کے لیے سفید براق ہو گیا (نظر آنے لگا)

آپؑ نے بغل میں ہاتھ دے کر نکالا تو وہ چاند کی طرح روشن ہو گیا۔ اس کی چمک سے لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر بھی وہ ہدایت کا خواہشمند نہ ہوا اور بات کو دوسری طرف لے گیا۔ قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ اپنے اردگرد کے سرداروں سے کہنے لگا یقیناً یہ بڑا ماہرِ فن جادوگر ہے۔ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال دے سو تمہاری کیا رائے ہے؟

موسیٰ علیہ السلام تو دعوت دے رہے ہیں کہ تم بھی توبہ کرو۔ اللہ پر ایمان لاؤ۔ اپنی خدائی کے دعوے سے باز آ جاؤ۔ تم اپنی حکومت و بادشاہت کرتے رہو۔ بنی اسرائیل جنہیں تم نے غلام بنا رکھا ہے، قید کر رکھا ہے انہیں یہاں سے جانے دو۔ یہ اپنے ملک چلے جائیں گے۔ وہاں یہ اپنی آزادانہ زندگی گزاریں گے۔ تم انہیں اپنے لیے بوجھ سمجھتے ہو تو انہیں جانے دو یہ شام کے باشندے ہیں وہاں چلے جائیں گے۔ اس دعوت میں تو موسیٰ علیہ السلام نے کہیں نہیں کہا کہ ہم تمہاری بادشاہی چھین لیں گے لیکن فرعون کو اہلِ دربار میں اپنا بھرم قائم رکھنا تھا اس لیے وہ بات کو دوسری طرف پلٹ کر لے گیا کہ یہ تو کوئی بڑا ماہر جادوگر ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ تمہیں جادو کے زور سے اس ملک سے نکال دے، حکومت بھی لے لے اور ملک بھی چھین لے تو اب تم میرے اہلِ دربار مجھے مشورہ دو کہ ان کا کیا کیا جائے؟

اس کا یہ کہنا حق کے خلاف تھا کیونکہ انبیاؑ کسی دنیوی مفاد کا مطالبہ نہیں کرتے۔ کسی سے کوئی اجر، معاوضہ نہیں چاہتے۔ ان کا اجر اللہ کریم کے پاس ہے۔

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾ انہوں نے کہا ان کو اور ان کے بھائی کو لوٹا

دیں اور شہروں میں بلانے والے بھیج دیں۔ یَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۳۷﴾ کہ سب ماہر جادوگروں کو آپ کے پاس لے آئیں۔ اہل دربار نے کہا آپ موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے بھائی ہارون (علیہ السلام) سے کوئی تعرض نہ کریں اور انہیں واپس بھیج دیں۔ یہ اگر جادو کے زور سے ہم پر غلبہ پانا چاہتے ہیں تو ہمارا کام یہ ہے کہ ہم جادو سے ہی ان کا مقابلہ کریں تا کہ عوام کو پتا چل جائے کہ ہم حق پر ہیں۔ مصر میں ایک سے ایک بڑا جادوگر موجود ہے۔ آپ اپنے ہرکارے شہروں میں دوڑا دیجیے کہ سب کو اکٹھا کر کے آپ کی بارگاہ میں لے آئیں۔ فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾ غرض وہ جادوگر ایک مقررہ دن کے خاص وقت پر جمع کیے گئے۔

انبیاؑ کے معجزات۔۔۔:

انبیاؑ کے معجزات اس عہد کے لوگوں کے کمالات کو عاجز کر دیتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے وقت مصر میں جادو عام تھا۔ بڑے سے بڑا جادوگر ملتا تھا تو آپؑ کے معجزات نے لوگوں کے پاس جو کمالات تھے انہیں عاجز کر دیا۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو طِب اپنے عروج پر تھی۔ ایک سے ایک اعلیٰ طبیب ملتا تھا۔ آپؑ کے معجزات لاعلاج بیماریوں کی شفا تھی۔ آپؑ مادرزاد اندھے کو اللہ کے حکم سے بینا کر دیتے تھے۔ مُردوں کو بحکمِ الٰہی زندہ کر دیتے تھے۔ طبیب علاج کر کے مُردے کو کیسے زندہ کرتے آپؑ کے معجزات اس وقت کے لوگوں کے کمالات کو عاجز کر دینے والے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوئے تو زبان دانی، علم و فضل کا دور دورہ تھا۔ یہود کے علماء تھے، عیسائیوں کے علماء تھے۔ اہل عرب خود ایک سے ایک بڑھ کر قادر الکلام شاعر اور نثر نگار تھے۔ غلام اور باندیاں گھر کے کام کاج کرتے ہوئے شعروں میں بات کر لیا کرتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو اللہ کریم نے علوم کے خزانے عطا فرما دیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو ایسے معجزات عطا فرما دیے گئے جو رہتی دنیا تک کے کمالات کو عاجز کر دینے والے ہیں۔ جوں جوں زمانہ بدلتا جا رہا ہے، نئی نئی ایجادات ہو رہی ہیں لیکن زمانے کی کوئی ایجاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے کمالات کی ہمسری نہیں کر سکتی، عاجز آتی جا رہی ہے۔

انبیاؑ کے معجزات حق ہوتے ہیں اور جادو ناحق ہے۔ جادوگر کسی کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں نہ سنوار سکتے ہیں۔ وقتی طور پر نگاہوں کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ چیز اور ہوتی ہے نظر کچھ اور آتی ہے۔ جادو سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدل سکتی، اس کی ماہیت نہیں بدلتی۔ قلبِ ماہیت حرام ہے یعنی جس چیز کو اللہ نے جو بنایا ہے اسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ جادو کے ذریعے لکڑی سے سانپ بنایا نہیں جا سکتا، دکھایا جا سکتا ہے۔ جادوگر کرے گا تو وہ لکڑی سانپ جیسی دکھائی دینے لگے گی۔ یہ انسان کی قوتِ متخیلہ کی کمزوری ہے۔ اگر کوئی جادو سے نہ ڈرے، جادوگر کے رعب میں نہ آئے، اس کی

بات پر یقین نہ کرے تو پھر اس کے دھوکے سے بھی سانپ نظر نہیں آ سکتا۔ جو چیز اللہ نے جیسی پیدا کی ہے ویسی ہی رہتی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ ہاں! انبیاؑ کے معجزات الگ ہیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے عصا پھینکا تو وہ واقعی اژدھا بن گیا اس لیے کہ وہ اللہ نے بنایا۔ وہ قادر ہے جس چیز کو چاہے جیسا بنا دے۔

آج کی مسلمانی کیسی ہے کہ مسلمان ہو کر جادوگروں سے ڈرتے ہیں۔ ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہم نے رزق کے معاملے میں حلال و حرام کی تمیز چھوڑ دی ہے۔ سود بھی کھاتے ہیں، رشوت بھی لیتے ہیں۔ اللہ کی یاد چھوڑ دی ہے۔ ہماری پیشانیاں سجدوں سے محروم ہیں۔ اللہ کا نام لینا چھوڑ دیا ہے تو جب بندہ بالکل ہی غیر مسلح ہو جائے۔ اپنی حفاظت کے لیے کوئی ہتھیار بھی نہ ہو تو پھر جو کوئی چاہے لوٹ لے۔ اس سے شیطان کھیلتا رہے یا جادوگر پھنسائے رکھیں۔ بندے کا ایمان مضبوط ہو، پانچ وقت کا نمازی ہو، حلال کھانے والا ہو تو اس پر کوئی جادو اثر نہیں کرتا۔ کوئی جادوگر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

جادوگروں کا اندھیروں سے روشنی کا سفر:

فرعون کی طرف سے ملک کے طول و عرض میں خوب ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ سب جمع ہو جاؤ تا کہ ہم جادوگروں کی پیروی کر سکیں۔ ان کے لیے خوب جلوس نکالیں۔ ان کی کامیابی کے جشن منائیں۔ لوگوں کو جادو سے خوفزدہ کروایا گیا کہ بہت بڑا جادو کا میدان سجے گا لہٰذا اپنی حفاظت کریں۔ یہ طریقہ تھا کہ وہ ڈر جائیں اور جادوگر ان کی قوت متخیلہ کو متاثر کر سکیں: وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾ اور (فرعون کی طرف سے) لوگوں سے بھی کہا گیا کہ تم سب لوگ (بھی) جمع ہوں گے۔ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾ تا کہ اگر جادوگر جیت جائیں تو ہم ان کی پیروی کریں (جیسے پہلے کر رہے تھے) فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾ پھر جب جادوگر آ گئے تو فرعون سے کہنے لگے کہ اگر ہم جیت گئے تو کیا ہم کو کوئی بڑا انعام ملے گا؟

جادوگروں نے فرعون سے کہا کہ جیسی آپ کی عظیم الشان سلطنت ہے، جیسے عظیم آپ کے دولت کے خزانے ہیں جیسی آپ کی شان ہے ہمیں ہماری جیت پر انعام بھی اس کے شایانِ شان ملنا چاہیے۔ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾ اس نے کہا ہاں اور تب تم (ہمارے) مقرب لوگوں میں شامل ہو جاؤ گے۔

فرعون نے کہا بے شک تمہیں بہت بڑا انعام ملے گا۔ تم ایک دن کے انعام کی بات کرتے ہو میں تو تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنے دربار میں کرسیوں پر متمکن رکھوں گا۔ تم اہلِ دربار میں شامل ہو جاؤ گے، میرے مقربین بنو گے۔

ایک دن کی دولت نہیں تم پر روزانہ دولت کی بارش برسا کرے گی۔

اس واقعہ کا ذکر قرآن میں دوسری جگہ یوں آیا ہے کہ جادوگروں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو ماہر جادوگر سمجھ کر پوچھا کہ آپ اپنا کمال پہلے دکھاتے ہیں یا ہمیں اجازت ہے کہ ہم دکھائیں؟

ادب، اللہ کا نبی مان کر نہیں کیا تھا۔ ہاں وہ یہ سمجھ گئے تھے کہ یہ بہت بڑا جادوگر ہے جس نے فرعون کو مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ اس استاد جادوگر سے پوچھ لینا چاہیے۔ علمائے حق فرماتے ہیں کہ یہ ادب جو جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام کا کیا یہ بات اللہ کو پسند آ گئی اور انہیں ایمان لانے کی توفیق دے دی۔ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ﴿۴۳﴾ موسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا کہ تم کو جو کچھ ڈالنا ہو (میدان میں) ڈالو۔ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ﴿۴۴﴾ پس انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں اور کہنے لگے کہ فرعون کے اقبال سے بے شک ہم غالب رہیں گے۔ اس میدان میں پورے مصر کے جادوگر جمع تھے، سینکڑوں تھے یا ہزاروں، ہر ایک نے اپنے رسّے اور لکڑیاں میدان میں ڈال دیں۔ فرعون کی عظمت کی قسم کھائی کہ وہ ضرور جیتیں گے۔

یاد رہے! اللہ کے علاوہ کسی کی بھی قسم کھانا جائز نہیں۔ جیسے جادوگر فرعون کے اقبال کی قسم کھا رہے ہیں ایسی قسمیں کھانا ہمارے ہاں بھی رواج بن چکا ہے۔ کوئی اولاد کے سر کی قسم کھاتا ہے کوئی والدین کی جان کی قسم۔ یہ سب ناجائز اور حرام ہے۔ قسم سے مراد یہ ہے کہ جس کی قسم کھائی جا رہی ہے وہ اس موقع پر گواہ ہے۔ شاہد ہے کہ جیسی میں بات کروں ایسا ہی ہے۔ اور یہ شان صرف اللہ کی ہے کہ وہ ہر موقع پر بات کا گواہ ہے لہٰذا قسم صرف اللہ کی کھائی جائے گی۔ باقی تمام قسمیں گناہ ہیں، جرم ہے، ان کی سزا الگ ہے۔ یہ ایمان تک کو متاثر کرتی ہیں، عقیدہ مجروح ہوتا ہے۔

فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ﴿۴۵﴾ پھر موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنا عصا ڈالا تو تبھی وہ ان کے بنے بنائے دھندے کو نگلنے لگا۔

موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنا عصا پھینکا تو وہ رسیاں، لاٹھیاں جو کچھ بھی جادوگروں نے ڈالا تھا وہ لوگوں کی نگاہ میں سانپ بن گئے تھے حقیقتاً سانپ نہیں تھے وہ اژدھا ان سب کو نگل گیا۔ ان ہزاروں رسوں، لاٹھیوں کو، سانپوں کو ہڑپ کر گیا۔ جب پھر موسیٰ علیہ السلام نے اس پر ہاتھ ڈالا تو وہ وہی عصا تھا۔ آپؑ کی لاٹھی نہ موٹی ہوئی نہ پھولی۔ جادوگروں کی ڈالی ہوئی لکڑیاں رہیں نہ رسّے۔ کچھ باہر نہ رہا۔ حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جادو کا اصول یہ ہے کہ دوسرا جادوگر اگر ماہر ہو تو وہ جادو کا توڑ کر دیتا ہے اور چیزیں واپس ویسی نظر آتی ہیں تو جادوگروں نے یہ جان لیا تھا کہ اگر یہ جادو ہوتا تو پھر لوگوں کو سانپ دکھائی نہ دیتے ہماری ڈالی ہوئی رسیاں اور لکڑیاں دکھائی دیتیں

لیکن یہ کیا کہ ایک لاٹھی اتنا بڑا اژدھا بنا کہ ہزاروں لاٹھیوں رسّوں کو نگل گیا اور جب انہوں نے پکڑا تو لاٹھی اتنے کی اتنی ہی تھی۔ یہ جادو نہیں یہ اللہ کی قدرت ہے۔ وہ جادو کو بہت اچھی طرح جانتے تھے، اپنے فن کے ماہر تھے انہوں نے جان لیا کہ یہ جادو نہیں قدرت باری کی بات ہے اور یہ اللہ کے سچے نبی اور رسول علیہ السلام ہیں۔ جو کہہ رہے ہیں وہ حق ہے۔ فَاُلْقِیَ السَّحَرَۃُ سٰجِدِیْنَ﴿۴۶﴾ سو جادوگر (یہ دیکھ کر) سجدے میں گر پڑے۔ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴿۴۷﴾ کہنے لگے ہم ایمان لائے جہانوں کے پروردگار پر۔ رَبِّ مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ﴿۴۸﴾ جو موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کا پروردگار ہے۔

جادوگر جانتے تھے کہ جادو چیزوں کو معدوم نہیں کرسکتا، نگاہوں کو دھوکا دے سکتا ہے۔ حق دیکھ کر وہ سارے سجدے میں گر گئے اور کہنے لگے ہم کائنات کے پروردگار پر ایمان لاتے ہیں۔ اس پروردگار پر جو موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا ربّ ہے۔ یہ آیہء مبارکہ بھی اس اصول کی وضاحت کر رہی ہے کہ اللہ کو ماننے کے لیے رسالت پر یقین بنیاد ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اللہ کو ویسا مانا جائے جیسا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم منواتے ہیں ورنہ اپنے اپنے خیال کے مطابق تو سب مانتے ہیں۔ لوگ اپنی اپنی رائے، اپنے خیالات اپنے پیشرووں کے عقیدے کے مطابق مانتے ہیں۔ یہ ماننا اللہ کو ماننا نہیں ہے۔ اللہ کو ماننا یہ ہے کہ ویسا مانا جائے جیسا اللہ کے رسولؐ منواتے ہیں۔ اس آیہء مبارکہ میں بھی یہ تعیین کی کہ ہم موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے ربّ کو مانتے ہیں۔ جیسا نبیؑ منواتے ہیں ویسا مانتے ہیں۔

اب تو فرعون کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کو شکستِ فاش ہوگئی تو اس نے پھر نئی سیاست کھیلی۔ موجودہ زبان میں جسے سیاست کہتے ہیں وہ یہی ہے کہ ہر قیمت پر اپنا اقتدار قائم رکھنا ہے۔ وہ بھی اپنی حکومت، اقتدار قائم رکھنا چاہتا تھا تو اس نے سیاسی داؤ پیچ سے کام لیا: قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۬ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴿۴۹﴾ (فرعون نے) کہا کہ مجھ سے اجازت حاصل کرنے سے پہلے تم اس پر ایمان لے آئے بے شک یہ تمہارا بڑا (استاد) ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے تمہیں (اس کا نتیجہ) جلد ہی پتا چل جائے گا میں ضرور تمہارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوادوں گا اور ضرور تم سب کو سولی دے دوں گا۔

کہنے لگا تم سب سازش کر کے آئے ہو اور یہ تمہارا بڑا استاد ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔ فرعون خود بھی جانتا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ حق نہیں ہے۔ اس نے خود ایک دن کا بچہ لے کر موسیٰ علیہ السلام کو محل میں پالا تھا۔ جوان ہونے تک آپؑ اس کی نظروں کے سامنے تھے پھر مدین حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس رہے۔ آپؑ تو مصر میں تھے ہی نہیں تو ان جادوگروں کے استاد کیسے ہو گئے لیکن یہ اس کا سیاسی وار تھا جس سے وہ عوام کے سامنے سچا ہونا

چاہتا تھا اور عبرتناک سزا کا اعلان بھی اسی لیے کر رہا تھا کہ باقی لوگ خوفزدہ ہو جائیں۔

نبیؑ سے خلوص کا تعلق، علم لدّنی کا سبب:

اس روز ایک عجیب سماں تھا۔ جادوگروں کی تمام امیدیں فرعون سے وابستہ تھیں۔ اس کے اقبال کی قسمیں کھا رہے تھے اس سے انعام کے طلب گار تھے۔ اللہ کے نبی موسیٰ علیہ السلام کے خلاف سینہ سپر تھے لیکن ادب کر رہے تھے کہ یہ کوئی بڑا ماہر جادوگر ہے اس سے پوچھ لیتے ہیں۔ وہ غیر شعوری ادب تھا جو اللہ کو پسند آیا اس نے ایمان کی توفیق دے دی۔ دن وہی تھا، سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا کہ جادوگروں کو ایمان نصیب ہو گیا۔ فرعون نے کہا ان کے ایک طرف کے ہاتھ کاٹ دو دوسری طرف کے پاؤں کاٹ دو اور انہیں کھجوروں کے ساتھ لٹکا دو۔ وہ دن کے آغاز میں فرعون سے انعام اور دنیا کے لالچ میں تھے لیکن دن کے اختتام سے پہلے پہلے انہیں نورِ ایمان نصیب ہو گیا۔ جب نورِ ایمان نصیب ہوتا ہے، نبیؑ کے ساتھ جو قلبی تعلق بنتا ہے تو نبیؑ کے سینے میں جو علوم نبوت ہوتے ہیں وہ ان کے شاگردوں، ماننے والوں، متبعین کے سینوں میں آ جاتے ہیں۔ فرعون کے دربار میں ان جادوگروں کو موسیٰ علیہ السلام سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا کہ آخرت کی، حساب کتاب کی، انعاماتِ الٰہی کی کوئی بات معلوم کی ہو لیکن انہوں نے ساری منظر کشی کر دی کہ آخرت میں اللہ کے روبرو حاضر ہوں گے حساب ہوگا، نیکی کا اجر ملے گا، برائی کا عذاب ہوگا۔ اس وقت ہم سرخرو ہوں گے تو پھر تیرے انعام کی کیا حیثیت ہے۔ یہ سب انہوں نے کہاں سے سیکھا؟ جب نبیؑ کے ساتھ خلوص کا، دل کا تعلق ہو جائے، دل کی گہرائی سے ہو جائے تو نبیؑ کے سینے سے علوم ماننے والوں کے سینے میں آ جاتے ہیں۔ اسی کو علم لدّنی کہتے ہیں۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہ کرامؓ اس کی بڑی عظیم مثال ہیں۔ صحابہ کرامؓ میں سے گنتی کے لوگ پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ کوئی کتابیں پڑھی تھیں نہ کسی مدرسہ کا منہ دیکھا تھا لیکن بڑے ماہر مفتی، محدث اور مفسّر تھے۔ دنیا میں آج تک بڑے بڑے عظیم عالم و فاضل پیدا ہوئے ہیں جن کو اللہ نے وسیع علوم عطا فرمائے لیکن ان کے سامنے جب کسی صحابیؓ کی بات آتی ہے تو سب کی گردنیں جھک جاتی ہیں کہ جو صحابیؓ نے کہا وہ ہی ٹھیک ہے۔ یہ علوم صحابہؓ کے پاس کہاں سے آ گئے؟ یہ وہ نور تھا جو سینۂ اطہر صلی اللہ علیہ وسلّم سے صحابہؓ کے سینوں میں منتقل ہوا۔

یہاں یہی علوم موسیٰ علیہ السلام کے سینۂ مبارک سے ان کے دلوں میں منتقل ہو گئے اور وہ فرعون سے کہنے لگے: قَالُوْا لَا ضَیْرَ ۫ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝۵۰ انہوں نے کہا کوئی حرج نہیں بے شک ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

ان کا معاملہ تو سدھر گیا۔ وہ تو موسیٰ علیہ السلام کے صحابی بن گئے۔ کتنے فخر سے کہہ رہے ہیں کہ تو ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹ دے، سولی لگا دے۔ اس سے ہمارا بگڑے کا کچھ نہیں، سنورے گا۔ جان اللہ کی راہ میں جائے گی تو اس جان کا اس سے بہتر مصرف کیا ہے۔ ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہم سیدھے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پہنچ جائیں گے۔ ہمارے کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں ہوں گے اس کی راہ میں جھکی ہوئی گردنیں ہوں گی۔ وہ ہم پر راضی ہوگا۔ تو ہماری طرح خود محتاج ہے۔ تجھ سے کیا اُمیدیں۔

یہ ہے مسلمانی اور یہ ہے ایمان۔ مسلمانی یہ ہے کہ ہم بھی سوچیں کہ ہماری جان اللہ کی راہ میں چلی جائے۔ ہمارا مال اللہ کی راہ میں خرچ ہو۔ ہم یہ سوچیں کہ میں نے قبر میں جانا ہے۔ وہاں میں کیا جواب دوں گا۔ جس طرح ہم دنیا کی زندگی کے لیے محنت کر کے وسائل جمع کرتے ہیں آخرت کو حاصل کرنے کے لیے اس سے زیادہ محنت کی ضرورت ہے اور زیادہ خلوص سے کرنے کی ضرورت ہے۔

وہ کہنے لگے وہ وقت گیا ہم تجھ سے دولت وانعام مانگتے تھے۔ وہ باتیں گئیں۔ وہ زمانہ کفر کی باتیں تھیں۔ اب ہم مومن ہیں، اللہ کے بندے ہیں، اللہ کے نبیؑ کے صحابی ہیں۔ اب ہمارا مقصد کچھ اور ہے۔ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَآ اَنْ کُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۱﴾ یقیناً ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہماری خطائیں معاف فرمائے گا کہ ہم (اس موقع پر) سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔

ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہماری خطائیں معاف فرما دے۔ ہم اس کے نبیؑ کے مقابلے پر نکل آئے، ہم نے کتنا ظلم کیا۔ ساری عمر جادو کرتے رہے ہم غیر اللہ کی پوجا کرتے رہے۔ ہم نے کتنا بُرا کیا۔ اب ہماری آرزو یہ ہے کہ ہمارا ربّ ہماری خطائیں معاف کر دے۔ ہم سے راضی ہو جائے۔ اَنْ کُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۱﴾ یہ اعزاز تُو ہم سے نہیں چھین سکتا کہ ہم تیرے ملک میں پہلے پہلے ایمان لانے والے لوگ ہیں۔ اللہ نے ہمیں یہ اعزاز بخشا ہے کہ ہم پہلے مسلمان ہیں۔

جو لوگ صبح کے وقت کفر کے اندھیروں میں تھے۔ نبی علیہ السلام کی صحبت پا کر شام کو ایسے مخلص مومن ہوئے کہ ان کی آرزوئیں ہی بدل گئیں۔ پہلے دنیا کی طلب لے کر آئے تھے اب کہہ رہے ہیں یا اللہ ہماری خطا معاف کر دے۔ ہم نے دنیا سے کیا لینا ہم تیری رضا کے طالب ہیں۔ فرعون جیسے متکبر ظالم کے سامنے اسے کہہ رہے ہیں کہ تو ہمیں قتل کر دے گا تو کیا ہوگا؟ ہم شہید ہو کر آج ہی اللہ کے حضور پہنچ جائیں گے۔ اس سے بڑی کیا بات ہوگی کہ ہمیں عظمتِ شہادت نصیب ہو جائے۔ ہماری گزشتہ زندگی گناہوں سے آلودہ ہے۔ اللہ ہمارے گناہ معاف کر کے ہمیں شہادت سے سرفراز فرما دے ہم اس کی بارگاہ میں سرخرو ہو جائیں گے۔

سورۃ الشعرآء رکوع 4 آیات 52 تا 68

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۲﴾ فَاَرْسَلَ
فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاِنَّهُمْ
لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ
وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۷﴾ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ ۫ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ
مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۶۲﴾ فَاَوْحَيْنَآ
اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۫ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ
كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿۶۳﴾ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ
مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۶۵﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۫ وَمَا كَانَ
اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۶۷﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۶۸﴾

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) پر وحی فرمائی کہ ہمارے بندوں کو لے کر رات کو نکلیں (فرعونیوں کی طرف سے) ﴿۵۲﴾ یقیناً آپ لوگوں کا تعاقب کیا جائے گا۔ تو فرعون نے شہروں میں ہرکارے بھیج دیے ﴿۵۳﴾ کہ یہ لوگ تھوڑی سی جماعت ہیں ﴿۵۴﴾ اور یہ لوگ ہمیں غصہ دلا رہے ہیں ﴿۵۵﴾ اور یقیناً ہم سب ایک مسلح جماعت (باقاعدہ فوج) ہیں ﴿۵۶﴾ تو ہم نے ان کو باغوں اور چشموں سے نکال دیا ﴿۵۷﴾ اور خزانوں اور نفیس مکانات سے ﴿۵۸﴾ (ہم نے ان کے ساتھ)

یوں کیا اور اس چیز کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا۔ تو انہوں نے سورج نکلتے وقت (صبح صبح) ان کا تعاقب کیا ﴿۵۹﴾ پھر جب دونوں جماعتیں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں تو موسیٰ (علیہ السلام) کے ہمراہی (گھبرا کر) کہنے لگے ہم تو پکڑے گئے ﴿۶۰﴾ (موسیٰ علیہ السلام نے) فرمایا ہرگز نہیں ﴿۶۱﴾ بے شک میرا پروردگار میرے ساتھ ہے وہ مجھے ابھی (سمندر سے نکلنے کا) راستہ بتا دے گا ﴿۶۲﴾ پھر ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) پر وحی فرمائی کہ اپنے عصا کو سمندر پر ماریں تو وہ (سمندر) پھٹ گیا سو ہر ایک ٹکڑا یوں لگتا تھا گویا ایک بڑا پہاڑ (ہے) ﴿۶۳﴾ اور دوسروں کو ہم نے وہاں قریب کر دیا ﴿۶۴﴾ اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے ساتھ والوں کو سب کو بچا لیا ﴿۶۵﴾ پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا ﴿۶۶﴾ بے شک اس (واقعہ) میں نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں تھے ﴿۶۷﴾ اور بے شک آپ کا پروردگار بڑا زبردست (اور) مہربان ہے ﴿۶۸﴾

تفسیر و معارف

دنیا عالمِ اسباب ہے اور اسباب کی بڑی اہمیت ہے لیکن جب انسان معرفتِ باری سے ناآشنا ہوتا ہے تو اپنی تدبیریں لڑاتا ہے اور عظمتِ باری کا احساس ہو تو پھر اس کی تدبیر اللہ کے حکم کے تابع ہوتی ہے اور وہ اسے سبب سمجھ کر اختیار کرتا ہے۔ اسے نتائج کی امید اسباب سے نہیں اللہ کریم سے ہوتی ہے۔ یعنی اسباب بھی دائرہ شریعت کے اندر ہونا ضروری ہیں۔ اسباب فی نفسہٖ کچھ نہیں ہوتے۔ جو بھی کرنا ہوتا ہے وہ اللہ کریم خود کرتے ہیں، اسباب کے نتائج بھی اللہ کریم خود مرتب کرتے ہیں اس لیے کہ ساری کائنات ربّ العالمین کی ہے اور ہر کام اس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔

اللہ کریم نے چاہا کہ بنی اسرائیل فرعون کے ظلم سے نجات پائیں۔ فرمایا: وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۲﴾ اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) پر وحی فرمائی کہ ہمارے بندوں کو لے کر رات کو نکلیں۔ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآىِٕنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ (فرعونیوں کی طرف سے) یقیناً آپ لوگوں کا تعاقب کیا جائے گا تو فرعون نے شہروں میں ہرکارے بھیج دیے۔ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾ کہ یہ لوگ تھوڑی سی

جماعت ہیں اور یہ لوگ ہمیں غصہ دلا رہے ہیں وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۶﴾ اور یقیناً ہم سب ایک مسلح جماعت (باقاعدہ فوج) ہیں۔

جادوگروں کے مقابلے اور دیگر بے شمار معجزات دیکھنے کے بعد بھی فرعون اور اس کی قوم نے ایمان قبول نہ کیا تو اللہ کریم نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ آپ بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات نکل جایئے اور یہ بھی بتا دیا کہ فرعونی آپ کے پیچھے آئیں گے۔ بنی اسرائیل راتوں رات نکل پڑے اور اپنے ساتھ قبطیوں کا مال و دولت، زر و جواہر بھی ساتھ لے گئے۔ صبح ہوئی تو پتا چلا کہ اسرائیلوں کا کوئی ایک فرد بھی شہر میں نہیں ہے۔ تقریباً سوا چھ لاکھ لوگ تھے سارے ہی رات کو نکل گئے۔ فرعون کو خبر ہوئی تو اس نے شہروں میں ہرکارے دوڑا دیے۔ اس عہد میں مستقل فوج بہت تھوڑی ہوا کرتی تھی۔ جب ضرورت پڑتی شہروں میں اعلان کر دیتے تھے۔ مسلح جوان جمع ہو جاتے، لشکر بن جاتا تھا۔ فرعون نے بھی اعلان کروا دیا اور کہا اسرائیلی تو کمزور لوگ ہیں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ انہوں نے بہت گستاخی کی ہے کہ بلا اجازت چلے گئے اور ہمارا مال و دولت بھی لے گئے۔ انہوں نے ہمارے غضب کو آواز دی ہے۔ ہم تو باقاعدہ مسلح جماعت ہیں۔ انہوں نے کیا سمجھ کر یہ جرأت کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ اس طرح ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ فرعون بہت غصے ہوا۔ اپنے امراء، وزراء، نوجوانانِ قوم کو لے کر پورا لاؤ لشکر لے کر اسرائیلوں کے تعاقب میں نکلا کہ سب کو قتل کر دیں گے، کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔ یہ تجویز ان کی تھی لیکن اللہ کریم کی تجویز اور تھی۔ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۷﴾ تو ہم نے ان کو باغوں اور چشموں سے نکال دیا۔ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۸﴾ اور خزانوں اور نفیس مکانات سے۔ كَذٰلِكَ ۫ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾ (ہم نے ان کے ساتھ) یوں کیا اور اس چیز کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا۔

وہ تو اپنے نشے میں جا رہے تھے کہ اسرائیلیوں کو قتل کر کے پلٹیں گے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اب پلٹنا ان کے مقدر میں نہیں۔ وہ کبھی واپس نہ آئیں گے۔ محلات، زر و جواہر، خوبصورت آبادیاں چشمے اور باغات سب کچھ چھوڑ کر نکلے۔ ایسا ہی ہوتا ہے اللہ کریم کی نافرمانی کا انجام۔ ایسے لوگوں کا انجام بہت خطرناک ہوتا ہے۔ خصوصاً جب اللہ کا نبی تشریف لے آئے تو حجت تمام ہو جاتی ہے اور نبیؑ کی مخالفت لے ڈوبتی ہے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مستقل نافرمانی پر عذاب کی ایک صورت:

اطاعت اور نافرمانی دو الفاظ ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ بندہ اطاعت کرتا ہے یا نافرمانی کرتا ہے درمیان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر ہم غور کریں تو سمجھ آتی ہے کہ مسلمان کہلانے والے کیا کچھ کر رہے ہیں۔ ہر وہ گناہ آج

ہمارے معاشرے میں عام ہے جن گناہوں پر گزشتہ اقوام پر اجتماعی عذاب آئے تھے۔ یہ تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی برکت ہے کہ کوئی اجتماعی عذاب دنیا پر نہیں آتا۔ اجتماعی طور پر غرق ہونے کی نوبت نہیں آتی لیکن ایک عذاب ضرور آتا ہے۔ جتنا کوئی نافرمانی کرتا ہے اتنی اس سے توفیقِ اطاعت سلب ہوتی جاتی ہے۔ وہ مزید گناہوں میں غرق ہوتا چلا جاتا ہے تا آنکہ موت آجاتی ہے۔ جب آنکھ بند ہوتی ہے تو پھر آنکھ کھل جاتی ہے۔ تب سمجھ آتی ہے لیکن تب عمل کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

یہی ہوا فرعونیوں کے ساتھ۔ وہ نبیؑ کے مقابلے پر آگئے اور اللہ کی پکڑ میں آگئے، اپنے زعم میں لاؤلشکر لے کر نکلے لیکن دراصل وہ اپنی موت کو، اپنے انجام کو پہنچنے کے لیے نکلے۔ جس مال و دولت پر اتراتے تھے اس کا وارث اللہ نے بنی اسرائیل کو بنا دیا۔ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾ تو انہوں نے سورج نکلتے وقت (صبح صبح) ان کا تعاقب کیا۔ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾ جب دونوں جماعتیں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں تو موسیٰ (علیہ السلام) کے ہمراہی (گھبرا کر) کہنے لگے ہم تو پکڑے گئے۔

رات کو اسرائیلی نکلے تھے۔ صبح صبح فرعونی نکل کھڑے ہوئے۔ اسرائیلیوں کے پاس اسباب کم تھے، زیادہ لوگ پیدل تھے۔ فرعونیوں کا لشکر اسباب و وسائل سے پُر اور تازہ دم تھا۔ دن نکلتے نکلتے انہوں نے اسرائیلیوں کو جالیا۔ وہ بحرِ قلزم پر پہنچ گئے تھے۔ آگے سمندر تھا پیچھے فرعونیوں کا لشکر۔ فرعون خود قیادت کر رہا تھا۔ جب اسرائیلیوں نے فرعونی لشکر کو دیکھا تو گھبرا گئے اور شور مچا دیا کہ ہم پکڑے گئے اور اب مارے جائیں گے۔ اللہ کریم بے حد غفورٌ رحیم ہیں۔ جب بنی اسرائیل کو ملک چھوڑ دینے کا حکم دیا تو اسرائیلی موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکے تھے تو یہاں اللہ کریم نے انہیں اپنا بندہ فرمایا۔ جب موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میرے بندوں کو یہاں سے نکالے جایئے یعنی جتنی دوریاں ہیں یہ بندے کی طرف سے ہیں۔ اللہ کریم کی رحمت بہت وسیع ہے۔ اسرائیلی ساری عمر فرعونیوں کی خدمت کرتے رہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی بعثت تک انہیں دین کی بھی کوئی خبر نہیں تھی لیکن جیسے ہی ان کا تعلق موسیٰ علیہ السلام سے قائم ہوا اللہ کریم نے انہیں اپنے بندے قرار دیا۔ یہاں بھی انہیں 'اصحٰب موسیٰ' فرمایا۔ انہیں اپنے اولوالعزم رسول کے ساتھی قرار دیا۔

جب اسرائیلی گھبرا گئے تو: قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۶۲﴾ (موسیٰ علیہ السلام نے) فرمایا ہرگز نہیں، بے شک میرا پروردگار میرے ساتھ ہے وہ مجھے ابھی (سمندر سے نکلنے کا) راستہ بتا دے گا۔

اللہ کے نبیوں کو اللہ پر ایسا پختہ یقین ہوتا ہے کہ اس میں تردد کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ نے ہمیں نکلنے کا حکم دیا ہے تو وہ راستے بھی خود ہی پیدا کرے گا۔ ہم اس کی اطاعت میں نکلے ہیں تو حفاظت بھی

وہی فرمائے گا۔ آپؑ نے فرمایا، میرا رب میرے ساتھ ہے وہ راستہ نکال دے گا۔ یاد رہے! انبیاؑ کو اللہ کی معیت ہمہ وقت نصیب ہوتی ہے باقی کسی کو نصیب ہوگی تو نبیؑ کا دامن تھامنے سے نصیب ہوگی۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس معیت کا ذکر فرمایا کہ میرا ربّ میرے ساتھ ہے، ربوبیت اللہ کی صفت ہے یعنی اللہ کی طرف سے معیت صفاتی ہے۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿۶۳﴾ پھر ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) پر وحی فرمائی کہ اپنے عصا کو سمندر پر ماریں تو وہ (سمندر) پھٹ گیا سو ہر ایک ٹکڑا یوں لگتا تھا گویا ایک بڑا پہاڑ (ہے)۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب عصا پانی پر مارا تو سمندر پھٹ گیا، پانی ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، ہر ٹکڑا ایک عظیم پہاڑ کی طرح کھڑا تھا۔ اللہ نے ان کے بارہ قبائل کے لیے بارہ راستے پیدا کر دیے۔ سمندر پھٹ گیا اور اس میں بارہ رستے بن گئے۔ اللہ نے ایسی ہوا چلائی کہ وہ خشک بھی ہو گئے اور پانی پہاڑ بن گیا۔ کناروں تک پانی کے پہاڑ کھڑے تھے۔

انسانی عقل بھی بڑی عیار ہے۔ وہ لوگ جو معجزاتِ انبیاؑ کا انکار کرتے ہیں۔ انہوں نے اس آیہء مبارکہ کے بارے تشریح کی ہے کہ سمندر میں جوار بھاٹا ہوتا ہے۔ پانی کبھی بڑھتا ہے کبھی گھٹتا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام وہاں سے گزرے تو پانی کم ہو رہا تھا اور فرعونی جب آئے تو پانی بڑھ رہا تھا اس لیے وہ اس میں غرق ہو گئے۔

قرآن کے الفاظ پر غور کریں تو واضح حکم ملتا ہے کہ اللہ کریم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنا عصا پانی پر ماریں۔ پانی پھٹ گیا اور پہاڑ بن کر کھڑا ہو گیا۔ سمندر کی گہرائی میں پانی الگ الگ پہاڑ بن کر دیواروں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۴﴾ اور دوسروں کو ہم نے وہاں قریب کر دیا۔ یعنی فرعونیوں کو بھی ہم نے آنے دیا۔ موسیٰ علیہ السلام اور آپؑ کے ساتھی پانی میں داخل ہو گئے۔ پیچھے سے فرعونی بھی قریب تھے اللہ کریم نے انہیں روکا نہیں آنے دیا کہ اسرائیلی پار لگ کر نکل رہے تھے اور فرعونی پانی میں داخل ہو رہے تھے۔ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۶۵﴾ اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے ساتھ والوں کو سب کو بچا لیا۔ فرمایا ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور آپؑ کے ساتھیوں کو بچا لیا۔ سب سمندر سے پار ہو گئے۔ جب یہ سمندر سے پار ہو رہے تھے تو فرعونی عین سمندر کے درمیان میں پہنچ چکے تھے۔ جب تمام اسرائیلی پار ہو گئے تو اللہ کریم نے پانی کو حکم دیا۔ سمندر کا پانی جو پہاڑوں کی طرح کھڑا تھا جب ملا تو جو اندر آ گئے سب ملیا میٹ ہو گئے ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۶﴾ پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا۔

برزخ کا عذاب:

ایک عظیم سلطنت کا خود مختار فرماں روا، خود کو خدا کہلوانے والا، اپنے آپ کو لوگوں سے سجدے کروانے والا، خزانوں، دولت اور لاؤ لشکر کا مالک، ایک لمحے میں، آنِ واحد میں فنا کے گھاٹ اتر گیا۔ صرف دنیا کی تباہی سے دوچار نہیں ہوا بلکہ اخروی عذاب میں بھی گرفتار ہوا۔ قرآن حکیم میں دوسری جگہ ارشاد ہے اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا۔۔۔(نوح:25) غرق کیے گئے پھر دوزخ میں داخل کیے گئے۔ ڈوبے تو پانی میں تھے برزخ میں آگ میں پہنچ گئے۔ دوسری جگہ ارشاد باری ہے: اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا۔۔۔(المومن:46) آگ کہ (برزخ میں) صبح اور شام اس کے سامنے لائے جاتے ہیں۔ صبح وشام ان پر تازہ آگ بھیجی جاتی ہے۔ اس عہد کے کچھ لوگوں میں برزخ کے عذاب وثواب کے انکار کی عادت ہوگئی ہے حالانکہ برزخ کا عذاب وثواب ضروریاتِ دین میں سے ہے۔ ضروریاتِ دین کا انکار عقائد کو مجروح کرتا ہے۔ عقیدے پر زد پڑے تو بندہ دین سے خارج ہو جاتا ہے۔ ضروریاتِ دین پر ایمان سے حفاظتِ عقائد ہوتی ہے۔ فرعون کی لاش بعد میں برآمد ہوئی۔ تب سے قاہرہ کے عجائب گھر میں پڑی ہے۔ ظاہری آنکھوں سے دیکھیں تو کچھ پتا نہیں چلتا لیکن اللہ فرماتے ہیں کہ نہ صرف فرعون پر بلکہ اس کے ساتھ جتنے لوگ غرق ہوئے تھے سب کو صبح وشام آگ کا عذاب دیا جاتا ہے۔ اس لیے انکار کی گنجائش نہیں۔ برزخ تو ایک پردہ ہے جب اس کے پار ہوں گے تو سب کچھ نظر آجائے گا۔ دنیا میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لا کر یقین آخرت کو پانا ہی اصل کام ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اعتبار ہی ایمان ہے ورنہ ظاہری آنکھوں سے برزخ نظر نہیں آتی۔ ارشادِ باری ہے: لَقَدْ كُنْتَ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ (قٓ:22)

ہم نے تجھ پر سے تیرا پردہ (غفلت کا) ہٹا دیا۔ سو آج تیری نگاہ بہت تیز ہے۔ آج ہم نے تمہاری آنکھوں کے سامنے سے سارے پردے اٹھا دیے ہیں، تمہاری نگاہ فولادی ہوگئی ہے۔

جو دیکھنا چاہتے ہو دیکھو۔ آخرت میں سب کچھ نظر آتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہمیں نظر بھی آئے تو جو چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں ہم تو ان کی پوری حقیقت بھی نہیں جان سکتے۔ ظاہری نگاہ کبھی دھوکا بھی کھا جاتی ہے۔ ذرا فاصلے پر پڑی چیز کو دیکھ کر اسے مغالطہ لگ جاتا ہے۔ پاس جائیں تو وہ چیز کچھ اور ہوتی ہے۔ ہمارے دیکھنے کا یہ حال اس عالم میں ایسا ہے لہٰذا سارا دارومدار اللہ کے نبی اللہ کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اعتبار پر ہے۔

لوگ بڑے آرام سے کہہ دیتے ہیں کہ مولوی کہتے ہیں برزخ میں عذاب وثواب ہوگا۔ بھلا کس نے دیکھا ہے، کون دیکھ کر آیا ہے؟ ہاں! اللہ کا رسول، آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلّم دیکھ کر آئے ہیں۔ شبِ معراج آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے جنت کو ملاحظہ فرمایا اور دوزخ کا بھی مشاہدہ فرمایا۔ معراج کی حدیثوں میں ایک ایک گناہ کی سزا کا انداز آپ ﷺ نے ارشاد فرما دیا۔ اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم معراج پر تشریف نہ لے جاتے، دیکھ کر نہ آتے تو بھی اللہ کریم نے قرآن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو جو بتا دیا وہ دیکھنے سے زیادہ یقینی ہے تو لوگ ایسا کیوں کہتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے معجزات کا انکار کیوں کرتے ہیں؟ بدنصیبی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے تعلق میں کمزوری ہے۔ جب روشنی سے تعلق کمزور ہوتا ہے تو بندہ اندھیرے کی طرف جاتا ہے۔ یہ بدبختی ہے ان لوگوں کو جو یہ شوشے چھوڑتے رہتے ہیں، خود بھی گمراہ ہوتے ہیں دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

فرمایا: اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (الشعراء:67) بے شک اس (واقعہ) میں نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں تھے۔

جب فرعون اور اس کی قوم نے نبیؑ کی مخالفت کی تو اللہ نے انہیں ان کے خوبصورت محلوں سے پُرآسائش بستیوں سے، چشموں اور باغات والے شہروں سے نکالا اور آنِ واحد میں غرقِ آب کر دیا۔ بے شک اس واقعہ میں عظمتِ الٰہی کی، صداقتِ پیغمبرؑ کی بہت بڑی نشانی ہے اور اس بات کی بھی واضح دلیل ہے کہ بچے گا وہی جو دامانِ رسالت تھامے گا۔ یہ ان کی محرومی تھی کہ نبیؑ کے دامن سے وابستہ نہ ہوئے۔ یہ گروہ ہی ایسا تھا جن کی اکثریت ایمان لانے والی نہیں تھی۔ اللہ کے نبیؑ سے وابستہ نہ ہوئے اس لیے محروم رہے۔ نبی علیہ السلام کے دامن سے محرومی تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔

رحمتِ رب العالمین بطفیل رحمۃ للعالمین:

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۶۸﴾ اور بے شک آپ کا پروردگار بڑا زبردست (اور) بڑا مہربان ہے۔

اگر رحمتِ رب العالمین چاہیے تو پھر دامنِ رحمۃ للعالمین تھامنا ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا پروردگار، پروردگارِ عالم ہے۔ اس کی رحمت سے رشتہ تب جڑے گا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا دامن ہاتھ میں ہوگا۔ اس آیہء مبارکہ میں اللہ کریم نے نہایت لطیف بات ارشاد فرمائی: وَاِنَّ رَبَّكَ ۔۔۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا پروردگار۔ اللہ کریم تو سارے عالم کے ربّ ہیں پھر خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے فرمایا، آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے

ربّ۔اس میں یہی نکتہ پنہاں ہے کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا دامن تھامے گا وہ اللہ کی رحمت پائے گا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے دامن سے نکلے گا وہ سن لے اللہ غالب ہے وہ انتقام لے گا۔

فرمایا آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کا پروردگار غالب ہے، رحم کرنے والا ہے۔ یہ اس کی رحمت ہے کہ ہر ایک کو زندگی عطا فرماتا ہے، صحت دیتا ہے، روزی عطا کرتا ہے۔ سورج کی روشنی اور ہوا کی روش کوئی تمیز نہیں کرتی، سب مخلوقات کو مستفید کرتی ہے۔ شجر و حجر سے نباتات و حیوانات تک ہر کوئی فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس میں مومن و کافر کا کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا۔ یہ اس کی رحمتِ عامہ ہے لیکن وہ غالب ہے جب اس کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت کی جائے گی تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ چیونٹی کی طرح مسلی جائے گی یہ بہت بڑی دلیل ہے۔ سمجھنے والوں کو سمجھنا چاہیے۔ مولانا رومی نے کہا تھا:

نفسِ ما کم تر از فرعون نیست

لیک او را عون، ما را عون نیست

ترجمہ: ہمارا نفس بھی فرعون سے کم نہیں ہے لیکن اُس کے پاس طاقت تھی ہمارے پاس طاقت نہیں ہے۔

فرماتے ہیں نفس تو ہمارا بھی فرعون سے کم نہیں ہے سرکشی میں۔ اس کے پاس طاقت تھی اس نے اس کا مظاہرہ کیا اور ہمارے پاس طاقت نہیں ہے۔ ہوتا یہی ہے کہ جس کے پاس طاقت آتی ہے سوائے اس کے کہ جس کو اللہ بچا لے ورنہ وہ چھوٹا موٹا فرعون بن جاتا ہے۔ جتنے کسی کے پاس وسائل ہوں۔ دولت آ جائے یا بڑا عہدہ، اتنی ہی اس میں اکڑ آ جاتی ہے۔ فرماتے ہیں اگر اللہ عظمت دے، دولت و عہدہ دے، حکومت و اختیار دے تو اللہ کا مزید شکر کرنا چاہیے، فرعون کی طرح اکڑنا نہیں چاہیے۔ ہر عہدہ، ہر اختیار اپنے حقوق رکھتا ہے تو فرائض بھی رکھتا ہے۔ حقوق کا ایثار کرنا چاہے تو بندہ کر سکتا ہے لیکن فرائض سے جان نہیں چھڑا سکتا۔ وہ ہر صورت ادا کرنا ہیں۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دامن مضبوطی سے، خلوص سے، دل کی گہرائی سے تھام لیا جائے۔

سورۃ الشعرآء رکوع 5 آیات 69 تا 104

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿٧٠﴾
قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿٧١﴾ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ
تَدْعُوْنَ ﴿٧٢﴾ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿٧٣﴾ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ
يَفْعَلُوْنَ ﴿٧٤﴾ قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿٧٥﴾ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ
الْاَقْدَمُوْنَ ﴿٧٦﴾ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٧﴾ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ
فَهُوَ يَهْدِيْنِ ﴿٧٨﴾ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ﴿٧٩﴾ وَاِذَا مَرِضْتُ
فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿٨٠﴾ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ﴿٨١﴾ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ
خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿٨٢﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٣﴾
وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿٨٤﴾ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ
النَّعِيْمِ ﴿٨٥﴾ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿٨٦﴾ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ
يُبْعَثُوْنَ ﴿٨٧﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿٨٨﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ
سَلِيْمٍ ﴿٨٩﴾ وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٩٠﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿٩١﴾
وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿٩٢﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ
اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٩٣﴾ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿٩٤﴾ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ
اَجْمَعُوْنَ ﴿٩٥﴾ قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٩٦﴾ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ
مُّبِيْنٍ ﴿٩٧﴾ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٨﴾ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٩٩﴾ فَمَا

لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِنَّ
رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾

اوران کے سامنے ابراہیم (علیہ السلام) کا قصہ بیان کیجیے ﴿۶۹﴾ جب انہوں نے اپنے باپ اوراپنی قوم سے فرمایا کہ تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟ ﴿۷۰﴾ کہنے لگے ہم بتوں کی عبادت کرتے ہیں پھران کی عبادت پر قائم ہیں ﴿۷۱﴾ انہوں نے فرمایا کہ جب تم ان کو پکارتے ہوتو کیا وہ تمہاری پکار سنتے ہیں؟ ﴿۷۲﴾ یا تم کو کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ ﴿۷۳﴾ انہوں نے کہا بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا کرتے دیکھا ہے ﴿۷۴﴾ انہوں نے فرمایا بھلا تم نے ان کو (غور سے) دیکھا جن کی تم عبادت کرتے ہو؟ ﴿۷۵﴾ تم بھی اور تمہارے پہلے بڑے بھی ﴿۷۶﴾ سو یہ تو میرے دشمن ہیں مگر (اللہ) جو پروردگار ہے جہانوں کا (میرا دوست ہے) ﴿۷۷﴾ جس نے مجھے پیدا فرمایا سو وہی مجھے راستہ دکھاتا ہے ﴿۷۸﴾ اور وہی مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے ﴿۷۹﴾ اور جب مَیں بیمار پڑتا ہوں تو وہ ہی مجھے شفا بخشتا ہے ﴿۸۰﴾ اور وہ مجھے موت دے گا پھر مجھ کو زندہ کرے گا ﴿۸۱﴾ اور وہ جس سے مَیں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میری خطاؤں کو معاف فرمائے گا ﴿۸۲﴾ اے میرے پروردگار! مجھے حکمت (ودانش) عطا فرمایئے اور مجھے (اعلیٰ درجہ کے) نیک لوگوں کے ساتھ شامل فرمایئے ﴿۸۳﴾ اور میرا ذکر سچا آئندہ آنے والوں میں جاری رکھیے ﴿۸۴﴾ اور مجھے نعمت کی بہشت کے وارثوں میں سے کیجیے ﴿۸۵﴾ اور میرے باپ کو بخش دیجیے کہ بے شک وہ گمراہوں میں سے ہے ﴿۸۶﴾ اور جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے مجھے رسوا نہ کیجیو ﴿۸۷﴾ جس دن نہ مال ہی کوئی فائدہ دے گا اور نہ بیٹے ﴿۸۸﴾ ہاں مگر جو شخص اللہ کے پاس (کفر وشرک سے) پاک دل لے کر آیا (اس کی نجات ہوگی) ﴿۸۹﴾ اور پرہیزگاروں کے لیے جنت قریب

کردی جائے گی ﴿۹۰﴾ اور گمراہوں کے لیے دوزخ (سامنے) ظاہر کردی جائے گی ﴿۹۱﴾ اوران سے کہا جائے گا وہ کہاں ہیں جن کی تم عبادت کرتے تھے ﴿۹۲﴾ اللہ کے علاوہ کیا وہ تم کو مدد دے سکتے ہیں یا خود اپنا ہی بچاؤ کر سکتے ہیں؟ ﴿۹۳﴾ تو وہ اور سب گمراہ (بت اور بت پرست) اوندھے منہ اس (دوزخ) میں ڈال دیے جائیں گے ﴿۹۴﴾ اور سب کے سب ابلیس کے لشکر بھی ﴿۹۵﴾ وہ وہاں آپس میں جھگڑیں گے اور کہیں گے ﴿۹۶﴾ کہ اللہ کی قسم ہم واضح گمراہی میں تھے ﴿۹۷﴾ جب کہ تم کو (اے بتو! عبادت میں) پروردگارِ عالم کے برابر کرتے تھے ﴿۹۸﴾ اور ہم کو ان گناہگاروں نے ہی گمراہ کیا ﴿۹۹﴾ سو (اب) نہ کوئی ہمارا سفارشی ہے ﴿۱۰۰﴾ اور نہ مخلص دوست ﴿۱۰۱﴾ سو کاش! ہمیں (دنیا میں) پھر جانا ہوتا تو ہم ایمان لانے والوں میں ہوتے ﴿۱۰۲﴾ بے شک اس (قصہ) میں بڑی دلیل ہے اور (اس کے باوجود) ان کے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے ﴿۱۰۳﴾ اور بے شک آپ کا پروردگار بڑا زبردست (اور) مہربان ہے ﴿۱۰۴﴾

تفسیر ومعارف

قصّہ ابراہیم علیہ السلام:

فرمایا: اوران کے سامنے ابراہیم (علیہ السلام) کا قصہ بیان کیجیے۔ مشرکینِ عرب کو یہ دعویٰ تھا کہ وہ دینِ ابراہیمی پر ہیں اس لیے وہ نجات یافتہ ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں یہی دینِ ابراہیمی ہے۔ اللہ کریم نے فرمایا، انہیں ابراہیم (علیہ السلام) کا قصہ سنا دیجیے۔ ان پر ثابت ہوجائے کہ یہ نام تو ابراہیم (علیہ السلام) کا لیتے ہیں، دعویٰ انؑ کی پیروی کا کرتے ہیں اور کام سارے مشرکانہ کرتے ہیں۔ بتوں کو پوجتے ہیں، غیر اللہ سے امیدیں وابستہ رکھتے ہیں۔ انہیں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا واقعہ پڑھ کر سنا دیجیے جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) پر نازل ہوا ہے۔ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۰﴾ جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے فرمایا کہ تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟

عربی میں لفظ مَا بے جان چیزوں کے لیے آتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ابتدا ہی اپنے گھر سے کی، اپنے والد اور قوم سے فرمایا، تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟ پتھر کے بتوں کی جو خود بے جان ہیں۔ ان لوگوں نے جواب دیا: قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ﴿۷۱﴾ کہنے لگے ہم بتوں کی عبادت کرتے ہیں پھر ان کی عبادت پر قائم ہیں۔ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ﴿۷۲﴾ انہوں نے فرمایا کہ جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا وہ تمہاری سنتے ہیں؟ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ﴿۷۳﴾ یا تم کو کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟

آپؑ نے دلیل سے بات کی کہ جب تم انہیں پکارتے ہو تو کیا وہ تمہاری بات سنتے ہیں؟ یہ بے جان پتھر ہیں۔ ان میں بات سننے کی صلاحیت نہیں۔ وہ تمہاری بات سے بے خبر ہیں، تمہارے سجدوں سے بے خبر ہیں جو دعائیں تم ان سے مانگتے ہو وہ اس سے بے خبر ہیں تو تم کہاں ٹکریں مار رہے ہو۔ تم ان کی پوجا کرتے ہو جو تمہارے کام نہ سنوار سکتے ہیں نہ تمہارا کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔ تم خود ان پتھروں کو تیشے سے تراشتے ہو اور یہ اس پر کچھ محسوس نہیں کرتے پھر تم ان کو جہاں چاہتے ہو لگا دیتے ہو۔ کسی کو بت خانے کے فرش پر لگاتے ہو کسی کو تراش کر اس سے دیوار بناتے ہو کسی کو تراش کر حاجت روا بنا لیتے ہو۔ یہ کیا تماشا ہے؟

ان لوگوں نے جو جواب دیا وہ بات ہر دور کی گمراہی کا ایک بڑا سبب ہے۔ کہا: قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ﴿۷۴﴾ انہوں نے کہا بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔

باپ دادا اگر گمراہی پر ہوں تو ان کی تقلید کرنا حرام ہے۔ نبیؑ دلیل دے رہے ہیں لیکن وہ اپنے گمراہ آباؤ واجداد کی پیروی پر مُصر ہیں۔ آج کا مسلمان بھی یہی کچھ کر رہا ہے۔ ہمارے رواجات شادی بیاہ سے لے کر مرنے جینے تک کی رسومات میں شرعی ضابطے اور قاعدے نکل گئے ہیں اور خاندانی رسومات رائج ہو چکی ہیں۔ جب بتایا جاتا ہے کہ یہ خاندانی رسومات حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی شریعت کے خلاف ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ہم خاندانی روایتیں نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ باتیں جنہیں ہم معمولی سمجھتے ہیں یہ ہمیں دامانِ نبوت سے دور کر دیتی ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں نہیں ہیں، یہ تعلق کو ظاہر کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے ہمارا کتنا تعلق ہے، جب ہم خاندانی رسومات کو ضروری سمجھتے ہیں تو اس کا مطلب ہے ہمارے نزدیک اتباعِ سنّت سے رسومات کا اتباع زیادہ اہم ہے۔ اس طرح یہ چھوٹا جرم نہیں رہتا۔ بہت بڑا جرم بن جاتا ہے۔ نیکی کی توفیق سلب ہونا شروع ہو جاتی ہے اور بندہ گمراہی میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے بھی یہی کہا کہ ہم تو اپنے آباؤ واجداد کی پیروی پر جمے ہوئے ہیں۔

توحیدِ باری یہ ہے۔۔۔:

توحیدِ باری یہ ہے کہ ہر طرح کے شرک کا انکار کیا جائے۔ توحید کا اقرار ہی کافی نہیں، کفر و شرک کا انکار بھی ضروری ہے جیسا کہ ابراہیم علیہ اسلام نے کیا۔ ارشاد ہے: قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۙ﴿۷۵﴾ انہوں نے فرمایا بھلا تم نے ان کو (غور سے) دیکھا جن کی تم عبادت کرتے ہو؟ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۖ﴿۷۶﴾ تم بھی اور تمہارے پہلے بڑے بھی۔ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۷۷﴾ سو یہ تو میرے دشمن ہیں مگر (اللہ) جو پروردگار ہے جہانوں کا (میرا دوست ہے)۔

آپؑ نے فرمایا، یہ جو تم ہو، تمہارا قومی مزاج ہے، تمہاری رسومات ہیں اور تمارے بت جن کی تم پوجا کرتے ہو اور تمہارے گمراہ باپ دادا بھی سب میرے دشمن ہیں۔ میری ان سب سے دشمنی ہے۔ میں ان کا دشمن ہوں، یہ میرے دشمن ہیں۔ میرا تعلق اس ہستی سے ہے جو کائنات کا پروردگار ہے۔ میں اسے معبودِ حقیقی مانتا ہوں جو معبودِ حقیقی ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ میں اسلام کی بڑی خوبصورت تعریف آئی ہے۔ اللہ کی توحید، نبیؐ کی رسالت اور تمام ضروریاتِ دین کا اقرار اسلام ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کفر و شرک کا انکار بھی شرطِ اسلام ہے۔ صرف اقرار نہیں، انکار مقدم ہے۔ اسی لیے کلمہ اسلام نفی سے شروع ہوتا ہے۔ لا کہہ کر پہلے سب کا انکار کرو کہ کوئی معبود نہیں۔ جب لوحِ دل صاف ہو جائے تو پھر اس پر لکھو الا اللہ۔ سوائے اللہ کے۔ صرف اللہ معبود ہے۔ نفی نہیں ہوگی تو پھر دل میں چھوٹے موٹے معبود بھی رکھیں اور ساتھ کہیں کہ اللہ سب سے بڑا معبود ہے تو یہ اسلام نہیں۔ کفر ہی رہے گا۔ یہ شرک ہوگا۔ تھوڑی سی بھی شراکت، ساجھے داری، حصہ دار بن گئی تو شرک ہو گیا۔ یہی ابراہیم علیہ السلام نے بھی کہا میرا ان مشرکوں سے کوئی تعلق نہیں۔ ان بتوں سے، ان کی پوجا سے میں قطعاً لاتعلق ہوں، بیزار ہوں اور میری ان سے دشمنی ہے۔

آج کل بین المذاہب ہم آہنگی کے نام پر کفر و شرک کے انکار سے گریز سکھایا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان جس ہستی کو الہ کہتا ہے، ہندو اسے رام کہتے ہیں، عیسائی مسیح اور یہودی Moses کہتے ہیں۔ اس حوالے سے بالآخر سب اللہ ہی کو پوجتے ہیں۔ کوئی کسی طرح سے کوئی کسی طرح سے لہٰذا مذاہب میں ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ کفر و اسلام برابر ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں۔ رات اور دن اکٹھے نہیں ہو سکتے، آگ اور پانی، سردی اور گرمی یکجا نہیں ہو سکتے۔ یہ مختلف ہیں۔ اسلام اور کفر کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔

ہاں! اسلام میں کافر کے بھی انسانی حقوق ہیں۔ اسے ان حقوق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کا حکم ہے کہ اس کے مال، جان، آبرو کی حفاظت کی جائے۔ بیماری میں علاج کی سہولتیں دی جائیں۔ روزگار کے لیے دروازے

کھلے رکھے جائیں، بچوں کی تعلیم کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔ ریاست اسلامی ان کے حقوق کو یقینی بنائے۔ مسلمان اپنے کافر پڑوسی کی عزت وناموس کا لحاظ کرے۔ کسی طور زیادتی نہ کرے۔

رواداری کی ایک حد ہے وہ قائم رہنا ضروری ہے۔ کفر، کفر ہے، اسلام، اسلام ہے۔ دونوں کبھی ایک نہیں ہوسکتے۔ کفر اور اسلام میں ہم آہنگی نہیں ہوسکتی۔ یہی پیغام تھا ابراہیم علیہ السلام کا جس کا اعلان انہوں نے بھرپور انداز سے فرمادیا۔

ربوبیتِ باری تعالیٰ:

پھر اپنے معبودِ حقیقی کے ساتھ اپنے تعلق کی وضاحت فرمائی۔ یہ بھی تبلیغ کا ایک خوبصورت انداز ہے۔ فرمایا، میرا ربّ وہ ہے: الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ۝ جس نے مجھے پیدا فرمایا تو وہی مجھے راستہ دکھاتا ہے۔ اگلی آیات میں ربوبیت باری کی وضاحت فرمائی کہ میرا ربّ وہی ہے جو میرا خالق بھی ہے اور روزی رسان بھی۔ صحت و بیماری کا مالک بھی وہی ہے۔ پیدا کرنا اور مارنا بھی اسی کے اختیار میں ہے۔ ہر نعمت وہی دیتا ہے۔ ہر مشکل میں وہی کام آتا ہے۔ ایک مرتبہ پیدا کر کے اس نے چھوڑ نہیں دیا، وہ پرورش کرتا ہے، ساری ضرورتیں پوری کرتا ہے اور پھر وہی مجھے موت دے گا۔ مر کر اس کی بارگاہ میں جانا ہے پھر زندہ ہو کر جواب دینا ہے۔ اور وہی ہستی ہے جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ وہ میری خطائیں، حساب کتاب کے دن معاف فرمادے گا۔

انبیاؑ تو معصوم عن الخطا ہوتے ہیں تو آپ کا فرمانا کہ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ۔۔۔ سے کیا مراد ہے؟ انبیاؑ سے گناہوں کا صدور نہیں ہوتا لیکن عظمتِ الٰہی کا تقاضا ہے کہ جو معمولی سی بھول چوک ہو جاتی ہے جو کہ گناہ میں داخل نہیں ہوتی اسے بھی آپؑ خطا شمار کر کے فرما رہے ہیں کہ میری خطائیں وہ معاف فرمائے گا۔

خطا کاروں کے لیے نوید:

یہ نوید ہے خطا کاروں کے لیے کہ بڑی سے بڑی خطا بھی اس کی بارگاہ میں قابلِ معافی ہے۔ اس کی رحمت گناہوں سے وسیع تر ہے۔ اللہ کی رحمت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا دامن تھام لو، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلّم کے زیرِ سایہ آجاؤ، اللہ کی رحمت پالو تو ساری خطائیں بخشی جاسکتی ہیں۔

تمنائیں دعاؤں میں ڈھل گئیں:

فرمایا وہ غفورٌ رحیم ہے، رحم کرنے والا ہے، اسی سے میں امید کرم رکھتا ہوں۔ فرمایا: رَبِّ هَبْ لِیْ حُكْمًا

وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۴﴾ اے میرے پروردگار! مجھے حکمت و (دانش) عطا فرمایے اور مجھے (اعلیٰ درجہ کے) نیک لوگوں کے ساتھ شامل فرمایے۔

اکثر علماء نے یہاں حُکْمًا ۔۔۔سے حکمت ودانش مراد لیا ہے۔امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ علم ودانش اور حکمت تو نبیؑ کو نبوت کے ساتھ عطا ہو جاتی ہے۔حُکْمًا سے مراد قوت نافذہ ہے۔آپؑ فرما رہے ہیں کہ مجھے قوت عطا فرما کہ میں تیرے احکام کو نافذ کر سکوں۔اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھی قوتِ نافذہ کی دعا فرمائی تھی: وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (بنی اسرائیل:80) اے میرے پروردگار! مجھے مدینہ منورہ میں) اچھی طرح داخل کیجیو اور (مکہ مکرمہ سے) اچھی طرح نکالیو اور مجھے اپنے پاس سے ایسا غلبہ دیجیو جس کے ساتھ آپ کی مدد ہو۔مجھے اپنی طرف سے طاقت عطا کر جس میں تیری مدد شاملِ حال ہو وہ طاقت کہ میں تیرے دین کو نافذ کر سکوں۔

اس اصول کے تحت کوئی اس نیت سے اعلیٰ عہدہ پانا چاہے،قوت واختیار چاہے کہ مجھے جتنا اختیار ملے گا، جتنا میرے بس میں ہوگا اتنا میں شریعت کے مطابق فیصلے کروں گا۔اپنے دائرہ کار میں شریعت نافذ کروں گا تو یہ مسنون ہے۔یہ انبیاؑ کا طریقہ ہے۔اور عرض کی کہ مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔مجھے ہمیشہ نیک لوگوں میں شامل رکھنا۔ دارِ دنیا میں، برزخ میں، آخرت میں نیکوں کا ساتھ نصیب رہے۔

اگر شہر کا شہر ہی بدکار ہو جائے،قوم کی قوم ہی بگڑ جائے تو نیک لوگوں کے ساتھ رہنا کیا ہوگا؟ نیک لوگوں کے ساتھ رہنا یہ ہوگا کہ وہ خود نیکی پر قائم رہے۔یہ کوئی بہانہ نہیں کہ اکثریت ایسا کرتی ہے۔اکثریت جو چاہے کرے۔ اللہ کا بندہ وہ کرتا ہے جو اللہ اور اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلّم چاہتا ہے۔ایسی صورت میں وہ اکیلا بھی ہو تو اکیلا نہیں ہے۔ جو اتباعِ رسالت کرے گا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے خادموں میں شامل ہوگا۔وہ اکیلا نہیں ہے وہ نیکوں کے ساتھ ہے۔نیکی پر قائم رہنے والا نیکوں کے ساتھ ہوگا، یہاں بھی، برزخ میں بھی اور آخرت میں بھی۔

فرمایا: وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۸۴﴾ اور میرا ذکر سچا آئندہ آنے والوں میں جاری رکھیے۔ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا بھی فرمائی کہ میری ان کھری باتوں کو میرے نام کے ساتھ قائم رکھنا۔یہ جو میں تیرے دین کی حقانیت بیان کر رہا ہوں۔اس کے ساتھ میرے ذکر کو میرے نام کے ساتھ جاری رکھنا۔اور دیکھ لیجیے آج ہم تشہد میں درود پڑھتے ہیں تو ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ساتھ ہوتا ہے۔اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ ﴿۸۵﴾ اور مجھے نعمت کی بہشت کے وارثوں میں سے کیجیے۔جنت

مومن کی میراث ہے۔ وراثت کسی محنت ومزدوری سے نہیں ملتی۔ جیسے وراثت بغیر مشقت کے عطا ہو جاتی ہے ویسے ہی جنت وارثوں کو مل جاتی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جنت اللہ تو نہیں ہے، غیر اللہ ہے تو اللہ کے اولوالعزم رسولؑ جنت کی طلب کیوں کر رہے ہیں؟ اس لیے کہ جنت اگرچہ فی نفسہٖ مقصود نہیں ہے لیکن جنت رضائے باری تعالیٰ کی دلیل ہے۔ جنت ان کو ملے گی جن پر اللہ راضی ہوں گے۔ جنت اس لیے طلب کی جاتی ہے کہ یہ اللہ کی رضامندی کی دلیل ہے۔

وَاغْفِرْ لِاَبِیْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۸۶﴾ اور میرے باپ کو بخش دیجیے کہ بے شک وہ گمراہوں میں سے ہے۔ آپؑ نے اپنے ربّ سے اپنے والد کی بخشش کی دعا مانگی۔ ابراہیم علیہ السلام بڑے نرم دل، نرم مزاج تھے اللہ کریم سے والد کے لیے دعا کی۔ بارگاہ الٰہی سے حکم آیا کہ آپ کسی کے لیے دعا نہیں کر سکتے جو آپ پر ایمان نہیں لایا۔

ایمان وہ نعمت۔۔۔:

ایمان وہ نعمت ہے کہ بچ جائے تو دعاؤں سے اللہ کی مغفرت مل جاتی ہے۔ وہ کریم ہے کسی کی شفاعت پر معاف کر دے، کسی کی دعا پر معاف کر دے۔ اس کی رحمت سے امید کی جاتی ہے لیکن کفر ایسی مصیبت ہے کہ کافر ہر نعمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ کافر کے لیے زندگی میں ہدایت کی دعا کی جا سکتی ہے۔ کفر پر مر جائے تو اس کے لیے دعا کرنا جائز نہیں۔ جس کے لیے دنیا میں دعا کرنا جائز نہیں آخرت میں اس کی شفاعت کون کرے گا!

حقیقی رسوائی۔۔۔:

حقیقی رسوائی آخرت کی رسوائی ہے۔ فرمایا جب مر کر آپ کی بارگاہ میں آؤں تو اس دن کی رسوائی سے مجھے بچانا۔: وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾ اور جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے مجھے رسوا نہ کیجیو۔ ہر شخص کو یہ احساس رہتا ہے کہ کوئی ایسی بات نہ ہو کہ جس سے وہ لوگوں میں رسوا ہو۔ ہر ایک جانتا ہے کہ اس کی سبکی نہ ہو۔ بندہ ساری عمر اپنی عزت بچاتا رہتا ہے، لوگوں کے سامنے اپنی عزت محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ یہاں اسی بات کا ذکر ہو رہا ہے۔ فرمایا: وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾ اور جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے مجھے رسوا نہ کیجیو۔

یہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا حصّہ ہے کہ اے اللہ! جس دن اوّلین وآخرین، ساری مخلوق، تمام ذی روح وذی حیات جمع ہوں گے تو اس وقت کی ندامت سے محفوظ رکھنا۔ اگلی آیاتِ مبارکہ میں خود بتا دیا کہ آخرت میں کون ندامت سے بچے گا، کسے سرخروئی نصیب ہوگی؟ فرمایا، جس دن نہ مال ہی کوئی فائدہ دے گا اور نہ بیٹے۔ ہاں مگر جو شخص اللہ کے پاس (کفر وشرک سے) پاک دل لے کر آیا (اس کی نجات ہوگی)۔

دنیا میں انسان عموماً بنیادی طور پر دولت کو باعثِ عزت سمجھتا ہے اور حتی الامکان کوشش کرتا رہتا ہے کہ دولت جمع کر کے ایک بڑا انسان بن جائے یا پھر اولاد، خویش و اقارب کو قوتِ بازو کہا جاتا ہے۔ قبیلہ، کنبہ، خاندان مضبوط ہوں، زور آور ہوں تو دنیا میں کامیابی کی علامت ہوتے ہیں۔ یہ چیزیں جنہیں ہم دنیا میں بڑا باعثِ عزت سمجھتے ہیں جن کے بھروسے پر ہم زندگیاں گزارتے ہیں، وہاں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ وہاں نہ دولت سے کسی کی عزت ہوگی نہ اولاد سے۔ اس دن کی رسوائی سے صرف وہی بچے گا جو اللہ کریم کے پاس سالم دل لے کر آیا۔ اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰہَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ﴿۸۹﴾ علماء نے قلبِ سلیم کے ترجمے میں لکھ دیا ہے کہ جو دل کفر و شرک سے پاک ہو۔ تراجم میں اتنی ہی گنجائش ہوتی ہے لیکن معاملہ اس سے کہیں آگے ہے۔ کفر و شرک سے پاک، کون سا دل ہے؟ وہ دل کفر و شرک سے پاک ہے جس میں اللہ کی رضا کی طلب زیادہ ہے اور دنیوی جاہ و جلال کی طلب کم ہے یا ہے ہی نہیں۔ انسانی دل ایک وقت میں دو چیزیں اندر نہیں رکھتا کہ آخرت سے بھی محبت ہو اور دنیا سے بھی محبت ہو۔ ایک وقت میں ایک ہی محبت دل میں رہ سکتی ہے۔ یہ غلط فہمی بھی نہیں ہونی چاہیے کہ کسی کے پاس دولت زیادہ ہے تو وہ دنیا کی محبت میں گرفتار ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ اعلیٰ قلبِ سلیم رکھتے تھے اور بہت بڑے مالدار بھی تھے۔ بات یہ ہے کہ دولت حلال ذرائع سے کمائی گئی ہو۔ رزقِ حلال کمانا خود عبادت ہے۔ اللہ کریم نے دولت حاصل کرنے پر پابندی نہیں لگائی بلکہ دولت مندوں کو زکوٰۃ اور دیگر صدقات ادا کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ دولت ہی مقصدِ حیات نہ بن جائے کیونکہ جب دولت، طاقت، جاہ و چشم مقصدِ حیات بن جائے تو پھر قلب، قلبِ سلیم نہیں رہتا۔ یہ نازک بات ہے کہ بندہ دل کو ان سے کیسے بچائے؟ اس دنیا میں رہتے ہوئے ان چیزوں سے الفت کیسے نہ ہو؟ اس کا علاج قلب کو برکاتِ نبوت سے پاک کرنے میں ہے۔

برکات نبوت سے ہی قلب سلیم ہوتا ہے:

قلبِ سلیم کے لیے وہ برکات چاہیں جن کا مخزن قلبِ اطہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہے۔ تمام علومِ شریعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے تمام مسلمانوں کو قیامِ قیامت تک پہنچتے رہیں گے اور علوم شریعت میں موجزن برکاتِ نبوت بھی پہنچتی رہیں گی۔ دین کے دو پہلو ہیں۔ علومِ نبوت اور برکاتِ نبوت، علومِ نبوت پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں، سیکھے اور سکھائے جاتے ہیں۔ برکاتِ نبوت انعکاسی طور پر سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی ہیں۔ قلب سلیم کے لیے یہی برکات چاہیں۔ برکات نبوت بالکل الگ شعبہ ہے۔

عہد نبوی میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو ایمان لائے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے نہیں جا سکے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے وصال کے بعد مدینہ منورہ پہنچے لیکن وہ صحابیؓ نہیں بنے۔

کیا عجیب بات نہیں کہ اسی عہدِ زرّیں میں انہوں نے اسلام بھی قبول کیا! بعض ایسے حضرات ہیں جو جہاد میں شریک رہے اور غزوات میں ہی مصروف رہے مسلسل اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے اور وہ بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم کی حاضری سے محروم رہے۔ وہ صحابیؓ نہیں بنے۔ کچھ برکات وجودِ عالی کی تھیں۔ جن کے لیے وجودِ عالی کے سامنے، نگاہِ پاک کے سامنے جانا یا وجودِ عالی کو دیکھنا ضروری تھا جو دلوں سے دلوں میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ تو جس کی نگاہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے وجودِ عالی پر پڑی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی نگاہِ عالی اُس پر پڑی اس ایک نگاہ میں وہ صحابیؓ ہو گیا۔ صحابیت وہ اعلیٰ مرتبہ ہے جو نبوت کے بعد اعلیٰ ترین مقام ہے۔

یہ تھیں برکاتِ نبوت۔ جسے برکاتِ نبوت نصیب ہوئیں اُس کا دل سالم رہ گیا۔ الحمد للہ اُسے قلبِ سلیم نصیب ہو گیا۔ ہر صحابیؓ کا دل قلبِ سلیم ہے اس لیے حضور اکرمِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ أَصْحَابِيْ كَالنُّجُومِ میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ (الشریعۃ لآجری) او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کہ جس کا دامن تھام لو گے، ہدایت پا جاؤ گے، صحابہ ءکرامؓ میں بھی بعض حضرات نے بعض چیزوں کو مختلف انداز میں سمجھا لیکن کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ کسی بات کا ایک پہلو کسی ایک حضرت نے تھاما۔ دوسرا پہلو کسی دوسرے نے تھام لیا۔ ایک ارشادِ عالی اُن تک پہنچا اس کے تین چار پہلو تھے تو کوئی پہلو خالی نہیں جانے دیا گیا، کسی نے ایک سمجھ لیا کسی نے دوسرا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا جس صحابیؓ کے پیچھے لگ جاؤ گے ہدایت پا جاؤ گے کیونکہ سب ہدایت یافتہ ہیں سب کے قلب سلیم میں ایک پہلو پر عمل کر لو یا دوسرے پر کر لو۔ قلبِ سلیم کا مقصد رضائے الٰہی بن جاتا ہے۔ دنیا چھوڑنی نہیں پڑتی۔ دنیا کے سارے کام صحابہ ءکرام نے کیے۔ پڑھا، پڑھایا بھی، کاروبار کیے، تجارت بھی کی۔ جہاد و غزوات بھی کیے۔ ممالک فتح بھی کیے۔ شہید ہوئے بھی، کافروں کو قتل بھی کیا، شادیاں کیں، اولادیں پالیں، زندگی کے سارے کام کیے لیکن کوئی کام اُن کے دل میں اس طرح جگہ نہ پا سکا کہ اُس کام کی غرض سے وہ کام کریں۔ وہ کام بھی اللہ کی رضا سے کیا تو جیسا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ ہے کہ مومن کی دنیا بھی دین بن جاتی ہے اور کافر کا دین بھی دنیا ہے۔ کافر اگر کچھ مذہبی رسومات ادا کرتا ہے تو اُس کا مقصد کوئی دنیوی فائدہ ہوتا ہے لہٰذا کافر کا دین بھی دنیا ہے مومن دنیا کے کام بھی کرتا ہے تو اُس کا مقصد رضائے الٰہی ہوتا ہے لہٰذا اُس کی دنیا بھی دین ہے۔

جب قلبِ سلیم نصیب ہو تو دنیا بھی دین بن جاتی ہے کہ بندہ زندگی کے جتنے کام کرتا ہے، روزی کمانے سے لے کر بال بچوں کے کاموں تک، والدین کی خدمت، لوگوں سے معاملات، سیاسیات تمام امور تک، اس کا بنیادی مقصد رضائے الٰہی ہوتا ہے اور وہ کوئی کام اللہ کے حکم کے خلاف نہیں کرتا لیکن قلبِ سلیم کے لیے وہ برکات چاہیں جو

بارگاہِ رسالت سے صحابہؓ کو نصیب ہوئیں اور صحابہؓ کو بھی اتنی قوت سے نصیب ہوئیں کہ وصالِ نبوی علیٰ صحابتہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد جو صحابہؓ کی صحبت میں آیا وہ تابعی ہو گیا۔ اسے ایک الگ درجہ نصیب ہو گیا اور وہ بھی بہ یک نگاہ برکاتِ نبوت پا گیا جیسے بارگاہِ رسالت میں بہ یک نگاہ صحابیؓ بن گیا۔ جو حالتِ ایمان میں صحابہؓ کی خدمت میں آ گیا وہ تابعی بن گیا۔ تابعین کی صحبت میں جو پہنچا وہ تبع تابعی بن گیا اب صحابہؓ کی صحبت میں صحابیؓ نہیں بن سکے وہ مقامِ نبوت تھا لیکن صحابہؓ میں پرَتوَ جمال اتنا تھا کہ جو ان کے سامنے آیا تابعی بن گیا۔ تابعین کی صحبت میں پھر تابعی نہیں بن سکے ایک درجہ کم ہو گیا جس نے تابعی کی صحبت پائی وہ تبع تابعین میں آ گیا۔ تبع تابعین کا درجہ بھی اتنا بلند ہے کہ ساری دنیا کی ولایت جمع کر کے مینار بناتے جائیں تو وہ تبع تابعین کی خاک پا کو نہیں پہنچتا۔ نیچے رہ جائے گا۔ اب یہ قوت صحابہؓ میں تو تھی کہ بہ یک نگاہ تابعی بن گیا۔ تابعین میں تھی کہ بہ یک نگاہ تبع تابعی بن گیا لیکن تبع تابعین میں آ کر یہ عہد ختم ہو گیا پھر ضرورت پڑی کہ اپنے دل کو روشن کیا جائے، صاف کیا جائے آئینے کی طرح چمکایا جائے پھر ان کی بارگاہ میں جائیں تو پھر ولایت نصیب ہوتی ہے تبع تابعین کے بعد پھر یہ عہد آ گیا کہ جس نے یہ نعمت حاصل کرنی ہے وہ اللہ کا ذکر کرے دل کو چمکائے صاف کرے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: لِكُلِّ شَيْءٍ صِقَالَةٌ وَصِقَالَةُ الْقُلُوبِ ذِكْرُ اللهِ (بیہقی) ہر چیز کو صاف کرنے کی چمکانے کی پالش ہوتی ہے دلوں کی پالش اللہ کی یاد ہے اللہ کا ذکر ہے او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ تو پھر ضرورت پیش آئی کہ دلوں کو ذکر الٰہی سے چمکایا جائے اور دل میں استعداد پیدا کی جائے کہ وہ ان برکات کو حاصل کرے۔ تبع تابعین تک تو یہ کیفیت رہی۔

کیا خوش نصیب لوگ تھے صحابہؓ کہ کسی چیز کی ضرورت نہیں جیسا تیسا بھی ہے دل کو ایک مرتبہ بارگاہِ رسالت میں لے جاؤ دل بھی صاف ہو گیا۔ سینہ بھی صاف ہو گیا قلب بھی سلیم ہو گیا۔ درجہ صحابیت بھی ایک نگاہ میں نصیب ہو گیا۔ تبع تابعین کے بعد وہ بات نہ رہی۔ نہ تقسیم کرنے والی ہستیاں اس درجے کی رہیں جس درجے کے صحابہؓ تھے یا تابعین تھے پھر تبع تابعین تھے۔ تبع تابعین کے بعد پھر اللہ کے بندوں نے محنتیں کر کے دلوں کو صاف کیا اور ان کی بارگاہ میں بیٹھے اور قلبِ سلیم حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ سلسلہ کیا ختم ہو گیا؟ نہیں۔ ہمیشہ کے لیے نبوت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے۔ جب تک سورج غروب وطلوع ہو رہا ہے شریعتِ محمدیہ ہے اور جب تک سورج طلوع وغروب ہو رہا ہے قلبِ سلیم حاصل کرنے کا طریقہ بھی وہی ہے یعنی برکاتِ نبوت کا حصول۔ وہ نصیب ہوں تو ان کی اپنی لذت ہے جنہیں نصیب ہوتی ہیں اُن کے سامنے اس لذت کے مقابل دنیوی عہدوں، دنیوی دولت اور دنیوی چیزوں کی کوئی قیمت یہاں دنیا میں ہی نہیں رہتی تو آخرت میں ہم کیا امید رکھیں گے کہ میرے بڑے عہدے سے مجھے کوئی رعایت ملے گی یا دولت سے ملے گی!

دنیا آزمائش کا گھر ہے، نفسِ انسانی بھی ہر بندے میں موجود ہے شیطان بھی ہر بندے کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ایک شیطان تو پیدا ہوتے ہی ہر شخص کے ساتھ لگ جاتا ہے جسے قرین شیطان کہتے ہیں وہ ساری زندگی اسی کے ساتھ رہتا ہے۔دوسرے شیاطین وسوسہ اندازی کرتے رہتے ہیں۔ان سب سے بچنے کا علاج قلب کو سلیم کرنا ہے۔

قلبِ سلیم وہ روشن قلب ہے جو برکاتِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے جلا پائے۔اس کے لیے اللہ کا کوئی ایسا بندہ ملے جو قلوب تک برکات نبوت کی روشنی پہنچائے۔اسلام میں شیخ، مرید کا یہی مقصد ہے۔پیری مریدی کی دو صورتیں ہیں۔ایک ہے بیعتِ اصلاح۔یہ ایسے شخص کے ہاتھ پر کرنا چاہیے جو زندگی کے امور میں شریعت کے مسائل سے آگاہ کرتا رہے۔اس کے پاس اتنا علم ہونا چاہیے۔دوسری بیعت ہے جسے بیعتِ تصوف کہتے ہیں۔یہ حصولِ برکات کے لیے ہے قلب کو سلیم کرنے کے لیے ہے۔اس کی بنیادی شرائط میں سے ہے کہ جسے آپ شیخ اختیار کرتے ہیں وہ کم از کم خود فنا فی الرسول ہو اور طالب کو فنا فی الرسول کرانے کی اہلیت رکھتا ہو۔یہ کم از کم درجہ ہے۔اس کے بغیر بیعتِ تصوف حرام ہے۔اس سے کم درجے کے انسان سے بیعتِ تصوف نہیں کی جا سکتی۔فرمایا، اس دن عہدوں کی اہمیت ہوگی نہ قبیلوں کی۔بیٹوں کی نہ مال و دولت، زمین جائیداد کی۔اس دن صرف ان بندوں پر اللہ کا احسان ہوگا جو قلبِ سلیم لے کر اس کی بارگاہ میں آئیں گے۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۹۰﴾ اور پرہیزگاروں کے لیے جنت قریب کر دی جائے گی۔ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿۹۱﴾ اور گمراہوں کے لیے دوزخ (سامنے) ظاہر کر دی جائے گی۔اللہ کے نیک بندوں کے لیے جنت کو سجا دیا جائے گا اور دوزخ کو بھی کھینچ کر وہاں لایا جائے گا کہ جنہوں نے دنیا میں اللہ سے بغاوت کی انہیں ان کا ٹھکانہ بھی دکھا دو۔جنت اور دوزخ کو جنتی اور جہنمی دونوں دیکھیں گے۔جنتی دوزخ کو دیکھ کر اللہ کا مزید شکر کریں گے کہ اے اللہ آپ کا احسان ہے، آپ نے ہمیں اس سے بچا لیا اور دوزخیوں کو جنت دیکھ کر حسرت ہوگی کہ ہم نے اتنی نعمتیں گنوا دیں۔یہ سب کچھ آج کیوں نہیں دکھا دیا جاتا؟ اس لیے کہ امتحان ہی یہی ہے کہ لوگوں کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی باتوں پر یقین ہے یا نہیں۔اگر دنیا میں دکھا دیا جائے تو پھر نبوت کی، رسالت کی، کتابوں کی، عبادت کی کیا ضرورت؟ دیکھ کر تو ہر کوئی مان لے گا۔کون ہے جو دیکھتے ہوئے دوزخ جائے گا؟ دیکھ کر تو ہر کوئی جنت کی طرف بھاگے گا۔آزمائش یہی ہے کہ کس کا ایمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی باتوں پر ہے، اسے یقین ہے کہ نہیں؟ جسے یقین ہے اس سے بھی غلطی ہو سکتی ہے لیکن وہ فوراً توبہ کرے گا، رجوع الی اللہ کرے گا اور اس بات پر قائم رہے گا کہ میں نے دامانِ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تھامے رکھنا ہے۔کلمہء اسلام بڑی دولت ہے۔جس نے اسے قبول نہیں کیا وہ سرے سے محروم رہا اور جس نے پڑھ لیا وہ کامیابی کی راہ پر چل پڑا۔اب اسے اپنے اعمال سے اسے ثابت کرنا ہے۔

جس نے رسماً کلمہ پڑھ لیا اور ساری زندگی اطاعت نہیں کی تو اس رسمی پڑھنے میں بھی اتنی جان ہے کہ اللہ چاہے تو بخش دے۔ وہ ارحم الراحمین ہے۔ اللہ کا احسان ہے ہم مسلمان والدین کے گھر پیدل ہوئے۔ ہم نے زمین پر سانس لیتے ہی اللہ کا نام سنا، کان میں اذان کہی گئی، توحید و رسالت کی شہادت سنائی گئی۔ ہوش سنبھالا تو والدین کو نماز روزہ کرتے دیکھا۔ جو ہمیں نصیب ہوا ہم بھی کرتے رہے۔ یہ اللہ کا احسان ہے لیکن اس کلمے کو چھیننے کے لیے مختلف بہروپ بھر کر اسلام دشمن طاقتیں اپنے کارندے پھیلائے رکھتی ہیں۔ ایسے ہی لوگ دین کے نام پر بے دینی پھیلانے میں بھرپور کام کرتے نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے نئی نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں۔ یہ لوگ غیر مسلم ممالک سے دینیات میں پی ایچ ڈی کر کے آتے ہیں اور بڑے فاضل مانے جاتے ہیں۔ ان کو دینیات پڑھانے والے یہودی اور عیسائی ہوتے ہیں۔ اس لیے جو وہاں سے پی ایچ ڈی کر کے آتا ہے وہ نیا مذہب شروع کر دیتا ہے۔ شریعت میں کانٹ چھانٹ کرتا ہے۔ آج کل 'الھدیٰ' کے نام سے دینیات پڑھائی جاتی ہے اس میں نئے نئے مسئلے نکالتے رہتے ہیں۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ فرصت ہو تو سنت پڑھ لیں، فرصت نہیں تو نہ پڑھیں۔ اگر اور بھی جلدی ہو تو ثنا یعنی سبحانك اللھم۔۔۔ نہ پڑھیں صرف سورۃ الفاتحہ پڑھ لیں اس کے ساتھ کوئی ایک آدھ آیت ملا کر پڑھ لیں۔ آخر میں تشہد اور درود شریف چھوڑ دیں۔ درود شریف ضروری نہیں۔ یعنی صلوٰۃ میں کاٹتے کاٹتے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ یہ سب کچھ اتنا ہی فالتو تھا تو ان کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلّم (معاذ اللہ) غیر ضروری کام کرتے رہے؟

سنتِ مؤکدہ کی اگر ضرورت نہیں تھی تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کیوں ادا فرماتے رہے، سنتِ مؤکدہ کا چھوڑنے والا گناہگار ہوتا ہے ہاں نوافل میں یہ رعایت ہوتی ہے کہ نوافل آپ کا اوور ٹائم ہے اگر نفل چھوڑ بھی دیتے ہیں نقصان ہوگا گناہ نہیں ہوگا لیکن جو برکات جو انوارات اُن سجدوں اور رکوع میں ملنے تھے وہ نہیں ملیں گے نقصان بہرحال ہوگا گناہ نہیں ہوگا۔ اگر سنت مؤکدہ چھوڑیں گے تو گناہ ہوگا اگر اس کے منکر ہو جائیں گے کہ یہ ضروری نہیں ہے تو کفر ہو جائے گا اس لیے جو وہاں سے فاضل آتے ہیں وہ دین میں قطع برید کے فاضل ہوتے ہیں، قینچی لی ہوئی ہے دین کو قطع کر رہے ہیں۔

الحمد للہ اللہ کریم کا احسان ہے کہ ہمیں کلمہء توحید تو نصیب ہوا۔ اللہ قبول فرمائے اور ہمیں ہدایت پر رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ فرمایا آج تو تمہارے پاس خبر ہے اور 'اصدق الصادقین رحمۃ للعالمین' کی زبانِ پاک سے خبر ہے، میدانِ حشر میں خود دیکھ لو گے۔ جنت بھی سجائی جائے گی، دوزخ بھی بھڑکتی ہوئی گھسیٹ کر لائی جائے گی پھر پوچھا جائے گا: وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۹۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۹۳﴾

وہ کہاں ہیں اللہ کی عظمت کو چھوڑ کر اللہ کی ذات کو چھوڑ کر جن سے تم نے امیدیں وابستہ کرلیں کہ وہ میرا کام کرے گا وہ مجھے روزی دے گا وہ مجھے صحت دے گا وہ کہاں ہیں؟ ان کو بلاؤ اَوْ یَنْتَصِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ کیا وہ اس قابل ہیں کہ آج تمہاری مدد کرسکیں؟ اللہ کے علاوہ جن کو تم اپنا حاجت روا سمجھتے رہے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے والے سمجھتے رہے اور اللہ کے احکام کے خلاف ان کی اطاعت کرتے رہے اب وہ بُت، وہ انسان اور دیوی دیوتا کہاں ہیں؟ هَلْ یَنْصُرُوْنَكُمْ ۔۔۔ کیا وہ تمہاری مدد کرسکتے ہیں؟ هَلْ یَنْصُرُوْنَكُمْ ۔۔۔ کیا تمہارے کام آسکتے ہیں؟ آج تمہیں اس جہنم جانے سے بچا سکتے ہیں؟ هَلْ یَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ یَنْتَصِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ تمہاری مدد کرسکتے ہیں یا خود اپنے آپ کو بھی بچا سکتے ہیں؟ تم نے تو ان کو بھی مروا دیا اُن کو بھی تمہارے پاس ہی جہنم میں جھونکا جائے گا۔ وہ تو اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے تمہارا کیا کریں گے جو خود جہنم جا رہے ہیں وہ تمہارا کیا بھلا کریں گے۔ فَكُبْكِبُوْا فِیْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿۹۴﴾ وہ سارے بندے وہ سارے بت وہ سارے شیطان وہ سارے دیوی دیوتا اوندھے منہ اُلٹے کر کے دوزخ میں پھینک دیے جائیں گے۔ وَجُنُوْدُ اِبْلِیْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿۹۵﴾ سارا لشکر ابلیس کا بھی، سارے شیاطین اُس میں چلے جائیں گے قَالُوْا وَهُمْ فِیْهَا یَخْتَصِمُوْنَ ﴿۹۶﴾ اور وہاں پھر آپس میں اُن کے جھگڑے ہوں گے۔ لڑیں گے ایک دوسرے سے جھگڑا کریں گے اور کہیں گے تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۹۷﴾

اللہ کی قسم ہم واضح گمراہی میں تھے، دنیا میں ہم نے غلطی کی دامنِ انبیاءؑ کو چھوڑ کر، اللہ کی راہِ ہدایت کو چھوڑ کر ہم نے بہت بڑا ظلم کیا ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب وہ سارا ہمارے سر آ گیا اِذْ نُسَوِّیْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۸﴾ جب کہ ہم تم کو (اے بتو! عبادت میں) پروردگار عالم کے برابر کرتے تھے ہم اللہ کے برابر کہتے تھے جو کائنات کا رب تھا ساری کائنات کا پالنے والا تھا ہم اُس کی اطاعت کے منکر رہے اور وہ ہمیں روزی دیتا رہا ہمیں پالتا رہا، ہمیں موقعہ دیا ہمیں صحت دی، ہمیں زندگی دی، اولاد دی۔ کون سی نعمت ہے دنیا کی جو اس نے ہمیں نہیں دی، ہم اُس سے نعمتیں لیتے رہے اور سجدے اوروں کو کرتے رہے، اے باطل معبودو! اب ہمارے کس کام کے ہو تم؟ کہ ہم تمہیں ربّ العالمین کے برابر درجہ دیتے رہے اور تمہاری پوجا کرتے رہے تو پھر وہ کہیں گے: وَمَاۤ اَضَلَّنَاۤ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۹۹﴾ ہم کو ان گناہ گاروں نے ہی گمراہ کیا یہ خود سارے گمراہ تھے یہ خود سارے مجرم تھے انہوں نے ہمیں بھی مجرم بنا دیا۔ اب جو لوگوں سے سجدے کرا کے خوش ہوتا ہے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اُسے اللہ ہی ہدایت دے۔

میں ایک پیر صاحب کو جانتا ہوں۔ بڑی سی حویلی تھی اس میں وہ بیٹھے ہوتے تھے۔ مرید جب آتے حویلی کے دروازے سے جب داخل ہوتے تو وہاں سے سجدے کرتے کرتے پیر صاحب تک آتے اور وہ بڑے اکڑ کر بیٹھے ہوتے تھے پھر وفات ہوگئی۔ زندگی میں وہ وصیت کر گئے کہ مجھے اسی حویلی میں اور یہ سامنے جو درخت ہے اُس کے سائے میں جہاں میں بیٹھتا ہوں، یہیں میری قبر بنانا، اب بھلا وصیت سے کون انکار کرے۔ اللہ کی شان ہے تین چار جگہ انہوں نے قبر کھودی فٹ ڈیڑھ فٹ کھودتے تھے تو نیچے سے کیڑے نکل آتے تھے۔ تین چار جگہ انہوں نے جگہ بدل بدل کر کھودا لیکن جہاں قبر کھودتے فٹ ڈیڑھ فٹ جانے کے بعد نیچے سے سارے کیڑے مکوڑے نکل آتے پھر انہوں نے یہ کیا کہ چار دیواری سی بنا کر اس میں ٹریکٹروں سے لا کر مٹی ڈال کر اس پر پیر صاحب کا تابوت رکھ کر ارد گرد اینٹیں لگا کر اور مٹی ڈال کر اونچا کر کے اسے دفن کیا پھر اس پر قبر بنائی۔ اس بات سے بھی انہیں حیا نہیں آئی اور اللہ کا خوف نہیں آیا کہ اس بندے کو خود زمین نے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے ہم کس بات کے سجدے کر رہے ہیں پھر اُس پر روضہ بنایا گیا۔

میرا خیال ہے وہ روضہ کم و بیش سو فٹ کے قریب بلند ہوگا۔ کئی Steps میں اسے مکمل کیا اور کروڑوں روپے اُس پر لگ گئے بڑی خوبصورت جالیاں اور ٹائلیں لگائی گئیں، ایک بیٹے کو گدی نشین بنا دیا اور اب بھی جو حویلی میں داخل ہوتا وہاں تک سجدہ کرتا جاتا ہے۔ عقلِ انسانی پر بھی حیرت ہوتی ہے عبرت کسی کو نہیں ہوئی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ زمین نے قبر کے لیے جگہ نہیں دی۔ پیری مریدی کا یہ طریقہ بُت پرستی سے بھی بدتر ہے اور اس میں دین نہیں بچتا اس میں قلب تباہ ہو جاتا ہے۔ سلیم تو رہا، قلب، قلب ہی نہیں رہتا تو ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ جس چیز کی ہمیں ضرورت ہے جن برکات کو ہم تلاش کرتے ہیں وہ اس بندے کے اپنے دل میں بھی ہیں کہ نہیں۔ جس کے پاس ہیں ہی نہیں وہ ہمیں کیا دے گا؟ کم از کم یہ تو تلاش کرنا چاہیے۔ ہم خانہ پُری کر لیتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں پیر صاحب کو پیسے دے دیے دو سجدے کر دیے ہاتھوں پر بوسہ دے دیا گھٹنے چوم لیے چلو ہماری نجات ہوگئی۔ دین مذاق نہیں ہے دین اللہ کا دیا ہوا نظامِ حیات ہے اور اُس میں جان پڑتی ہے برکاتِ نبوت سے۔

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ (اب) نہ کوئی ہمارا سفارشی ہے۔

پھر بڑی حسرت سے کہیں گے کہ آج تو کوئی ہمارا سفارشی بھی نہیں اتنی مخلوق اللہ کی ہے انبیاء ہیں، رُسل ہیں، اولوالعزم رسولؑ ہیں، صحابہؓ ہیں، تابعینؒ، تبع تابعینؒ ہیں، اولیائے امت ہیں، علمائے امت ہیں، بڑے بڑے لوگ ہیں لیکن ہمیں کوئی نہیں پوچھتا کوئی ہمارے کام نہیں آتا ہمیں کوئی پوچھتا ہی نہیں وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ اور نہ مخلص دوست۔ اور نہ ہی اب کوئی ہمارا گہرا دوست ہے۔ دنیا میں بڑی دوستیاں بھی تھیں بڑے تعلقات بھی تھے بڑے بااثر

بھی تھے اب وہ سارا کچھ ہی غائب ہو گیا ہے نہ کوئی ہمارا دوست ہے نہ ساتھی ہے، نہ سفارشی ہے پھر سرد آہیں بھر کر کہیں گے: فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ سو کاش! ہمیں (دنیا میں) پھر جانا ہوتا تو ہم ایمان لانے والوں میں ہوتے۔ کاش ہمیں ایک بار پھر دنیا میں بھیج دیا جائے اور ہم وہاں ایمان کے ساتھ زندگی گزاریں۔ دوبارہ اگر اللہ کریم ہمیں زندگی دے دے، آپس میں بات کر رہے ہوں گے کہ اب ایک ہی راستہ ہے کاش ہمیں دنیا میں دوبارہ بھیج دیا جائے ہم وہاں ایمان لے آئیں گے اس کے بارے میں اللہ کریم قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر ان کو دنیا پر لوٹا دیا جائے۔ لوٹانا تو ہے نہیں دنیا ختم ہو گئی دارِ عمل ختم ہو گیا لیکن اگر ان کو لوٹا دیا جائے تو پھر وہی کام کریں گے جو پہلے کرتے تھے اور اُس کی وجہ ارشاد فرمائی کہ وہ کام ان کے قلوب میں بس چکے ہیں جب واپس جائیں گے تو سینے میں دل تو وہی ہو گا جو آلودہ تھا پھر وہ آلودگی کی طرف ہی جائے گا کیونکہ وہ نورِ ایمان سے روشن نہیں تھا۔ برکات سے روشن نہیں تھا۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

بے شک اس (قصہ) میں بڑی دلیل ہے اور (اس کے باوجود) ان کے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے۔ فرمایا ان باتوں میں یہ جو قصہ ہے، یہ جو حقیقت ہے یہ جو آخرت کی منظر کشی کی گئی ہے یہ جو سارے حقائق بیان کیے گئے یہ بہت بڑی دلیل ہے۔ ان میں راہنمائی کی ساری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اس کے باوجود لوگوں کی اکثریت ایمان نہیں لاتی یعنی یہ سارے احوال سن کر، اللہ کے ذاتی کلام میں سنتے ہیں اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات میں سنتے ہیں اور پھر دنیا پر ہی فدا ہوتے ہیں پھر اللہ کے دین کی طرف نہیں آتے، ایمان نہیں لاتے۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ اور بے شک آپ کا پروردگار بڑا زبردست (اور) مہربان ہے۔

یہ بات نہیں ہے کہ یہ اللہ کی رسائی سے باہر ہیں ایسی بات نہیں ہے اللہ غالب ہے جب چاہے جسے چاہے پکڑ لے جب چاہے جسے چاہے تباہ کر دے عذاب نازل کر دے لیکن وہ بڑا رحیم ہے اُس نے دنیا میں بندے کو اختیار دیا ہے دونوں راہیں کھول دی ہیں: اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (الدھر:3) دونوں راہیں سامنے رکھ دی ہیں۔ وہ شکر گزار بندہ بننا چاہتا ہے یا ناشکرا بننا چاہتا ہے۔ کفر کرنا چاہتا ہے یا ایمان لاتا ہے یہ اس کو اختیار دیا ہے پھر وہ بڑا رحیم ہے اور اس نے اسے ایک مقررہ مدت تک مہلت دے دی ہے اور اُس پر اُسے اپنی طرف سے جو کچھ اللہ کو دینا چاہیے بندے کو وہ سارا کچھ دے رہا ہے۔ پیدا فرماتا ہے ایک ایک بدن کے ایک ایک جزو میں وہ زندگی کی، حیات کی لہر دوڑا دیتا ہے، رزق دیتا ہے عمر دیتا ہے صحت دیتا ہے اولاد دیتا ہے جو کچھ اللہ کی طرف سے ملنا چاہیے اللہ اپنا وعدہ پورا کرتا ہے اپنا عہد نبھاتا رہتا ہے اب جواباً جو کچھ بندے کو بارگاہِ الٰہی میں پیش کرنا ہے وہ نہیں کرتا تو اُس کی بدنصیبی جو کرتا ہے اسے اللہ اس کے کرنے سے کروڑوں گنا زیادہ درجہ دیتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہوتا

ہے اور مجھے بھی ڈاک آتی ہے کہ جی میں نمازیں بھی پڑھتا ہوں، روزے بھی رکھتا ہوں، صدقہ بھی بڑا دیتا ہوں، زکوٰۃ بھی دیتا ہوں لیکن ہمارا کام نہیں ہو رہا۔ بھئی نماز اللہ کو راضی کرنے کے لیے پڑھتے ہو یا کوئی کام بنانے کے لیے پڑھتے ہو؟ نیکی رضائے باری کے لیے کرتے ہو یا سودا کر رہے ہو اللہ سے کہ میں نمازیں پڑھوں گا اور تُو میرا یہ کام کر دے۔ دنیا کے کام دنیا کے طریقوں کے مطابق کئے جاتے ہیں اور یہی اسلام ہے اور شرعی طریقے سے کیے جاتے ہیں غیر شرعی ذرائع استعمال کر کے کرو گے تو وہ جرم ہو جائے گا۔ یہ جو عبادات ہم کرتے ہیں اور اُس پر ہمیں ناز ہے یہ تو ہم وہ قیمت دے رہے ہیں ان نعمتوں کی جو ہم پہلے استعمال کر چکے ہیں۔ ان عبادات پر مدارِ آخرت نہیں ہے مدارِ آخرت اللہ کی رحمت پر ہے یہ جو نماز روزہ جو عبادات اور صدقات ہم کرتے ہیں اس کا انعام ہم پہلے لے چکے ہیں۔ ارشاد ہے: يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (البقرہ:21) اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تا کہ تم (گرفت سے) بچ سکو۔ اس کا مطلب ہے کہ تخلیق اور صحت اور روزی اور رزق اور زندگی بھر کی نعمتیں جو ہم پہلے ہی لے چکے ہیں آج نیکیاں کر کے ہم یہ اُس کا شکر ادا کر رہے ہیں جو آخرت میں ملے گا وہ مزید اُس کا انعام ہوگا ہم وہ خرید نہیں سکتے آخرت خریدی نہیں جاتی۔ ایک واقعہ حدیث شریف میں آتا ہے جبرائیل امین نے عرض کی بارگاہِ رسالت میں کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا اس نے جب ہوش سنبھالی اور دین کی طرف راغب ہوا تو وہ لوگوں سے الگ ہو کر ایک جزیرے پر چلا گیا۔ اللہ نے اُس کی خوراک وہاں مہیا کر دی چشمے جاری کر دیے، پھل لگا دیے وہ چشموں سے پانی پیتا، پھل کھاتا، نماز روزہ کرتا چار سو سال زندہ رہا اور چار سو سال اُس جزیرے پر اکیلا رہا اور رات دن عبادت کرتا رہا اور اللہ اُس پر اتنے راضی تھے کہ جب اُس کی موت آئی تو اللہ نے ملک الموت کو حکم دیا کہ اس سے پوچھ لو کس حال میں مرنا چاہتا ہے اُس طرح اُس کی جان قبض کرو، ملک الموت نے پوچھا کہ آپ کس انداز میں مرنا چاہیں گے تو اُس نے کہا مجھے اجازت دو میں وضو کرتا ہوں، نفل (نیت کرتا) ہوں اور میں سجدے میں جب ہوں تو آپ میری روح قبض کر لیں میں چاہتا ہوں کہ قیامت کو جب اٹھوں تو سجدے سے اُٹھوں۔ جبرئیلؑ نے عرض کی یا رسول اللہ! میں اب بھی جب زمین پر آتا ہوں یا واپس جاتا ہوں تو میں دیکھتا ہوں کہ صدیاں بیت گئیں لیکن اس کا وجود اسی طرح سالم ہے اور اس جزیرے میں سر بسجود ہے بارش، دھوپ، گرمی، وقت اُس پر اثر نہیں کر سکا لیکن عرض کریں گے کہ یا رسول اللہ عجیب بات یہ ہے جو میں عرض کرنا چاہتا تھا کہ یومِ حشر جب یہ اُٹھے گا تو ارشادِ باری ہوگا اِذْهَبُوا بِعَبْدِي إِلَى الْجَنَّةِ بِرَحْمَتِي (شعب الایمان المستدرک علی الفتحین)

میری رحمت سے میرے بندے کو جنت میں بھیج دو تو اُس وقت وہ عرض کرے گا کہ یا اللہ بے شک

تیری رحمت بے شمار ہے لیکن چار سو سال میں نے بھی بغیر تیرے سجدوں کے اور کچھ نہیں کیا تو کچھ میرے سجدوں کی بھی کوئی قیمت ہوگی؟ تو ارشادِ باری ہوگا کہ یہ اگر عدل چاہتا ہے تو یہ تو معاوضہ تھا اُن نعمتوں کا جو میں نے دی ہیں جو وہ پہلے وصول کر چکا ہے تو اُن نعمتوں کے مقابلے میں ان سجدوں کا وزن کر لو۔ فرمایا صرف آنکھ کی بینائی رکھی جائے گی جو اُس نے چار سو سال استعمال کی دوسری طرف اُس کی ساری عبادتیں رکھی جائیں گی تو وہ کم پڑ جائیں گی اور اُس کی قیمت زیادہ ہوگی اور وہ عبادتیں اسے کم پڑ جائیں گی ایک نعمت کا بدلہ نہیں بن سکیں۔ کتنی نعمتیں انسان استعمال کرتا ہے۔ فرمایا! حکم ہوگا اگر انصاف چاہتا ہے تو اسے اتنا عرصہ جہنم میں رکھو جب تک سب نعمتوں کی قیمت پوری ہو جائے پھر بات کریں گے تب وہ عرض کرے گا بارِ الٰہا مجھ سے غلطی ہوگئی مجھے معاف کر دے تُو معاف کرنے والا ہے میں نے بہت غلط کیا تو ارشاد ہوگا اگر معافی چاہتا ہے، رحمت چاہتا ہے تو اسے جنت بھیج دو اگر عدل چاہتا ہے تو اپنا حساب پورا کر لے۔

تو یہ جو ہم کر رہے ہیں جس پر ہمیں بڑا ناز ہے کہ میں نمازیں پڑھتا ہوں پھر بھی میری دوکان نہیں چلتی تو یاد رہے کہ دکان چلتی ہے دنیا کے طریقے سے۔ نمازیں تم پڑھ رہے ہو تو تم اللہ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کر رہے ہو جو نعمتیں پہلے سے تمہارے پاس ہیں اور پھر بھی اس کی نعمتیں زیادہ ہیں اور ان نعمتوں کا شکر بھی پورا ادا نہیں ہو رہا۔ آخرت بہترین انعامات ہیں لیکن سب اُس کی عطا ہے ساری اُس کی بخشش ہے ساری اُس کی رحمت ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم گھر میں جلوہ افروز تھے تو فرمایا اللہ کی رحمت کے سوا کوئی نہیں بخشا جائے گا جو بھی بخشا جائے گا اللہ کی رحمت کے سہارے بخشا جائے گا تو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا ''یا رسول اللہ! آپ بھی؟'' فرمایا ''بے شک میں بھی''۔ عرض کیا، آپ تو شفیع المذنبین ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی شفاعت کے سہارے تو لوگ بخشے جائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ''تو کیا یہ اللہ کی رحمت نہیں ہے؟ یہ بھی تو اللہ کی رحمت ہے مجھ پر؟ یہ بھی تو اللہ ہی کا انعام ہے؟

تو وہ معاملہ اُس کی عطا پر اور اُس کی رحمت پر ہے اللہ کریم ہمیں روشن سینہ، قلبِ سلیم اور برکاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم سے سرفراز فرمائیں۔ آمین

سورۃ الشعرآء رکوع 6 آیات 105 تا 122

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۰۶﴾
اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ
مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۱۰﴾
قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ
الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۵﴾ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ
لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿۱۱۷﴾ فَافْتَحْ بَيْنِيْ
وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي
الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۱۹﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا
كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۲﴾

نوح (علیہ السلام) کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا ﴿۱۰۵﴾ جب ان کے (قومی) بھائی نوح (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا کہ کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿۱۰۶﴾ مَیں تو تمہارے لیے امانت دار پیغمبر ہوں ﴿۱۰۷﴾ تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو ﴿۱۰۸﴾ اور میں اس کام کا تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا میرا صلہ تو بس پروردگارِ عالم کے ہاں ہے ﴿۱۰۹﴾ پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو ﴿۱۱۰﴾ وہ کہنے لگے کیا ہم آپ کو مان لیں حالانکہ ہمارے بڑے گھٹیا لوگ آپ کے پیروکار

ہیں ﴿۱۱۱﴾ فرمایا مجھے خبر نہیں کہ وہ (پہلے) کیا کرتے تھے ﴿۱۱۲﴾ ان کا حساب میرے پروردگار کے ہی ذمہ ہے اگر تم سمجھو ﴿۱۱۳﴾ اور میں ایمان والوں کو نکال دینے والا نہیں ہوں ﴿۱۱۴﴾ مَیں صرف صاف طور پر (انجام بد سے) ڈرانے والا ہوں ﴿۱۱۵﴾ انہوں نے کہا اے نوح (علیہ السلام)! اگر تم باز نہ آؤ گے تو ضرور سنگسار کر دیے جاؤ گے ﴿۱۱۶﴾ نوح (علیہ السلام) نے عرض کیا اے میرے پروردگار! بے شک میری قوم نے مجھے جھٹلایا ہے ﴿۱۱۷﴾ تو آپ میرے اور ان کے درمیان حتمی فیصلہ فرما دیجیے اور مجھے اور جو میرے ساتھ ایمان والے ہیں ان کو بچا لیجیے ﴿۱۱۸﴾ سو ہم نے ان کو اور جو ان کے ساتھ بھری ہوئی کشتی میں (سوار) تھے کو نجات دی ﴿۱۱۹﴾ پھر اس کے بعد ہم نے باقی (تمام) لوگوں کو غرق کر دیا ﴿۱۲۰﴾ بے شک اس (واقعہ) میں (بھی) بڑی عبرت ہے اور ان میں اکثر ایمان نہیں لاتے ﴿۱۲۱﴾ اور بے شک آپ کا پروردگار ہی بڑا زبردست (اور) مہربان ہے ﴿۱۲۲﴾

تفسیر ومعارف

قرآن کریم میں اللہ کریم نے جو تاریخی واقعات بیان فرمائے ہیں ان سے مراد ترغیب وترہیب ہے۔ بندے کو ایمان لانے کی طرف مائل کرنا اور آخرت کے عذابوں سے، اللہ کی ناراضگی سے ڈرانا ہے۔ قرآن کریم کا موضوع تاریخ نہیں ہے لیکن تاریخی واقعات سے سمجھایا گیا ہے کہ کس قوم کا کردار کیا تھا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا لہٰذا لوگو! تم وہ کرو جس کا انجام بہتر ہوا۔ اس ضمن میں اب نوح علیہ السلام کا واقعہ بیان ہو رہا ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحِ الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۰۵﴾ نوح (علیہ السلام) کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ فرمایا گیا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے اپنے نبیؑ کا انکار کر کے گویا تمام انبیاؑ کا انکار کر دیا۔ کسی ایک نبیؑ کا انکار عقیدۂ رسالت کا انکار ہے۔ نبیؑ ہی وہ ہستی ہوتا ہے جو اللہ کے بندوں کو اللہ کی پہچان بتاتا ہے۔ اللہ کا پیغام اللہ کے بندوں تک پہنچاتا ہے تو رسالت کا انکار عظمتِ الٰہی کا انکار ہے۔ پیغمبرؑ کی تعلیم کا انکار ایسا ہی ہے جیسا اللہ کے حکم کا انکار کر رہا ہو۔ یہی یہاں فرمایا گیا کہ نوح علیہ السلام کی قوم نے بھی دوسرے کافروں

کی طرح پیغمبروںؑ کی تعلیمات کا انکار کیا۔

لوگ شرک کرتے ہیں، مختلف بتوں یا تصوراتی طاقتوں کی پوجا کرتے ہیں کیونکہ ہر بندے کے دل میں ایک جگہ ہے وہ چاہتا ہے کہ کوئی ایسی ہستی ہونی چاہیے جسے میں خوش رکھوں۔ وہ میری نگہبانی کرے، میری مشکلیں حل کرے، میری مدد کرے یہ فطرتِ انسانی ہے۔ اللہ کریم نے تخلیقی طور پر اپنی جگہ ہر دل میں رکھ دی ہے۔ یہ اس کا احسان ہے۔ عظمتِ الٰہی کو سمجھنا، یہ اللہ کی دی ہوئی بڑی استعداد ہے۔ اس لیے کوئی پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ۔ ترقی یافتہ ہو یا غیر ترقی یافتہ۔ شہروں میں رہتا ہو یا جنگلوں میں بستا ہو۔ ہر بندے کے دل میں یہ جگہ ہے۔ مذہب رکھنا فطرتِ انسانی میں ہے وہ حق ہو یا باطل۔ جو لوگ مذاہب کا انکار کرتے ہیں تو مذہب کا انکار کرنا بھی خود ایک مذہب ہے۔ کوئی بھی مذہب کے بغیر نہیں رہتا حتیٰ کہ جنگلوں میں رہنے والے قبائل بھی مذہب کے نام پر رسومات بنا لیتے ہیں۔

انبیاؑ جب مبعوث ہوئے تو انہوں نے تعلیم دی کہ دل اللہ کا گھر ہے۔ یہ اللہ کی مسند ہے، صرف وحدہٗ لاشریک کو ہی زیبا ہے کہ ساری مخلوق اس کے سامنے جھکے۔ رزق کی امید صحت کی اور تمام دنیوی ضرورتوں کی امیدیں اسی سے رکھے اور آخرت کی امید بھی اسی سے رکھے۔ نوح علیہ السلام نے بھی یہی پیغام پہنچایا لیکن ان کی قوم نے بھی دوسری کافر قوموں کی طرح اللہ کے نبیؑ کی تکذیب کی۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۰۷﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾

جب ان کے (قومی) بھائی نوح (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا کہ کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ میں تو تمہارے لیے امانت دار پیغمبر ہوں۔ تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔ اور میں اس کام کا تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا میرا صلہ تو بس پروردگارِ عالم کے ہاں ہے۔

حصول تقویٰ کی شرط، نبیؑ سے تعلق:

یہاں بڑی لطیف بات ارشاد ہوئی ہے۔ نوح علیہ السلام نے فرمایا، تم پیغمبروں کا انکار کرتے ہو جبکہ نبیؑ اور رسولؑ کا کمال یہ ہے کہ وہ تمہیں اللہ کے اتنے قریب کر دیتا ہے، تمہارا تعلق ان سے اتنا مضبوط کر دیتا ہے، تمہارے دل میں اس کو اس طرح بسا دیتا ہے کہ بات کرتے وقت، کام کرتے وقت تم سوچتے ہو کہ کہیں میری اس بات سے میرا ربّ خفا تو نہیں ہو جائے گا! یہ انتہا ہوتی ہے محبت کی، تعلق کی، اعتماد کی۔ تقویٰ کا ترجمہ 'ڈر' لکھ دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو کا دامن تنگ ہے۔ وہ اس لفظ کے مفاہیم کو ایک لفظ میں سمو نہیں سکتا اس لیے اردو

میں تقویٰ کا متبادل لفظ نہیں جو اس کے مفہوم کو ہو بہو ادا کر سکے۔ ڈر کی کئی قسمیں ہیں جیسے دشمن کا ڈر، موذی جانور کا ڈر لیکن جہاں محبت بھرے تعلقات ہوں، ان تعلقات کے خراب ہونے کا ڈر، کمزور ہونے کا ڈر یا تعلقات کے ٹوٹنے کا ڈر جو ہے وہ اگر اللہ کریم سے وابستہ ہو جائے تو اسے تقویٰ کہتے ہیں۔ اللہ کا رسولؐ آنِ واحد میں تمہیں اتنا قربِ الٰہی عطا کر دیتا ہے تو اور کیا چاہیے! فرمایا، آؤ، تمہیں اللہ کے ساتھ تقویٰ کی کیفیت عطا کریں۔ تمہیں اس دنیا کی بھی ہر نعمت مل جائے گی ساتھ میں آخرت، انعام میں مل جائے گی۔ نہ صرف اس دنیا میں آسودہ حال رہو گے بلکہ آخرت کی سرخروئی بھی نصیب ہوگی۔ دنیا میں صحت و بیماری، غربت و امارت، دکھ آرام یہ اللہ کا ایسا نظام ہے جو چلتا رہتا ہے۔ انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام پہ بھی بیماری، دکھ تکلیف آ جاتی رہی۔ تقویٰ ایسا عجیب رشتہ ہے، وہ جو رشتہ اللہ سے استوار ہو جاتا ہے وہ بندے کو اس قدر لذت آشنا کر دیتا ہے کہ ان دکھوں میں بھی لذت نصیب رہتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ شہدا سے پوچھا جائے گا کہ مانگو کیا مانگتے ہو؟ وہ عرض کریں گے بارِ الٰہا پھر سے دنیا میں بھیج دے، پھر تیرے نام پر لڑیں، سرِ مقتل قتل ہو جائیں اس قتل ہونے میں جو لذت ہے وہ پھر سے نصیب ہو۔ قتل ہونا کتنا تکلیف دہ عمل ہے لیکن جب تقویٰ نصیب ہو جاتا ہے تو زندگی میں بھی لذت، صحت میں بھی لذت، بیماری میں الگ لذت اور موت بھی لذت سوا ہے۔ دنیا میں آسودگی اور مرنے کے بعد ساری نعمتیں انعام میں مل جاتی ہیں۔ آپؐ نے یہی فرمایا کہ آؤ میں اللہ کے ساتھ تمہارا رشتہ، محبت کا جوڑ دوں اس لیے کہ میں تمہاری طرف اللہ کا امانت دار رسولؐ ہوں۔

ہر رسولؑ کی یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ امین ہوتا ہے۔ اللہ کے احکام کو پورا پورا اللہ کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ اس میں کوئی کمی کرتا ہے نہ اپنی طرف سے کچھ داخل کرتا ہے۔ ہر رسولؑ پوری امانت داری سے اللہ کی امانت، اللہ کا دین اللہ کی مخلوق تک پہنچاتا ہے۔ اس لیے اللہ سے جُڑ جاؤ اللہ کے ساتھ تعلق استوار کر لو اس کا ایک ہی راستہ ہے۔ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ میرا اتباع کر لو۔ کوئی بھی شخص نبیؑ کی اطاعت سے باہر نکل کر قربِ الٰہی حاصل نہیں کر سکتا۔ بارگاہِ الوہیت تک ایک ہی راستہ ہوتا ہے وہ ہے اطاعتِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنی تقاریر میں فرمایا کرتے تھے کہ کتنے ہی انبیا و رسل علیہم السلام دنیا میں آئے۔ وہ سب بارگاہ الٰہی کے، دبارِ الٰہی کے دروازے تھے۔ سب بند ہو چکے ہیں۔ اب قیامت تک کے لیے صرف ایک دروازہ کھلا ہے اور وہ ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع۔ آج جسے بارگاہ الٰہی میں حضوری چاہیے اسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کرنا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔۔۔ (آل عمران: 31) کہہ دیجیے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کریں گے۔ کہاں تمہاری یہ

خواہش کہ تم اللہ سے محبت کرو کہاں اس کا یہ احسان کہ وہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔

فرمایا: فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ اللہ سے ڈرو۔ اللہ سے وہ رشتہء الفت قائم کرلو جس میں بال آنے سے ڈر آئے۔ ٹوٹنا تو دور کی بات ہے اس بات سے بھی ڈرتے رہو کہ اس میں کوئی ہلکی سی دراڑ بھی نہ آجائے۔ اس کا ایک ہی راستہ ہے، میرا اتباع کرلو۔

ہر دنیا دار مال خرچ کرتا ہے کہ لوگ اس کے گرد جمع ہوں، اسے شہرت و اقتدار ملے اور دولت بھی ملے۔ ہر نبیؑ نے اس کی تردید فرمائی کہ مجھے تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہیے۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ میرے پاس لوگوں کی اکثریت ہو وہ مجھے چندے دیں یا مجھے اقتدار مل جائے۔ تبلیغ کے معاوضے میں، مَیں تم سے کچھ نہیں چاہتا۔ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ میرا معاوضہ تو اس پروردگار کے پاس ہے جو ساری کائنات کا پالنہار ہے۔ میں جس کا کام کر رہا ہوں مجھے اجرت بھی وہی دے گا۔

ایک فقہی مسئلہ:

اس لیے علمائے حق فرماتے ہیں کہ دین کے کام پر اجرت نہیں لینی چاہیے۔ اپنی روزی کمانے کے لیے دوسرے جائز ذرائع اختیار کرنے چاہیں اور تبلیغ دین کا کام اللہ کی رضا کے لیے کرنا چاہیے۔ اسی لیے آئمہ مساجد کو نماز پڑھانے کی اجرت نہیں دی جاتی۔ ان کے وقت کی اجرت دی جاتی ہے۔ نماز پڑھنا اس پر خود فرض ہے اس نے پڑھنی ہے۔ پڑھاتا ہے تو فرض ادا کرتا ہے اس کی اجرت نہیں۔ ہاں! چونکہ اسے اوقات کا پابند کر دیا جاتا ہے جس کے باعث وہ روزگار کے لیے کہیں جا نہیں سکتا تو اس کا جو وقت لیا گیا اسے پابند کر دیا گیا کہ وہ اتنا وقت دے لہٰذا اس کی اجرت دینی پڑے گی اور وہ لے تو جائز ہے۔

فرمایا، پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو لیکن قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ وہ کہنے لگا کیا ہم آپ کو مان لیں حالانکہ ہمارے بڑے گھٹیا لوگ آپ کے پیروکار ہیں۔

اب جب وہ لاجواب ہو گئے کہ یہ تو ہم سے کچھ لیتے نہیں، ہمیں بے غرض دعوت دے رہے ہیں، حق کی طرف بلا رہے ہیں تو اب عذر گھڑا کہ ہم آپ کی بات مان لیتے لیکن آپ کے ساتھ تو غریب غرباء ہی ہیں۔ آپ کے متبعین تو کمزور لوگ ہیں۔ معاشی طور پر بھی کمزور اور شہرت کے اعتبار سے بھی۔ ان کی معاشرتی حیثیت کوئی نہیں۔ ہم آپ کو مان لیتے لیکن کوئی معیار بھی تو ہو۔ انسان کم از کم اپنے برابر کے لوگوں میں تو جا کر بیٹھے۔ ان کے نزدیک معیار یہ تھا کہ جو بھی امیر ہے وہ بڑا خوش نصیب ہے۔

خوش نصیبی اللہ سے تعلق پر منحصر ہے:

اللہ کریم کے نزدیک خوش نصیبی اللہ کے ساتھ تعلق پر منحصر ہے۔ نہ غربت معیار ہے، نہ امارت۔ گروہ صحابہؓ خوش نصیب ترین طبقۂ انسانیت ہیں۔ صحابہ میں غرباء بھی تھے اور حضرت عثمان جیسے دولت مند بھی تھے۔ وہاں معیار یہ نہیں تھا کہ کس کے پاس کتنی دولت ہے بلکہ معیار یہ تھا کہ کس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے کتنا تعلق ہے۔ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم جلوہ افروز تھے، صحابہ کرامؓ بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے سے ایک صحابیؓ گزرے، ان کے لباس سے معلوم ہو رہا تھا کہ خستہ حال ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ یہ جو شخص گزرا ہے اس کے بارے تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ کیسا آدمی ہے؟

عربوں میں ایک قدیم رواج چلا آ رہا تھا کہ ہر کوئی چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی ایسے شخص سے بیاہی جائے جو آسودہ حال ہو اور اُسے بھی خوشحال رکھ سکے تو معاشرے میں جو بہت کمزور ہوتا اس کے لیے عربوں میں یہ محاورہ مستعمل تھا کہ اسے تو کوئی رشتہ بھی نہیں دیتا تو صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم! یہ تو بہت کمزور آدمی ہے یہ کسی سے درخواست کرے تو اسے کوئی رشتہ بھی نہ دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا لیکن یہ اللہ کے نام پر کسی بات پر قسم کھالے یا دعا کر لے تو اللہ اس کی بات کی لاج رکھ لے گا، اس کی بات پوری ہو جائے گی یعنی جو صحابہؓ نے عرض کیا وہ دنیوی معیار تھا کہ دنیا والے یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا گھر کیسا ہے؟ اس کے پاس کوئی سواری ہے کہ نہیں اس کے پاس دولت کتنی ہے وہ کتنا امیر ہے اتنا وہ خاندانی آدمی ہے اتنا وہ شریف ہے؟ فرمایا اللہ اُن کو دیکھتا ہے جو میرا اتباع کرتے ہیں کہ اس کے دامن میں اطاعت کتنی ہے تو فرمایا دنیوی اعتبار سے تو کوئی اسے رشتہ بھی نہ دے لیکن اللہ کے نام پر اگر یہ کوئی بات کر دے تو اللہ اس کی بات پوری کرے گا اسے نہیں ٹھکرائے گا۔

معیار یہ ہے کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ۔۔۔ اللہ سے ایسا تعلق قائم کر لو کہ پھر تمہیں اس کی خفگی کا خطرہ رہے اور اُس کا ایک ہی راستہ ہے وَاَطِيْعُوْنِ میرا اتباع کرو۔ کہنے لگے آپ کو مان لیں تو آپ کو ماننے والے تو بڑے کمزور لوگ ہیں حالانکہ وہ کمزور لوگ بھی تھوڑے سے تھے قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ فرمایا مجھے خبر نہیں کہ وہ (پہلے) کیا کرتے تھے نوح علیہ السلام نے فرمایا مجھے نہیں پتا کہ یہ لوگ کیا کرتے تھے۔ کیوں امیر نہیں ہیں؟ کیا کاروبار کرتے تھے؟ میرے پاس آنے سے پہلے کا جو حال ہے اُس کی مجھے خبر نہیں ہے نہ اس کی مجھے ضرورت ہے جب میرے پاس آئے تو اللہ کے ہو رہے اس لیے اب یہ عظیم لوگ ہیں انہوں نے فرمایا: اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ ان کا حساب میرے پروردگار کے ہی ذمہ ہے اگر تم سمجھو۔ میں

حساب لینے یا تم لوگ حساب لینے کے مجاز نہیں ہو۔ ہر فرد سے حساب میرے ربّ نے لینا ہے جس نے پیدا کیا ہے، جس نے پالا پوسا ہے، جس نے نعمتیں دی ہیں اسے حق ہے کہ وہ پوچھے کہ میں نے تو تم پر اتنے احسانات کیے تھے تم نے کیا میری عظمت کا اقرار بھی کیا یا نہیں؟ میرے نبیؑ رسولؑ کو مانا یا نہیں۔ انؑ کی اطاعت کی یا نہیں؟ یہ حق صرف اللہ کریم کو ہے وہ ان سے پوچھے گا۔ جو میرا پروردگار ہے جس نے پیدا کیا ہے جس نے انہیں زندگی دی ہے، صحت دی ہے بے شمار نعمتیں دی ہیں وہ ان سے پوچھ لے گا کہ میرے احسانات کے بدلے تم کیا کرتے رہے؟ یہ میرا منصب نہیں ہے: وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ اور میں ایمان والوں کو نکال دینے والا نہیں ہوں۔ ہاں میں یہ جانتا ہوں کہ میں کسی ایمان والے کو ردّ نہیں کر سکتا یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری بارگاہ سے نکل جاؤ کیونکہ میرا تعلق ان کی دنیوی دولت یا حسنِ صورت یا وجاہت سے نہیں ہے میرا تعلق ان کے ساتھ ایمان کا ہے۔ جب ایمان لائے تو سب مومن ہو گئے میں کسی کو نہیں کہہ سکتا کہ میری مجلس سے اُٹھ جا یا میری مجلس سے چلا جا۔

اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۵﴾ میں صرف صاف طور پر (انجامِ بد سے) ڈرانے والا ہوں۔ میرے نزدیک معیار صرف ایمان اور عمل صالح ہے۔ میرا کام ہے کہ تمام انسانوں کو اُن کے عقائد و اعمال کے نتائج سے بروقت خبردار کر دوں۔ اب ان کے پاس کوئی اعتراض بھی نہ بچا۔ یہاں بھی لاجواب ہو گئے تو پھر آخری حربہ استعمال کیا۔ آخری حربہ یہ ہوتا ہے۔ آپ کسی سے بات کر رہے ہوں۔ اُس کے پاس دلیل ہو تو دلیل دیتا رہتا ہے جب دلیل نہ ہو تو پھر لڑائی پر آجاتا ہے جب ان کے پاس دلائل ختم ہو گئے تو کہنے لگے: قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ کہنے لگے نوح (علیہ السلام) اگر تم باز نہ آؤ گے تو ضرور سنگسار کر دیے جاؤ گے۔ اے نوح (علیہ السلام) باز آجاؤ یہ جو باتیں تم کر رہے ہو اور جو باتیں ہمیں سمجھا رہے ہو ان سے باز آجاؤ او ہم جس حال میں ہیں تم بھی ایسے ہی ہو جاؤ ورنہ یاد رکھو ہم تمہیں پتھر مار مار کر قتل کر دیں گے۔ جھگڑے کی کیفیت تب آتی ہے جب دلائل میں کوئی لاجواب ہو جاتا ہے تو وہ قوم بھی یہ کہنے لگی کہ اگر آپ اس تبلیغ سے باز نہ آئے تو ہم آپ کو سنگسار کر دیں گے۔ پتھر مار مار کر قتل کر دیں گے۔ نوح علیہ السلام جب ان سے نا اُمید ہو گئے تو بارگاہِ الٰہی میں عرض گزار ہوئے۔ نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تبلیغ کی۔ ساڑھے نو سو سال مجاہدہ کیا، ایذائیں برداشت کیں، تکلیفیں اُٹھائیں، طعنے سُنے، مذاق سہا۔ ساڑھے نو سو سال بڑا لمبا عرصہ ہے آپؑ نے بڑی محنت کی، مسلسل تبلیغ میں لگے رہے اور عجیب بات ہے کہ ساڑھے نو سو سال کے بعد بھی جتنے لوگ آپ کے ساتھ تھے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اسّی

80 بیاسی 82 سے زیادہ نہیں تھے۔

پھر بالآخر آپؑ نے بارگاہِ ربوبیت میں ہاتھ اُٹھائے: قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ كَذَّبُوْنِ﴿۱۱۷﴾ اے میرے پروردگار! بے شک میری قوم نے مجھے جھٹلایا ہے۔ میری قوم نے میرا انکار کر دیا میں ساڑھے نوسو سال ان سے محنت کر چکا ہوں لیکن یہ مسلسل انکار پر ہیں اور جتنا انکار کرتے ہیں اتنا دل اور سخت ہو جاتا ہے اتنا کفر راسخ ہو جاتا ہے: فَافْتَحْ بَیْنِیْ وَبَیْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِیْ وَمَنْ مَّعِیَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴿۱۱۸﴾ تو آپ میرے اور ان کے درمیان حتمی فیصلہ فرما دیجیے اور مجھے اور جو میرے ساتھ ایمان والے ہیں ان کو بچا لیجیے۔ اے میرے پروردگار! اب اس قصے کا فیصلہ کر دے اور جس کے جو نصیب میں ہے اسے وہ دے دے۔

معیتِ رسالت، اتباعِ رسالت سے نصیب ہوتی ہے:

آپؑ نے عرض کی مجھے نجات دے اپنی پناہ میں رکھ اُس سزا سے جو ان پر وارد ہوگی، مجھے بچا لے اور جو لوگ میرے ساتھ ایمان لائے ہیں اُن کو بھی بچا لے۔ یہ انبیاؑ کے حوصلے ہیں اللہ کے رسولوں کے حوصلے ہیں۔ اولوالعزم رسول ہیں نوح علیہ السلام، عرض کر رہے ہیں جو ایمان لائے ہیں، میرے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں، جو میرے ساتھ ہیں انہیں بھی اس سے بچا لے۔ یہ اپنے عمل سے اپنے ایمان کی گواہی دے رہے ہیں۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے۔ یہ کہنا میں ایمان لایا یہ دعویٰ ہے، کردار اُس کا گواہ ہے اگر اللہ کے نبیؑ کی اطاعت کرتا ہے تو یہ اطاعت اُس ایمان کی گواہ بن گئی۔ نافرمانی کرتا ہے تو پھر شاید دعویٰ ایمان کا بھی سچ ثابت ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ عمل گواہ ہے گواہ جھوٹے ثابت ہو جائیں تو پھر دعویٰ تو ثابت نہیں ہوتا فرمایا اے میرے پروردگار مجھ پر بھی رحم فرما مجھے محفوظ رکھ اور جو میرے ساتھ ہیں انہیں بھی محفوظ رکھ۔ معیتِ رسالت نصیب ہوتی ہے اتباعِ رسالت سے اور جتنے کام اتباعِ رسالت سے ہٹ کر کیے جاتے ہیں وہ انبیاؑ کی نافرمانی ہے وہ معیت کو مجروح کرتی ہے۔

مَیں آپ کے بارے واقف نہیں ہوں آپ میرے کردار کو نہیں جان سکتے۔ ہر بندہ اپنا حساب خود کرے کہ میں رات دن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا کتنا اتباع کرتا ہوں اور کتنی نافرمانیاں کرتا ہوں اگر اتباع غالب ہے تو معیت نصیب ہوگی نافرمانی غالب ہے تو رشتہ ٹوٹ جائے گا۔

اللہ کریم نے فرمایا۔ پھر ہم نے ایسا ہی کیا۔ فَاَنْجَیْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ﴿۱۱۹﴾ سو ہم نے ان کو اور جو ان کے ساتھ بھری ہوئی کشتی میں (سوار) تھے کو نجات دی۔ ہم نے انہیں بھی نجات دی جو اُن

کے ساتھ تھے انہیں بھی بچالیا۔ایک بہت بڑی کشتی میں سوار کردیا اُس کشتی کو اُن کے بچانے کا سبب بنادیا: ثُمَّ اَغۡرَقۡنَا بَعۡدُ الۡبٰقِیۡنَ ﴿۱۲۰﴾ پھر اس کے بعد باقی تمام لوگوں کو ہم نے غرق کردیا۔اس کشتی کے علاوہ جو کچھ تھا جو کوئی بھی تھا سب کو غرق کردیا، تباہ کردیا۔

یہ بھی ایک بڑا سوال ہوتا ہے کہ طوفانِ نوحؑ جب آیا تھا تو کیا وہ سارے روئے زمین پر آیا تھا یا نہیں۔ حق یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کے زمانے تک جتنی انسانی آبادی بن چکی تھی، جہاں جہاں انسان آباد تھے وہ ساری زمینیں، پہاڑ تک بھی غرق ہوگئے یہ تو قرآن شہادت دیتا ہے اب جہاں انسانی آبادی نہیں تھی وہاں طوفان آئے یا نہ آئے اس سے بحث کرنے کا کیا فائدہ؟ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ انسان جو کام کرتا ہے اُس کا ایک اثر تو اس کی اپنی ذات پر آتا ہے۔نافرمانی کی ہے تو دل پر سیاہی طاری ہوگی۔اطاعت کی ہے تو دل میں نور آئے گا اور اُس کا ایک اثر پوری کائنات پر جاتا ہے ہم جو بات کہتے ہیں، ہم جو کام کرتے ہیں اُس کا ایک نتیجہ ساری زمین پر آتا ہے۔ اب گناہ اور کفر تو اُس ایک قوم نے کیا لیکن غرق سارے جانور بھی ہوگئے، پرندے بھی مر گئے، زمینیں بھی ڈوب گئیں اور جہاں تک انسانی آبادی تھی ہر چیز تباہ ہوکر رہ گئی۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک ارشاد ہے فرماتے ہیں کہ جنگل میں کسی چڑیا کے انڈے اگر گیدڑ کھا جاتا ہے تو کسی نہ کسی بندے کے جرم کا، گناہ کا، یہ اثر ہے کہ اللہ کی دوسری مخلوق کو بھی تکلیف پہنچتی ہے، رنج پہنچتا ہے تو یہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ جرم تو قومِ نوح نے کیا غرق ساری مخلوق ہوگئی تو گویا ہمارے کردار کا ایک اثر ہم پر ہوتا ہے ایک ساری مخلوق پر ہوتا ہے روزِ محشر ہمارے گناہوں سے جس جس کو دکھ پہنچا اُس کا جواب بھی دینا پڑے گا۔اللہ کریم معاف فرمائیں۔

فرمایا ہم نے انہیں ایک عظیم کشتی میں نجات دی اور باقی جو کچھ تھا سب کو غرق کردیا، تباہ کردیا اس لیے نوح علیہ السلام کو آدمِ ثانی کہتے ہیں کہ کشتی میں جو سوار ہوئے تھے اُن کی اولادیں بھی آگے نہیں چلیں۔صرف نوح علیہ السلام کے بچوں کی اولاد آگے چلی۔جو کشتی میں سوار تھے تو یہ باقی ساری مخلوق جو آج ہے یہ نوح علیہ السلام کی اولاد ہے اسی لیے نوح علیہ السلام کو آدمِ ثانی کہا جاتا ہے: اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَمَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۲۱﴾ بے شک اس (واقعہ) میں (بھی) بڑی عبرت ہے اور ان میں اکثر ایمان نہیں لاتے۔

فرمایا اس تاریخی واقعہ کو پڑھو اس میں عظیم دلائل ہیں کہ نافرمانی کا نتیجہ کیا ہوا، اطاعت گزاروں کو اللہ نے کیسے بچایا۔ایک ایسے طوفان سے جس میں سارے پہاڑ بھی غرق ہوگئے تھے ان کی کشتی نہ کسی پہاڑ سے ٹکرا کر پھٹی نہ ڈوبی نہ زلزلہ آیا نہ اس میں کہیں سے پانی در آیا اور وہ صحیح سلامت پہنچ گئی، نیکی و دین اور کفر کا نتیجہ یہاں دنیا میں کیا ہوا؟ وہ سامنے آگیا۔آنے والے لوگوں کے لیے یہ بہت بڑی دلیل ہے لیکن لوگ

ایسے بدنصیب ہیں۔لوگوں کی اکثریت کوایمان نصیب نہیں ہوا تھا۔ یہ سارے عبرت آموز واقعات دیکھنے کے بعد بھی، پڑھنے سننے کے بعد بھی اکثریت کو ایمان نصیب نہیں ہوتا۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۲﴾ اور بے شک آپ کا پروردگار ہی بڑا زبردست اور مہربان ہے۔اور آپ کا پروردگار آپ کا پالن ہار، غالب ہے عزیز ہے جب چاہے کائنات کوتباہ کردے جب چاہے کسی فرد کوغرقِ آب کردے لیکن تمہارے کردار کی خرابیوں کے باوجود وہ نہایت رحم کرنے والا ہے۔ وہ پھر تمہیں مہلت دیتا ہے کہ توبہ کرلو پھر تمہیں مہلت دیتا ہے کہ تم اطاعت کا راستہ اپنالو۔تم نافرمانی کرتے ہولیکن اپنی طرف سے جواُس نے (رزق) دینا ہے دیتا رہتا ہے۔ ارشادِ باری ہے: وَمَامِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔۔۔(ھود:6)اورزمین پر جوبھی کوئی چلنے پھرنے والا ہے اس کا رزق اللہ کے ذمہ ہے۔

کوئی مخلوق ایسی نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ وہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرتا ہے۔ ہرایک کوروزی رزق دے رہا ہے۔سب کو پال رہا ہے۔ وہ غالب ہے لیکن بڑا رحم کرنے والا ہے۔ مہلت دیتا ہے کہ جب تک موت نہیں آتی تیرے پاس اختیار ہے کہ میرے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دامن تھام لے۔تھامتا ہے یانہیں یہ توانسان کا اپنا فیصلہ ہے۔نہیں تھامے گا تواس کا نتیجہ بھگت لے گا۔تھامے گا تو اس کا انعام پالے گا۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۲﴾ اور بے شک آپ کا پروردگار ہی بڑا زبردست اور(مہربان) ہے۔

سورۃ الشعرآء رکوع 7 آیات 123 تا 140

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كَذَّبَتْ عَادُ ۨ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اِنِّيْ
لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۲۵﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ
اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً
تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ وَاِذَا بَطَشْتُمْ
بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۳۱﴾ وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا
تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۱۳۴﴾ اِنِّيْٓ اَخَافُ
عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۳۵﴾ قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ
مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۱۳۸﴾
فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾
وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۴۰﴾

(قومِ) عاد نے پیغمبروں کو جھٹلایا ﴿۱۲۳﴾ جب ان کے (قومی) بھائی ھود (علیہ السلام) نے اُن سے فرمایا کیا تم ڈرتے نہیں ہو ﴿۱۲۴﴾ بے شک میں تمہارا امانتدار پیغمبر ہوں ﴿۱۲۵﴾ سو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ﴿۱۲۶﴾ اور میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی صلہ نہیں مانگتا بس میرا صلہ تو جہانوں کے پروردگار کے ذمہ ہے ﴿۱۲۷﴾ کیا تم ہر اونچی جگہ پر ایک عمارت بے فائدہ (پوجا کے لیے) بناتے ہو ﴿۱۲۸﴾ اور بڑے بڑے محل بناتے ہو (شاید) تم ان میں

ہمیشہ رہنے والے ہو﴿۱۲۹﴾ اور جب کسی کو پکڑتے ہو (سزا دیتے ہو) تو ظالمانہ پکڑتے ہو﴿۱۳۰﴾ تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو﴿۱۳۱﴾ اور اس (اللہ) سے ڈرو جس نے ان (بے شمار نعمتوں) چیزوں سے تم کو مدد دی جن کو تم جانتے ہو﴿۱۳۲﴾ اس نے تمہیں چارپایوں اور بیٹوں سے مدد دی﴿۱۳۳﴾ اور باغوں اور چشموں سے﴿۱۳۴﴾ بے شک مجھے تمہارے بارے میں (بڑے) سخت دن کے عذاب کا ڈر ہے﴿۱۳۵﴾ وہ کہنے لگے کہ آپ نصیحت کریں یا نہ کریں ہمارے لیے برابر ہے﴿۱۳۶﴾ یہ تو بس اگلے لوگوں ہی کی عادت ہے﴿۱۳۷﴾ اور ہم پر کوئی عذاب نہیں آئے گا﴿۱۳۸﴾ سو انہوں نے ان کو جھٹلایا پس ہم نے ان کو ہلاک کر دیا بے شک اس (قصہ) میں بھی بڑی عبرت ہے۔ مگر ان میں اکثر ایمان لانے والے نہیں﴿۱۳۹﴾ اور بے شک آپ کا پروردگار ہی غالب (اور) مہربان ہے﴿۱۴۰﴾

تفسیر ومعارف

یہ کسی ایک قوم کا واقعہ تو نہیں۔ قوم عاد نے بھی انبیاؑ کی تعلیمات کو جھٹلایا۔ فرمایا: كَذَّبَتْ عَادُ ۨ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ قوم عاد نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔

انبیاؑ آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوئے۔ آپؑ کی اولاد اقوام اور قبائل میں بٹی ہوئی ہے۔ انبیاؑ ورسل کا تعلق بھی انہی اقوام وقبائل سے ہوتا ہے۔ یہی شرفِ انسانیت بھی ہے۔ ساری مخلوق پر انسان کو فضیلت کا شرف حاصل ہے تو اسی لیے کہ نبی انسانوں میں سے ہوئے ہیں۔ چونکہ انبیاؑ انسانوں میں سے ہوتے ہیں تو بطور خاندان کے فرد کے وہ لوگوں کے بھائی ہوتے ہیں۔ یعنی اسی خاندان کے فرد ہوتے ہیں۔ اللہ کریم جب انہیں نبوت عطا کر دیتے ہیں تو پھر وہ سارے قبیلے اور باقی انسانیت کو، جہاں تک ان کا دائرہ کار ہے سب کو دعوت الی اللہ دیتے ہیں۔ فرمایا ان کے قبیلے کے بھائی ھود علیہ السلام نے انہیں دعوت دی۔ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ مفہوم یہ ہے کہ کیا تم اللہ سے جڑنا نہیں چاہتے کہ تمہیں اس رشتہ محبت کے ٹوٹنے کا ڈر ہو؟ پہلے اللہ سے رشتہ استوار ہوگا تو ٹوٹنے کا ڈر ہوگا۔ رشتہ ہی نہیں تو پھر ٹوٹنا کیسا؟ جُڑا ہی نہیں تو ٹوٹے گا کہاں؟ فرمایا کیا تمہیں اپنے مالک، پروردگار سے غفورٌ رحیم سے جڑنا نہیں جو

تمہاری خطاؤں اور گناہوں کے باوجود تم پر نعمتیں نازل کر رہا ہے۔ تمہاری کوتاہیوں کے باوجود جو کچھ اس نے اپنے ذمہ لیا ہے وہ پورا کر رہا ہے اور جو تمہارے ذمہ ہے کیا تم وہ نہیں کرو گے؟

یہ تو جب آنکھ بند ہو گی تو آنکھ کھلے گی۔ جب قبر میں جائیں گے، برزخ میں پہنچیں گے، آخرت میں اٹھیں گے تو پتا چلے گا کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ جڑنے کا کتنا اجر ہے اور نبیؐ سے کٹ کے رہنا کتنی بڑی محرومی ہے۔

آپؑ نے فرمایا: اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ﴿۱۲۵﴾ بے شک میں تمہارا امانتدار پیغمبر ہوں۔ رسالت کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر رسولؑ امین ہوتا ہے۔ میں اللہ کی وہ امانت جو اس نے وحی کے ذریعے مجھے عطا کی ہے۔ میں مِن و عَن پوری دیانتداری سے تمہیں پہنچا رہا ہوں۔ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۲۶﴾ سو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ سے تعلق استوار کرو اور میرا اتباع کرو اور: وَ مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۲۷﴾ اور میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی صلہ نہیں مانگتا بس میرا صلہ تو جہانوں کے پروردگار کے ذمہ ہے۔ میں جو تعلیمات تمہیں پہنچا رہا ہوں اس کا معاوضہ مجھے نہیں چاہیے۔ میں تم سے کوئی معاوضہ یا اجرت نہیں چاہتا۔ میں اللہ کے حکم پر اللہ کی رضا کے لیے تم تک دین پہنچا رہا ہوں۔ میرا معاوضہ اس کی بارگاہ سے ملے گا جو ساری کائنات کو پال رہا ہے۔

قومِ عاد بڑے بڑے قدآور طاقتور اور گرانڈیل افراد تھے۔ جگہ جگہ اونچے اونچے مینار بناتے ان پر سورج کے نشان بناتے اور سورج کی پوجا کرتے تھے۔ یہ بہت ترقی یافتہ قوم تھی۔ اسی طرح نوح علیہ السلام کی قوم نے بھی بہت مادی ترقی حاصل کی تھی۔ یہ لوگ بھی بہت کاریگر تھے۔ بلند عمارات بنانے کے ماہر تھے۔ یہ پہاڑوں اور بڑی چٹانوں کو کاٹ کر ان سے بلند و بالا اور بہت نفیس محلات بنا لیتے تھے۔ آج بھی انہیں دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ آج کی جدید مشینیں اتنا صاف نہیں کاٹ سکتیں۔ وہ بڑے اونچے اونچے پہاڑ کاٹ کر کئی کئی منزلہ محلات بناتے۔ ان کے ستون دیکھیں تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے تراش کر لکڑی سے نکالا ہے حالانکہ نہایت سخت چٹان سے بنائے گئے ہیں۔ ان کو بنے کتنی مدت گزر چکی ہے۔ ان پر عذاب بھی آیا، انسان تباہ ہو گئے لیکن ان ستونوں کی گولائی تک محفوظ ہے۔ کب سے ان پر بارشیں برس رہی ہیں، دھوپ کھا رہے ہیں لیکن اب تک ویسے ہی سلامت کھڑے ہیں۔ ستونوں پر چھتیں ہیں، چھت کے آگے چھجے بنے ہوئے ہیں ان پر ڈیزائن بنے ہوئے ہیں وہ بھی اسی طرح قائم ہیں۔ کمروں کے اندر بھی نہایت صفائی سے بنے ہوئے فرش اور دیواریں ہیں۔ کتنے کاریگر لوگ تھے! اپنی عظیم مادّی ترقی کے

باوجود اتنے جاہل تھے کہ اللہ کی عظمت کو نہ پا سکے۔ اللہ کے نبیوں کو جھٹلاتے رہے اور اللہ کے پیغام کو ردّ کرتے رہے۔ ان پر پھر اللہ کا عذاب آیا۔ قومِ عاد کے بلند میناروں کو ارم کہا گیا ہے:

لفظ 'ارم' کا استعمال:

لفظ 'اِرم' دو معذب قوموں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ایک قومِ عاد کے لیے کہ ان کی اکثریت سورج کی پوجا کرتی تھی۔ اونچے اونچے مینار بنا کر ان پر سورج کا نشان بناتے انہیں ارم کہا گیا۔ دوسری قومِ ثمود کے وہ باغات جو عذاب سے تباہ ہوئے۔ عادِ ارم کو اپنے باغات پر بہت ناز تھا۔ ان باغات پر عذاب آیا، بند ٹوٹے، پانی چڑھا اور باغات تباہ ہو گئے۔ ہر شئے بہہ گئی۔ قوم بھی غرقِ آب ہو گئی۔ حیرت ہوتی ہے کہ آج مسلمان لوگ اپنی بچیوں کے نام اِرم رکھتے ہیں۔

آپؑ نے فرمایا: اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ تم یہ کیا کرتے ہو کہ خود ہی ٹیکری پر مینار بنا کر اس پر سورج کی تصویر بنا کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہو یہ تم کیا کرتے ہو؟ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ تم جو بڑے بڑے محل بناتے ہو کیا تم ان میں ہمیشہ رہنے والے ہو۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ تم ان میں رہو گے؟

دنیوی شان وشوکت کی نمائش دل کو سخت کر دیتی ہے:

دنیا کے تمام علوم وفنون میں کمال حاصل کرنا احسن کام ہے لیکن اس کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ وہ کام انسانوں کے فائدے کے لیے ہو۔ اس طرح انسان دنیوی فوائد بھی حاصل کر سکتا ہے اور آخرت کو بھی بھلاتا نہیں۔ جو لوگ محض دنیوی شان وشوکت کے لیے علوم وفنون کا استعمال کرتے ہیں ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں۔ جب دل سخت ہو جاتے ہیں تو لوگوں کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں۔ فرمایا: وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اور جب کسی کو پکڑتے ہو (سزا دیتے ہو) تو ظالمانہ پکڑتے ہو۔ جب کسی پر گرفت کرتے ہو تو بڑی ظالمانہ گرفت کرتے ہو، جس کے خلاف ہوتے ہو اسے تباہ کر دیتے ہو۔ کوئی تمہارے قابو آ جائے تو اسے برباد کر دیتے ہو۔

دل کی سختی کا علاج:

آگے دلوں کی سختی کا علاج ارشاد فرمایا: فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۳۱﴾ تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔

اللہ سے تعلق بنانا، تعلق کی حفاظت کرنا اتباع رسالت پر منحصر ہے۔

آپؑ نے فرمایا، فضول عمارتیں نہ بناؤ، غیر اللہ کی پوجا نہ کرو اور صرف گھر بنانے میں ہی نہ لگے رہو۔ تمہیں یہ چھوڑ کر چلے جانا ہے۔ ان میں ہمیشہ نہیں رہنا۔ جہاں ہمیشہ رہنا ہے وہاں کی فکر کرو۔ اللہ کریم سے جڑ جاؤ تا کہ تمہیں اللہ کی ناراضگی کا اندیشہ رہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو کہ کہیں اللہ کی بارگاہ میں مردود نہ ہو جاؤ اور اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ میری تابع داری کرلو۔

ترغیب کا ایک انداز:

فرمایا، تم تو جانتے ہو کہ تم پر اللہ کی بے پناہ نعمتیں ہیں: وَاتَّقُوا الَّذِیْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اور اس اللہ سے ڈرو جس نے ان (بے شمار نعمتوں) چیزوں سے تم کو مدد دی جن کو تم جانتے ہو اگر تم اللہ کی نعمتیں گننے لگو تو گن نہیں سکتے۔ اس نے تمہیں چار پایوں اور بیٹوں سے مدد دی اور باغوں اور چشموں سے۔ تمہیں جانور دیے جو تمہارے مالدار ہونے کا سبب ہیں۔ تمہیں بیٹے اور اولاد دی کہ تم خوشحال ہو، تو یہ نعمتیں کس نے دیں؟ یقیناً یہ سب تم پر اللہ کی عطا ہے اللہ کے ان احسانات کو شمار کرو اس کا احسان مانو۔ تمہارے پاس اس کے دیے ہوئے جانور ہیں ان کی افزائشِ نسل ہو رہی ہے۔ گائے بھینسوں، بھیڑ بکریوں کے ریوڑ اور اونٹوں کے گلّے تم لیے پھرتے ہو۔ اللہ نے تمہیں جوان بیٹے دیے ہیں۔ ایسی زمینیں عطا کی ہیں جن میں باغات ہیں۔ ان میں چشمے ہیں۔ غور تو کرو اور اگر تم اپنی نافرمانی پر اڑے رہے تو مجھے تم پر بڑے سخت دن کے عذاب کا ڈر ہے۔ میں تمہیں اس سخت دن کے عذاب سے بچانا چاہتا ہوں۔

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وہ کہنے لگے آپ نصیحت کریں یا نہ کریں ہمارے لیے برابر ہے۔ اللہ کے نبی علیہ السلام انہیں کامیابی کی طرف بلاتے رہے اور ان کا جواب یہی تھا کہ آپ ہمیں سمجھاتے رہیں یا چھوڑ دیں ہمارے لیے برابر ہے۔ ہم آپ کی بات سن ہی نہیں رہے۔ اور یہ تو بس اگلے لوگوں کی عادت ہے اور ہم پر کوئی عذاب نہیں آئے گا۔ تاریخِ انسانی میں ایسا ہوتا رہا ہے کہ انبیاؑ وعظ کرتے رہے اور نافرمان، سرکش اور متکبر لوگ انکار کرتے رہے۔ یہ قوم بھی اپنے نبیؑ کو یہی کہتی رہی کہ ہمارے دیوی دیوتا جن کی ہم پوجا کرتے ہیں یہ ہم پر عذاب نہیں آنے دیں گے۔ ہم پر عذاب نہیں آسکتا۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ سو انہوں نے ان کو جھٹلایا پس ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ مگر ان میں اکثر ایمان لانے والے نہیں۔ انہوں نے نبیؑ کا انکار کیا

تو اللہ نے ان پر تیز ہوا بھیج دی۔ وہ اسّی، نوے فٹ کے جوان تھے جن کے وجود میتیں بن گئیں۔ قرآن کریم میں آتا ہے کہ وہ یوں پڑے تھے جس طرح کھجوروں کے تنے زمین پر پڑے ہوں۔ وہ ہوا ہفتہ بھر چلتی رہی جو اتنی تیز تھی کہ انہیں اٹھا کر اوپر لے جاتی پھر پٹخ دیتی۔ انہوں نے چٹانیں تراش کر جو محل بنائے تھے انہی چٹانوں سے پٹخ پٹخ کر ان کے پرخچے اڑ گئے ہر چیز تباہ ہوگئی۔ ان کے ترقی کے دعوے، ان کی کاریگری، ان کا باطل معبودوں پر جو بھروسہ تھا وہ سب دھرے کا دھرا رہ گیا۔ اللہ نے انہیں عذاب دے کر تباہ کر دیا۔

قرآن کا ہر قصّہ روشن دلیل ہے:

قرآن کریم نے یہ واقعات کسی قصہ کہانی کے طور پر بیان نہیں فرمائے بلکہ درسِ عبرت دیا ہے۔ اقوام اور افراد کے کردار پر بحث کی گئی ہے کہ فرمانبرداری کے کیا اعلیٰ نتائج ہوتے ہیں اور نافرمانی کا کتنا بھیانک نتیجہ ہوتا ہے۔ اس میں لوگوں کے لیے نصیحت ہے کہ وہ زندگی کی مہلت کا صحیح استعمال کریں۔ ان تاریخی واقعات میں بہترین دلائل اور روشن دلیلیں ہیں کہ نافرمانی ضرور عذاب کی طرف لے جاتی ہے۔

اجتماعی عذاب نہیں آتے لیکن۔۔۔:

یہ تو اللہ کا احسان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی برکت سے اجتماعی عذاب آنا ختم ہو گئے اب اجتماعی عذاب نہیں آتے لیکن جو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی غلامی سے دور ہوتا ہے اس کے اندر وہی عذاب آجاتے ہیں۔ اس کے اندر وہی ہوائیں چلتی ہیں، وہی شعلے بھڑکتے ہیں۔ اس کے اندر اس کے ارمان اسی طرح غرق ہوتے رہتے ہیں جس طرح نوح علیہ السلام پر ایمان نہ لانے والے غرق ہوئے۔ اس کے اندر اسی طرح آندھیاں چلتی ہیں اور اس کی خواہشوں کو پٹخ پٹخ کر مار دیتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے دوری ہو تو اتنے دکھ در آتے ہیں کہ دولت ہوتی ہے، بندہ کھانا کھا نہیں سکتا۔ رات کو پرسکون نیند لے نہیں سکتا۔ دنیا بھر کے علاج کروا کر صحت نہیں پا سکتا۔ خوشی اور سکون دولت و امارت کا نام نہیں خوشی اندر کا احساس ہے۔

فرمایا، اس واقعے میں بہت بڑی دلیل ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آج بھی کوئی دامانِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم تھام لے تو اس کے اندر گلستان آباد ہو جائے گا۔ فرمایا، ہم قصہء ماضی سنا رہے ہیں تا کہ عبرت حاصل کر سکو۔ یعنی یہ نہیں کہ یہ صرف اس زمانے کی بات ہے۔ آج بھی تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی جتنی نافرمانی کرتے ہو اتنے ہی تمہارے اندر دکھ آجاتے ہیں۔ بظاہر نعمتیں ہیں لیکن دل ان کی خوشی سے محروم ہے۔ دامانِ رسالت چھوڑ دینے سے اندر خوشی نہیں

آئے گی۔ دامانِ رسالت تھام لوتو تمہیں دکھوں میں بھی لذت نصیب ہورہی ہوگی۔ بات اندر کی کیفیات کی ہے۔ دامانِ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہٹو گے تو سونے چاندی کے گھر بھی بنالوتو سکون نہیں ہوگا اور دامانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم تھام لوگے تو کٹیا میں بھی بیٹھے ہوئے شہنشاہ ہوگے۔ اندر اتنا اطمینان ہوگا کہ خود کو شہنشاہ سمجھ رہے ہوگے۔ یہ واضح دلائل ہیں انہیں آج آزما کر دیکھ لو۔ آج اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت موجود ہے۔ آج تم اطاعت اختیار کرلو اور دیکھو تمہاری کیفیات کیسے بدلتی ہیں۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۴۰﴾ اور بے شک آپ کا پروردگار ہی غالب (اور) مہربان ہے۔

بلاشبہ تمہارا رب غالب ہے چاہے تو آن واحد میں ختم کردے۔ جس طرح تم نافرمانی کرتے ہو اسی طرح وہ بھی تم پر عذاب بھیج دے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا کہ اگر ہم گرفت کرتے تو زمین پر رینگنے والا بھی کوئی نہ بچتا۔ اللہ کریم غالب ہیں لیکن رحیم ہیں۔ معاف کرتے رہتے ہیں۔ رعایت دیتے رہتے ہیں کہ انسان مائل ہو جائے، توبہ کرلے اپنی اصلاح کرلے۔ اللہ کریم پیغامِ حق کو دنیا بھر میں مسلسل پھیلائے رکھتے ہیں۔ زمین پر ہر سیکنڈ اذان بلند ہوتی رہتی ہے۔ کہیں خطبہ پڑھا جارہا ہے، کہیں مدرس پڑھا رہا ہے، کہیں وعظ ہورہا ہے کہیں کوئی تلاوت کر رہا ہے۔ ہر لمحہ اللہ کے خوش نصیب بندوں کو یہ توفیق ملی ہوئی ہے کہ انہوں نے یہ گلشن آباد کیا ہوا ہے۔ لوگو! تمہارے پاس فرصت ہے، مہلت ہے۔ توبہ کرلو اور دامان رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم کو تھام لو اور دیکھو تمہیں اللہ کا کتنا قرب نصیب ہوتا ہے۔

سورۃ الشعراء رکوع 8 آیات 141 تا 159

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۴۳﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۴۴﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ﴿۱۴۸﴾ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۵۰﴾ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۖ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۴﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۵﴾ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵۶﴾ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۷﴾ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۵۹﴾

(قوم) ثمود نے پیغمبروں کو جھٹلایا ﴿۱۴۱﴾ جب ان کے (قومی) بھائی صالح (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿۱۴۲﴾ بے شک میں تمہارے لیے امانت دار پیغمبر ہوں ﴿۱۴۳﴾ سو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو ﴿۱۴۴﴾ اور میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی صلہ نہیں مانگتا بس میرا صلہ تو جہانوں کے پروردگار کے ذمہ ہے ﴿۱۴۵﴾ کیا جو چیزیں (تمہیں) یہاں (میسر) ہیں ان میں تم

بے خوف چھوڑ دیے جاؤ گے؟﴿۱۴۶﴾ باغوں اور چشموں میں﴿۱۴۷﴾ اور کھیتوں اور کھجوروں میں کہ ان کے خوشے لطیف (ونازک) ہیں﴿۱۴۸﴾ اور تم پہاڑوں کو تراش کر اتراتے ہوئے گھر بناتے ہو﴿۱۴۹﴾ پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو﴿۱۵۰﴾ اور ان سرکشوں کا کہنا مت مانو﴿۱۵۱﴾ جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے﴿۱۵۲﴾ وہ کہنے لگے آپ پر تو جادو ہو گیا ہے﴿۱۵۳﴾ آپ بس ہماری ہی طرح آدمی ہیں اگر آپ سچے ہیں تو کوئی نشانی (معجزہ) پیش کریں﴿۱۵۴﴾ انہوں نے فرمایا یہ ایک اونٹنی ہے (بطورِ معجزہ) پانی پینے کے لیے مقررہ دن میں ایک باری اس کی ہے اور ایک تمہاری﴿۱۵۵﴾ اور اس کو بُرے ارادے سے چھونا بھی نہیں ورنہ تم کو ایک بھاری دن کا عذاب آ پکڑے گا﴿۱۵۶﴾ تو انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں پھر نادم ہوئے﴿۱۵۷﴾ سو ان کو عذاب نے آ پکڑا۔ بے شک اس میں بڑی نشانی (عبرت) ہے اور ان میں اکثر ایمان لانے والے نہیں﴿۱۵۸﴾ اور یقیناً آپ کا پروردگار ہی غالب (اور) مہربان ہے﴿۱۵۹﴾

تفسیر ومعارف

قرآنِ کریم کا اندازِ نصیحت:

قرآن کریم کتابِ ہدایت ہے اور اس کا موضوع دراصل اللہ کریم کے ساتھ تعلق ہے۔ قرآن کریم تاریخ کی کتاب نہیں ہے کہ اسے تاریخ بیان کرنے میں دلچسپی ہو بلکہ یہ اس کا اندازِ نصیحت ہے کہ جو بات بھی ارشاد ہوتی ہے اس کی تائید میں دلیل کے طور پر گزشتہ اقوام کے قصے بیان فرماتا ہے۔ سورۃ الشعراء میں بھی یہی اسلوب ہے اور یہی مضمون ہے کہ کس طرح پہلی قوموں نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات سے روگردانی کی، انکار کیا اور اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ یہ بھی جابجا دیکھنے کو ملتا ہے کہ اقوام کے حالات کے مختلف حصے مختلف انداز سے مختلف جگہوں پر بتائے گئے ہیں۔ دراصل جہاں جو بات نتیجتاً ثابت کرنا مقصود ہو وہاں وہ حصہ بیان کیا جاتا ہے۔ سو فرمایا: كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ (قوم) ثمود نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔

ثمود ایک معروف قوم تھی جس کے قصے سینہ بسینہ عربوں میں چلے آتے تھے اور لوگ ان کے حالات سے واقف تھے۔ قومِ ثمود ایک خوشحال قوم تھی جو بہت عالی شان گھر بناتے تھے۔ ان کی بہت خوشحال آبادیاں تھیں لیکن یہ لوگ اللہ کریم کی راہ سے بھٹکے ہوئے تھے۔

بعثتِ انبیاؑ، اللہ کریم کا احسانِ عظیم ہے:

اللہ کریم نے قومِ ثمود پر احسان فرمایا کہ اُن میں اُن کے قومی بھائی حضرت صالح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا جو انہی کے قبیلے سے تھے۔ فرمایا: اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ ۔۔۔ حضرت صالح علیہ السلام اسی قوم ثمود کے ہی ایک فرد تھے سو اللہ کریم نے احسان فرمایا اور حضرت صالح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔

یہ اللہ کریم کا بہت احسان ہے کہ وہ انسانوں تک انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معرفت اپنے احکام پہنچاتا ہے اور اُن کے بابرکت سینے چونکہ اللہ کے نور سے منوّر ہوتے ہیں تو تعلیمات کے ساتھ انبیاؑ کی برکات بھی ہوتی ہیں۔ جب تک کسی نبیؑ کا دورِ نبوت رہتا ہے اُن کی تعلیمات پر عمل ضروری ہوتا ہے۔ برکاتِ نبوت میں یہ کمال ہوتا ہے کہ آنِ واحد میں ایمان لانے والوں کو درجہءصحابیت پر پہنچا دیتی ہیں۔ نبوت کے بعد درجہءخلوص اور قربِ الٰہی کی کیفیات میں صحابیت انتہائی درجہ ہے۔ یہ اللہ کریم کا احسان ہے کہ اس نے مخلوق کو محروم نہیں رکھا، جب بھی جہاں بھی دین مٹتا، نیا نبیؑ مبعوث فرما دیتا حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے ساتھ نبوت کی تکمیل ہوگئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات میں وہ قوت ہے کہ یہ قیامِ قیامت تک روئے زمین پر قائم رہیں گی اور کسی نئے نبیؑ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ جب قیامت تک تعلیمات باقی رہیں گی تو پھر برکات بھی تا قیامت باقی رہیں گی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم امام الانبیاؑ ہیں اور آپ کی برکات میں بھی وہ قوت ہے کہ وہ قیامت تک جاری وساری رہیں گی۔

اس اعتبار سے ہم بے حد خوش نصیب لوگ ہیں کہ ہمیں امام الانبیاؑ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اُمت ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ہمیں وہ تعلیمات نصیب ہوئیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے لب ہائے اطہر سے ادا ہوئیں، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبانِ حق ترجمان سے بیان ہوئیں۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ ہم وہ خوش نصیب ہیں جنہیں اللہ کریم نے خیر اُمّت کہا ہے یعنی جتنی اقوام دنیا میں گزر چکی ہے اور جتنی بعد میں گزریں گی اُن میں سے سب سے بہترین اُمت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی امت ہے۔

دوسرا پہلو اس کا یہ ہے کہ ہم نے اس کو کتنا قبول کیا ہے اور ہمیں اس پر کتنا یقین ہے، یقین کا اظہار کردار سے

ہوتا ہے۔جس بات پر یقین حاصل ہو اس پر عمل کیا جاتا ہے۔سو ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہم نے اپنے آپ کو اُس قالب میں کتنا ڈھالا ہے؟ ہم اطاعت کتنی کرتے ہیں اور عدمِ اطاعت کتنی کرتے ہیں؟ یاد رہے کہ یہ عدمِ اطاعت بہت ہی بدنصیبی کی بات ہے۔اللہ کریم ہمیں توفیق دیں کہ ہمارا جینا مرنا اُٹھنا بیٹھنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی شریعتِ مطہرہ کے تابع ہو جائے۔

سب انبیاؑ کی دعوت ایک سی رہی:

سو فرمایا ثمود بڑی خوشحال قوم تھی، بہت طاقتور تھی، صحتمند تھی، اولادیں تھیں، بڑے عالی شان محلات اور مکان بنا رکھے تھے لیکن جب اُن کے پاس اللہ کے نبیؑ حضرت صالح علیہ السلام آئے تو انہوں نے نبیؑ کو جھٹلا دیا، تو فرمایا: اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾ جب ان کے (قومی) بھائی صالح (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ تم عجیب قوم ہو، جس پروردگار نے تمہیں پیدا کیا، جو یہ ساری نعمتیں عطا کر رہا ہے، صحت دے رہا ہے مال و دولت دے رہا ہے اولاد دے رہا ہے اور تم یہ بڑے بڑے گھر بنا رہے ہو تو کیا اس پروردگار سے تمہارا کوئی تعلق قائم نہیں ہے؟ کیا تمہیں اس بات سے ڈر نہیں لگتا کہ اس سے تمہارا تعلق ٹوٹ نہ جائے؟ فرمایا: اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۴۳﴾ بے شک میں تمہارے لیے امانت دار پیغمبرؑ ہوں۔ میں وہ بندہ ہوں جسے اللہ کریم نے تمہاری طرف رسولؑ مبعوث فرمایا ہے اور میں امین ہوں۔

انبیاؑ اور رسلؑ سب سے بڑے امین ہوتے ہیں کہ وہ کوئی بات اپنی طرف سے اُن تعلیمات میں داخل نہیں کرتے بلکہ وہی کچھ ارشاد فرماتے ہیں جو اللہ کریم کا حکم ہوتا ہے۔یہ بات سب انبیاؑ کرام نے جن کا ذکر آیا ہے ارشاد فرمائی کہ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۴۳﴾ یعنی یہ دو باتیں سب نے ارشاد فرمائیں ایک یہ کہ میں اللہ کا رسولؑ ہوں اور میں امین ہوں، میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا بلکہ تم تک وہ پیغام پہنچاتا ہوں جو اللہ کریم نے دیا ہے اور پوری امانتداری کے ساتھ پہنچاتا ہوں۔دوسری بات جو ہر نبیؑ نے ارشاد فرمائی وہ یہ تھی کہ اس فریضہءرسالت کی ادائیگی پر مجھے تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہیے۔دنیا میں ہم دیکھتے ہیں لوگ جماعتیں بنا لیتے ہیں اور وہ لوگ اقتدار میں آجاتے ہیں۔اسی طرح کہیں دینی جماعت اس نیت سے بنالی جاتی ہے کہ مریدوں کی ایک فوج بنالی جائے جو ووٹ تو نہیں دیں گے لیکن نذرانے اور شرینیاں تو دیں گے، پیسے تو جمع ہو جائیں گے۔سو کہیں اقتدار کا لالچ ہوتا ہے اور کہیں پیسے کا۔اللہ کریم کے نبیؑ کو پیسے سے غرض ہوتی ہے نہ ہی اقتدار سے۔اُن کا اجر اللہ کریم عطا فرماتے ہیں کہ جو نعمت وہ تقسیم

کرتے ہیں اس کا بدلہ مخلوق دے ہی نہیں سکتی۔ انہوں نے فرمایا میں اللہ کا رسولؑ ہوں تمہاری طرف مبعوث ہوا ہوں اور پوری دیانت سے اللہ کا پیغام پہنچا رہا ہوں۔ سو: فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۳۳﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ سو تم اللہ کی عظمت کا اقرار کرو، اللہ سے نسبت قائم کرو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ میری بات مانو میرا اتباع کرو۔ جو میں کہتا ہوں اس پر عمل کرو اور میں اس پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ تمہیں یہ وہم نہ ہو کہ میں تمہیں اپنے پیچھے لگا کر اقتدار پانا چاہتا ہوں یا تم سے پیسے مانگ رہا ہوں مجھے تم سے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ مجھے جو ملے گا وہ پروردگارِ عالم سے ملے گا جو سارے جہانوں کو پال رہا ہے۔ جو سب کا خالق ہے، مالک ہے، رازق ہے، تمام مخلوق کو وہ جہاں بھی بستی ہے پال رہا ہے۔ وہی ربِ کریم میرا اجر دے گا اور اپنی نعمتوں سے سرفراز کرے گا۔

دنیا کی نعمتیں عارضی ہیں:

فرمایا: اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ﴿۱۴۸﴾ کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ان خوبصورت گھروں میں، ان باغات میں اور ان نعمتوں میں ہمیشہ موج کرتے رہو گے؟ تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمیشہ یہاں مزے سے رہو گے، ایسا نہیں ہوگا۔ تمہیں یہ گھر بھی چھوڑنے ہوں گے یہ زمینیں، جائیدادیں بھی چھوڑنی ہوں گی، یہ باغات یہ کھیتیاں اور پھل دار درخت بھی چھوڑنے ہوں گے۔ یہ کھجوروں کے درخت جن کے خوشے نازک، لطیف اور مزے دار ہیں اور پھلوں سے لدے پھندے درخت پر بڑے بڑے باغات، سب کچھ چھوڑنا ہوگا اور آخرت کو لوٹنا ہوگا۔ سو اسی پر خوش نہ رہو کہ تمہارے پاس مال و منال ہے یا اقتدار ہے یہ سب وقتی باتیں ہیں اور ان سب کو چھوڑ کر ایک ابدی اور دائمی زندگی میں جانا ہے سو وہاں کی تیاری کرو۔

انسان ساری زندگی انہی امور میں مصروف رہتا ہے، گھر بناتا ہے، زمینیں سنبھالتا رہتا ہے، پھل دار درخت اُگاتا رہتا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ یہ ساری نعمتیں اللہ کریم کی عطا کردہ ہیں اور اس لیے نہیں دی گئیں کہ ان میں محو ہو کر اللہ ہی کو بھول جائے۔ انسان کو ہمیشہ یہاں نہیں رہنا کیونکہ اس کا حقیقی ٹھکانا آخرت ہے۔

اللہ کریم کا احسان ہے کہ اس نے انسان کو ایسی پابندیوں میں نہیں جکڑا کہ وہ کھانا نہ کھائے یا سوئے نہیں یا اور دوسرے امور سے روکا نہیں البتہ ایک حسین ضابطہ عطا فرمایا کہ کھانا کھائے مگر حلال ذرائع سے کمایا ہوا حلال اور طیّب کھائے۔ سونے کے وقت سوئے، جاگنے کے وقت جاگے، جائز کام کرے، جائز و حلال ذرائع اور وسائل اختیار کرے تو یہی دنیا کے کام آخرت بنا دیتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادِ عالی کا مفہوم ہے کہ مومن کی دنیا بھی دین ہے کہ وہ دنیا کے کام دین کے مطابق کرتا ہے اور دین کے مطابق کام کرنا ہی عبادت ہے۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ کے حکم کے مطابق استعمال کرنا اور ان نعمتوں سے اتنا تعلق رکھنا چاہیے جتنا ضروری ہے اور یہ یاد رہے کہ انہیں ایک دن چھوڑ کر جانا ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ سدا انہی مکانات اور پھل دار درختوں کے باغات میں رہو گے۔ یہ سب عارضی ہیں۔

گزشتہ اقوام اور ٹیکنالوجی:

فرمایا: وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ اور تم پہاڑوں کو تراش کر اتراتے ہوئے گھر بناتے ہو۔

حضرت صالح علیہ السلام نے قوم سے فرمایا کہ تمہیں اللہ کریم نے کتنے ہنر عطا کیے ہیں کہ بہترین مکان بنا لیتے ہو، باغات اُگا لیتے ہو بہترین کھیتیاں اور فصلیں حاصل کر لیتے ہو۔ اللہ نے تمہیں وہ ہنر دیا ہے کہ تم پہاڑوں اور چٹانوں کو کاٹ کر خوصورت گھر بنا لیتے ہو اور پھر تم اس پر فخر کرتے ہو کہ تم نے کتنا خوبصورت گھر بنایا ہے۔

آج عہدِ حاضر کے لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید قدیم زمانے میں کوئی مادّی ترقی نہیں تھی حالانکہ اگر اُن قدیم اقوام کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جس درجہ کی مادّی ترقی حاصل کر چکے تھے جدید زمانہ تو ابھی وہاں تک پہنچا ہی نہیں۔ وہ قومیں مادّی ترقی کے زعم میں مبتلا ہو کر، فخر و تکبر میں اللہ کو بھول گئیں، آخرت کو بھول گئی اور تباہ ہو گئیں۔

قومِ ثمود کے آثار آج بھی موجود ہیں اور اگر اُن چٹانوں کو دیکھا جائے اور اُن میں تراشے ہوئے مکان دیکھے جائیں تو آج کی جدید مشینوں اور تکنیک سے بھی ایسے گھر تراشنا آسان نہیں ہے، جو اس قوم کے عام آدمی نے اپنی رہائش کے لیے بنا لیے تھے۔

ٹیکنالوجی کا حصول:

یہاں یہ بھی سمجھ آتی ہے کہ ہنرمند ہونا، کسی فن کو جاننا یہ اللہ کا احسان ہے اور یہ اچھی بات ہے۔ اللہ کے بندوں کو ٹیکنالوجی یعنی تکنیکی مہارت حاصل کرنی چاہیے، یہ اچھی بات ہے کہ نئی نئی چیزیں ایجاد ہوتی ہیں۔ یاد رہے کہ کوئی ایجاد بنفسہٖ بُری نہیں ہوتی، اس کا استعمال کیسے کیا جاتا ہے یہ اس کی اچھائی یا برائی کا تعین کرتا ہے۔ ترقی کے زعم میں اللہ ہی کو بھول جانا، بہت بُری بات ہے۔ جہاں تک استعمال کی بات ہے تو اگر ایجادات اللہ کی اطاعت میں استعمال ہوتی ہیں، اللہ کی یاد کو بڑھاتی ہیں تو بہت اچھی ہیں اور اگر یہی اللہ سے غافل کر دیتی ہیں تو بُری ہیں۔ جب اللہ

کی راہ میں استعمال ہوں، اللہ کے حکم کے مطابق استعمال ہوں تو نعمت بن جاتی ہیں اور جب اللہ کی نافرمانی میں استعمال ہوں تو مصیبت اور اللہ کی ناراضگی کا سبب بن جاتی ہیں۔ ہنر یا فن سیکھنا، ہنرمندی اللہ کی نعمت ہے اور بنیادی طور پر تکنیکی مہارت حاصل کرنا ٹیکنالوجی سیکھنا یہ اللہ کے بندوں کا حق ہے مسلمانوں کا حق ہے۔ دنیا کی تاریخ میں بہترین ٹیکنالوجی ہمیشہ مسلمانوں نے دی ہے۔ آج کل کی معروف ٹیکنالوجی بھی مسلمان دانشوروں کی ایجادیں ہیں جن کو مزید نکھارا گیا اور مزید بہتری لائی گئی۔

انسان کی آزمائش بس اتنی ہے کہ وہ اپنے فن اور ہنر کو اللہ کی مخلوق کے لیے مفید بناتا ہے یا اس سے مخلوق کی تباہی کا سامان کرتا ہے۔

نبیؑ کی اطاعت کرو اور سرکشوں کی راہ پر نہ چلو:

فرمایا: فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۵۰﴾ پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔ فرمایا، اللہ کی عظمت کا ادراک کرو اپنے خالق سے رابطہ رکھو جس نے تمہیں اتنی نعمتیں دی ہیں اور اسی کی بارگاہ میں ایک دن حاضر ہو کر حساب دینا ہے۔ تم اس کی ذات سے اس کے احکام سے کس طرح سرکشی کر سکتے ہو؟ تم اخروی حساب سے بے فکر کیونکر ہو سکتے ہو؟ ایک ہی راستہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور تقویٰ حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۵۰﴾ میری غلامی کر لو، میرا اتباع اختیار کر لو۔ جو میں کہتا ہوں اس کو مانو اس پر یقین کرو اور عمل کرو۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اہتمام کرو کہ: وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ اور ان سرکشوں کا کہنا مت مانو۔ جو لوگ اللہ کی بارگاہ سے سرکشی اختیار کر چکے ہیں ان کا اتباع نہ کرو۔ اس لیے کہ جو اللہ کریم سے وفا نہیں کرتے، جو اس کی عظمت کا احساس نہیں کرتے اُن سے کبھی کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ سو اُن کا کہا مت مانو۔ فرمایا: الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

جو لوگ بارگاہِ الوہیت سے سرکش ہوتے ہیں وہ دنیا میں بھی فساد پھیلاتے ہیں اور کبھی اصلاح کی بات نہیں کرتے۔ اُن سے کسی خیر کی توقع نہیں ہوتی تو اگر تم اُن کے پیچھے جاؤ گے تو تم بھی فساد میں مبتلا ہو جاؤ گے، تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔ اللہ کی بارگاہ سے جو لوگ باغی ہوتے ہیں وہ کبھی اصلاح نہیں کرتے۔ کسی کے لیے مفید نہیں ہوتے بلکہ باعثِ نقصان ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کبھی بہتری کی بات نہیں کر سکتے کبھی بہتری کا کام نہیں کر سکتے بلکہ زمین پر فساد پھیلانے کے ذمہ دار ہیں۔

آج کا المیّہ:

ہمارا آج ایک قومی مسئلہ ہے کہ جس کو دیکھیں وہ اپنی پریشانیوں کا رونا رو رہا ہے۔ کسی کی بیٹی کی شادی نہیں ہو رہی کسی کی بہو ناراض ہوگئی، کسی کی تنخواہ رک گئی، کسی کا پوتا بیمار ہو گیا، کسی کو خود کوئی بیماری ہوگئی، کسی کا مکان گر گیا اور کسی کی زمین پر کسی نے قبضہ کر لیا وغیرہ۔ بہت سے خطوط آتے ہیں تو اُن میں بھی بیماریوں کی ایک لمبی فہرست ہوتی ہے۔ یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ دعا کریں میری کوئی پریشانی باقی نہ رہے۔ یہ بہت عجیب بات ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ لوگوں کو اس بات کی سمجھ کیوں نہیں آتی کہ دنیا میں بے پناہ پریشانیاں ہیں۔ اگر ایک سُکھ ملتا ہے تو پچاس دکھ اس کے ساتھ جُڑے ہوتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ دنیا میں بھی اگر سکون ہے تو اللہ کی یاد اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے اتباع میں ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً (البقرہ:208) اے ایمان والو! سارے کے سارے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ اسلام سلامتی کا قلعہ ہے، محفوظ ہے۔ یہ سلامتی کی جگہ ہے سو پوری طرح سے اس کے اندر داخل ہو جاؤ۔ اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم پوری طرح اسلام میں داخل نہ ہوں، ایک انگوٹھا، ایک انگلی اُدھر بھی رکھ دیں اور باقی باہر کھڑے رہیں۔ اس کے ساتھ ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمیں دھوپ بھی نہ لگے بارش بھی نہ گرے ہم پر آندھی بھی نہ آئے۔ بھئی تم کھڑے ہی باہر ہو صرف کھڑکی کی ایک سلاخ پکڑ رکھی ہے جس سے پتا چلے کہ تم بھی مسلمان ہو تمہارا بھی تعلق ہے۔ اس پر تو پھر دھوپ کی تپش بھی آئے گی، جاڑے کی سردی بھی لگے گی، بارش بھی لگے گی، ساری مصیبتیں آئیں گی۔ اس لیے اللہ کریم فرماتے ہیں کہ سارے کے سارے اسلام میں داخل ہو جاؤ تو محفوظ رہو گے۔ دنیا میں بھی اگر راحت ہے تو اتباعِ رسالت پناہی کے اندر ہے۔ جتنا ہم اس کے باہر ہوں گے اتنی پریشانیاں چمٹی رہیں گی۔

جو حضرات خطوط میں دعا کے لیے لکھتے ہیں ان سے گزارش ہے کہ اللہ سے وہ بھی دعا کریں اور میں بھی دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو سارے کا سارا اسلام میں داخل ہونے کی توفیق دیں اور آپ خود اس بات کو سمجھیں۔ ہم نے کلمہ پڑھ کر اقرار تو کر لیا لیکن نماز کی فرصت نہیں۔ لوگوں کو عجیب عجیب وہم ہو جاتے ہیں کہ ہم بھلے کام تو کرتے ہیں پتا نہیں ہماری نیت خالص ہے یا نہیں۔ اگر نیت خالص نہ ہو تو نیکی، نیکی ہی نہیں رہتی، نیکی کی توفیق ہی نہیں ملتی۔ اگر آدمی کی نیت ہی خالص نہ ہو تو پھر وہ نیکی کے کام اپنی بڑائی کے لیے کرتا ہے یا پیسے جمع کرنے کے لیے کرتا ہے کسی دنیوی لالچ کے لیے کرتا ہے۔ اگر کام اللہ کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی اتباع میں، آخرت کے لیے کیے جائیں تو پھر یہی

تو نیت کا خالص ہونا ہے۔ اس کے علاوہ نیت کسے کہتے ہیں! دراصل شیطان راستے میں بیٹھا کوئی نہ کوئی غلط فہمی پیدا کرتا رہتا ہے سو اپنے آپ پر اعتماد ہونا چاہیے۔ جو کام بھی کرتے ہو اللہ کی رضا کے لیے کرو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم کے مطابق کرو، آخرت کے لیے کرو تو نیتوں کا مالک اللہ ہے۔ یہی اتباعِ رسالت ہی نیت کو بھی صاف کرتا ہے، راستگی دے دیتا ہے لیکن ہمیں شاید آخرت کا اتنا پختہ یقین نہیں ہے کیونکہ دنیا ہمارے سامنے ہے ہم برت رہے ہیں اس پر ہمیں یقین ہے۔ آخرت ہماری کمزور نگاہوں سے اوجھل ہے ہمارے دماغ میں نہیں آتی اس کی خبر اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم دیتے ہیں۔ آخرت کو ہم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے سن کر، اللہ کریم کی کتاب سے پڑھ کر ماننا ہے۔ آخرت پر ہمیں وہ یقین نہیں آتا جو دنیا پر ہے کہ دنیا کے کام تو ہم بڑی محنت و مشقت سے کرتے ہیں جبکہ آخرت کے لیے خانہ پُری کرتے ہیں۔ ہر بندہ اپنے کردار کا ذمّہ دار ہے اور اُسی کے نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔ اطاعتِ الٰہی میں بھی دکھ سکھ آتے ہیں، بیماریاں اور مصائب بھی آتے ہیں لیکن جو بندہ اللہ کی اطاعت میں، حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے اتباع میں ہو تو اُسے دکھوں میں بھی مزا آتا ہے اس کے اندر ایک سکون آجاتا ہے۔ وہ دکھ میں اللہ ہی سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے، عرض کرتا ہے کہ اے اللہ! میرا یہ دُکھ دور کر دے کہ میں کمزور ہوں مجھ پر رحم فرما تو وہ مزید قربِ الٰہی اور سکون کا باعث بن جاتا ہے۔ کسی دنیا دار پر معمولی سی تکلیف بھی آتی ہے تو چونکہ اس کے پاس یہ تصور نہیں ہوتا وہ چیختا چلاتا ہے۔

لاجواب ہونے پر ثمود کی ہرزہ سرائی:

حضرت صالح علیہ السلام کی نصیحت کے جواب میں قوم نے کہا: قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ وہ کہنے لگے آپ پر تو جادو ہو گیا ہے۔ قوم سے جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو کہنے لگے کہ لگتا ہے آپ پر کسی نے جادو کر دیا ہے اور آپ کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے کہ آپ عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ بھلا یہ کیا باتیں ہیں کہ مرنے کے بعد پھر سے اُٹھائے جائیں گے اور حساب کتاب ہوگا لگتا ہے کہ آپ کا دماغ چل گیا ہے، آپ پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اکثر ایسے خطوط موصول ہوتے ہیں کہ کسی نے میری اولاد روک دی ہے، کسی نے میرا رزق روک دیا ہے، میری دکان باندھ دی ہے۔ کمال ہے! دکان اپنی ہے تو اگر بندھی ہے تو نظر آتی ہوگی کہ کس چیز سے بندھی ہے یعنی کاروبار میں غلطیاں کرتے ہیں نقصان ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں کسی نے جادو کر کے نقصان کروا دیا ہے۔ اپنی غلطی نہیں مانتے کہ یہ مجھ سے غلط ہو گیا یا یہاں مجھ سے غلطی ہوئی جس سے نقصان اٹھانا پڑا کہ کاروبار میں غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ملازمت میں کام دیانتداری سے نہیں کرتے غیر حاضریاں کرتے ہیں معطل ہو جاتے ہیں تو کہتے ہیں کسی نے نوکری باندھ دی ہے۔ یہ مشرکین اور کفار کا شعار ہے۔

ہم غلطیاں کرتے ہیں تو نتائج بھی آتے ہیں بعض اوقات ہم ایسی چیز کھا لیتے ہیں جو ہمیں بیمار کر دیتی ہے اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ جو کھایا وہ ہمارے مزاج کے خلاف تو نہیں تھا؟ کہیں گرم تاثیر کی چیز کھالی اور بخار ہو گیا یا سرد چیز کھائی جس سے زکام ہو گیا یا گلا خراب ہو گیا لیکن یہ کبھی تجزیہ نہیں کرتے اور فوراً کہہ دیتے ہیں کسی نے جادو کر دیا ہے یا فلاں نے دیکھا تھا اس کی نظر لگ گئی ہے۔ کچھ تو اللہ کا خوف کریں۔ یاد رہے اس کائنات کا مالک اللہ کریم ہے اور ہر نعمت وہ عطا فرماتا ہے جبکہ ہر دکھ ہم خود خریدتے ہیں۔ یہ بہت عجیب بات ہے کہ وہ نعمتیں مفت دیتا ہے دکھ ہم خریدتے ہیں جب اور جہاں ہم غلطی کرتے ہیں مثلاً جب غذا کے استعمال میں غلطی کرتے ہیں تو صحت خراب ہو جاتی ہے، کردار میں غلطی کرتے ہیں تو ایمان میں کمزوری آتی ہے۔ اللہ کریم کے نظام میں کسی جادوگر کو دخل اندازی کی اجازت نہیں، یہ ناممکن ہے کہ کوئی جادوگر اللہ کی بات کو روک کر اپنی بات کر دے۔ قومِ ثمود بھی یہی کہتے تھے جیسے آج کل ہم کہتے ہیں کہ کسی نے میری روزی باندھ دی ہے، کسی نے بچوں کے رشتے باندھ دیے ہیں۔ یاد رکھیں ہم تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی اُمت ہیں اور اللہ کریم کی بارگاہ میں براہ راست اپنی بات عرض کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اللہ کریم کائنات کا مالک ہے تو ہم اپنی بات اللہ سے کیوں نہیں کرتے، جادوگروں پر کیوں رک جاتے ہیں؟ اگر کوئی جادو کر بھی رہا ہے تو ہمیں اللہ کی بارگاہ میں عرض کرنی چاہیے وہ قادر ہے روک دے گا۔

چنانچہ قوم لاجواب ہو کر کہنے لگی کہ آپ (علیہ السلام) تو بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں کہ مردے زندہ ہو جائیں گے اور اُن سے حساب لیا جائے گا اور کہنے لگے: مَآ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ۔۔۔اور پھر آپ (علیہ السلام) ہماری طرح کے انسان ہی ہیں آپ بھلا نبیؑ کیسے ہو سکتے ہیں؟ جیسے ہم ہیں ویسے ہی آپ ہیں، ہماری قوم کے ہی آپ بھی فرد ہیں تو ہم تو نبیؑ نہ بن سکے آپ کیسے بن گئے؟

قوم کا خیال تھا کہ نبیؑ بشر نہیں ہو سکتا، اولادِ آدم علیہ السلام میں سے کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ کمال ہے یہ عجیب اعتراض ہے۔ اللہ کریم کی اپنی عطا ہے، جس کو یہ نعمت عطا کر دے اس کا فیصلہ ہے۔ سو انسانوں کی اصلاح کے لیے انسان ہی نبیؑ ہو گا تو انسان اس سے مستفید ہو سکیں گے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ اگر اللہ کریم فرشتوں میں سے نبیؑ بنا کر بھیجتے تو انسان اُن کو دیکھ سکتے نہ ہی اُن کی بات سن سکتے لہٰذا فرشتوں کو انسانی روپ میں ہی آنا پڑتا۔ دوسری بات یہ کہ فرشتے کو تو نیند آتی ہے نہ ہی بھوک لگتی ہے۔ اُسے اولاد کی حاجت ہے نہ ہی کسی بیماری یا تکلیف کا اندیشہ ہے۔ جب فرشتہ انسانوں کو نصیحت کرتا تو وہ کہتے کہ تم یہ باتیں کر سکتے ہو کیونکہ تمہاری زندگی میں کوئی پریشانی ہی نہیں ہے۔ تمہیں روزی کی فکر ہے نہ تمہیں بھوک لگتی ہے۔ تمہاری بیوی ہے نہ بچے ہیں تو تم ایسا کر سکتے ہو لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے جیسا تم کہتے ہو کہ ہمارے ساتھ تو یہ سارے تقاضے اور مسائل ہیں۔ ہمیں بیوی بچوں کو پالنا ہے،

صحت خراب ہو جاتی ہے بھوک بھی لگتی ہے نیند بھی آتی ہے ہم تمہاری طرح کام نہیں کر سکتے۔ اس لیے اللہ کریم نے انبیاؑ کرام کو عالمِ بشریت سے ہی مبعوث فرمایا تا کہ انسانوں کے لیے اُن کی پیروی ممکن ہو۔ انبیاؑ کے ساتھ بھی یہ تمام امور وابستہ ہیں کہ اُنہیں بھوک پیاس بھی لگتی ہے، نیند بھی آتی ہے، بیداری بھی ہے۔ اُن کی اولاد بھی ہے، خاندان وقبائل بھی ہیں، دوستیاں بھی ہیں، اللہ کی راہ میں دشمنیاں بھی ہیں تب جا کر یہ یہ مثال قائم ہوتی ہے کہ انسانوں میں سے ہی ایک انسان وہ کام خود کر رہا ہے جس کی دعوت دے رہا ہے اور اگر وہ بحیثیتِ انسان یہ ساری ذمہ داری نبھا رہا ہے تو ہمیں بھی نبھانی چاہیے۔

قومِ ثمود کا عجیب وغریب مطالبہ:

نبیؑ کی بشریت پر اعتراض کے بعد کہنے لگے: فَاْتِ بِاٰیَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۵۴﴾ اگر آپ سچے ہیں تو کوئی نشانی (معجزہ) پیش کریں۔

اگر آپ (علیہ السلام) سچے ہیں اور واقعتاً اللہ کے نبیؑ ہیں تو کوئی معجزہ دکھائیں۔ کوئی ایسی بات جو صرف اللہ کا نبیؑ دکھا سکتا ہے جو عام آدمی سے صادر نہ ہو سکتی ہو اور آپ کی نبوت کی دلیل بن جائے۔

یاد رہے معجزہ عقل کو عاجز کر دینے والی بات کو کہتے ہیں اور معجزہ اثباتِ دین کے لیے، نبیؑ کی نبوت کو ثابت کرنے کے لیے عطا ہوتا ہے۔ ایسی ہی عقل کو عاجز کر دینے والی بات جب ولی اللہ سے صادر ہوتی ہے تو کرامت کہلاتی ہے اور یہ صدورِ کرامت بھی دین کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

سو قوم نے معجزہ طلب کیا اور عجیب وغریب سی فرمائش کی۔ کہنے لگے کہ سامنے پہاڑ میں جو بڑی سی چٹان ہے ہم چاہتے ہیں کہ یہ چٹان پھٹ جائے اور اس میں سے ایک اونٹنی نکل آئے جو گابھن بھی ہو اور نکل کر بچہ بھی دے تو ہم یہ معجزہ مان لیں گے۔ اُنہوں نے اپنی دانست میں ایک ناممکن بات کی فرمائش کر دی کہ چٹان میں زندہ اونٹنی کیسے کھڑی کی جا سکتی ہے اور پھر اُسے زندہ کیسے نکالا جا سکے گا، پھر عجیب تر بات کہ وہ نکل کر بچہ بھی دے۔ سو کہنے لگے اگر آپ (علیہ السلام) سچے ہیں تو ہمیں معجزہ دکھا دیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے دعا کی بارالٰہا! یہ جاہل لوگ ہیں ان کا یہ سوال بھی جاہلانہ ہے کہ پتھر پھٹے اور اس میں اونٹنی نکل آئے اور اُسی وقت بچہ بھی دے دے۔ یہ کیا عجیب مطالبہ ہے، لیکن یہ نادان ہیں جاہل ہیں اور اگر اس سے ان کی تسلی ہوتی ہے، یہ توبہ کرتے ہیں تو اے میرے مالک! تو قادر ہے، تیرے لیے کیا مشکل ہے تُو ہر چیز کرنے پر قادر ہے تو ایسا ہی کر دے۔ اللہ کریم نے اُنؑ کی دعا قبول فرمائی اور ایسا ہی ہوا۔

معجزے کی عظمت اور حرمت:

اللہ کریم نے حضرت صالح علیہ السلام کی دعا قبول فرمالی اور معجزہ ظاہر کر دیا۔ وہ چٹان پھٹی اور اس میں سے ایک بہت بڑی اونٹنی نکل آئی جس نے باہر نکل کر بچہ بھی دے دیا۔ فرمایا: قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۵﴾ یہ لو تمہاری اونٹنی یہ اللہ کریم نے بھیج دی ہے اب تمہاری شرط پوری ہوگئی ہے۔ یاد رکھو تم نے یہ اونٹنی مانگ کر لی ہے اور یہ چٹان سے نکلی ہے تو اس کا قد کاٹھ بھی چٹان جیسا ہی ہے پورا پہاڑ کا پہاڑ ہے۔ چونکہ تم نے مانگ کر لی ہے تو تمہیں بھی ایک قربانی دینی پڑے گی۔ تمہارے پاس جو پانی کا ذخیرہ ہے جو چشموں سے آ کر جمع ہوتا ہے اور جس سے تم مویشیوں کے ریوڑوں کو پانی پلاتے ہو اب اس کا پانی ایک دن یہ اکیلی اونٹنی پیئے گی جبکہ اگلا دن تمہارا ہوگا۔ اُس دن پھر تمہارے جانوروں کے ریوڑ تمہارے اونٹوں کے گلّے سیراب ہوں گے اور پھر اس سے اگلا دن اونٹنی کا ہوگا اور ایک دن میں یہ اونٹنی سارا پانی پی جایا کرے گی۔ یہ اللہ کے جنگل سے گھاس چرے گی، تم پر اس کا کوئی بوجھ نہیں ہے۔ یہ تم نے مانگ کر لی ہے تو پانی تمہیں اپنی طرف سے دینا پڑے گا اور چونکہ یہ معجزاتی ہے اس کا عمل بھی معجزاتی ہوگا۔ فرمایا: وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ ۔۔۔ اس کو چھیڑنا یا تکلیف مت دینا، اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کرنا اور نہ ہی اسے مارنا پیٹنا یا پانی پینے سے روکنا۔ ایسا نہ ہو کہ یہ پانی پینے آئے اور تم شور مچانا شروع کر دو یا پانی میں پتھر پھینکنا شروع کر دو۔ اگر اس کے ساتھ چھیڑ خانی کرو گے تو: فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵۶﴾ پھر تمہیں بہت بڑے دن کا عذاب آ پکڑے گا۔ جس دن اللہ کریم کا عذاب آ گیا تو تمہیں پتا چلے گا کہ یہ دن تو گزرنے میں ہی نہیں آتا۔ وہ دن تمہارے لیے بہت لمبا بن جائے گا۔ جب مصیبت آتی ہے تو انسان کو یوں لگتا ہے جیسے دن سال بھر کا ہو گیا ہے۔ کسی بیمار سے پوچھیں تو اس کی رات کٹنے میں نہیں آتی جبکہ صحتمند سے پوچھیں تو کہتا ہے کہ ابھی لیٹے تھے اور سورج نکل آیا نیند بھی پوری نہیں ہوئی۔

سو عذابِ الٰہی سے ڈرو اور اب اس اونٹنی کو نہ چھیڑنا اور یہ اونٹنی چونکہ معجزہ ہے اس کی عنداللہ عظمت اور حرمت ہے۔ اگر تم میرا کہنا نہیں بھی مانو گے تب بھی جب تک یہ تم میں موجود رہے گی تم پر عذاب نہیں آئے گا۔ تم شریعت پر عمل نہ بھی کرو گے تو اس کی موجودگی میں تم پر گرفت نہیں ہوگی اور اس کے طفیل تم سے عذاب رُکا رہے گا۔ اگر تم نے اس کو تکلیف پہنچائی تو پھر تمہارے پاس تحفظ کی کوئی دلیل نہیں رہے گی اور تم پر عذاب آئے گا تو تمہیں پتا چلے گا کہ یہ دن تو صدیوں لمبا ہے جس میں عذاب نازل ہوگا۔

عذاب کو دعوت:

چونکہ وہ لوگ مزاجاً فسادی تھے انہیں یہ بات پسند نہ آئی کہ اُن کے جانور تو ایک دن پیاسے رہیں اور ایک دن وہ اونٹنی سارا پانی پی جائے۔ اس بات کا اُنہیں رنج ہوا کہ یہ کیا تماشا ہے کہ اُن کے جانور تو سیراب ہو جاتے ہیں لیکن پانی پھر بھی کھڑا رہتا ہے جبکہ اونٹنی ایک دن میں ہی سارا پانی چٹ کر جاتی ہے۔

سو: فَعَقَرُوْهَا ۔۔۔ تو انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اس کو مار ڈالا۔ بہت بڑا جانور تھا پہلے اس کی ٹانگوں پر تلواریں چلائیں جب وہ گر گئی تو اُسے مار ڈالا۔ مفسرینِ کرام لکھتے ہیں کہ اونٹنی نے جو بچہ دیا تھا وہ بھی اس کے گرتے ہی جنگل کی طرف شور کرتا ہوا بھاگ گیا۔ حضرت صالح علیہ السلام کو جب اطلاع ہوئی کہ لوگوں نے اونٹنی کو مار ڈالا ہے تو انہوں نے فوراً فرمایا کہ اس بچے کو تلاش کرو کہ وہ بھی عذاب کے ٹلنے کا سبب ہے۔ انہیں بتایا گیا کہ وہ تو جنگل کی طرف بھاگ گیا آپ علیہ السلام نے فرمایا اس کو تلاش کرو۔ وہ نہیں ملا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ اب تمارے پاس عذاب سے بچنے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔

چنانچہ اگلے دن اُن پر عذاب شروع ہو گیا اور چہرے سرخ ہونا شروع ہو گئے دوسرے دن زرد پڑ گئے اور پھر تیسرے دن سیاہ ہو گئے۔ جب عذاب کی نشانیاں شروع ہو گئیں تو: فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۷﴾ پھر بہت نادم ہوئے، بہت چلائے کہ ہم سے غلطی ہو گئی، ہم نے ظلم کیا لیکن جب عذاب کے اثرات ظاہر ہو جاتے ہیں تو توبہ کا وقت نہیں رہتا اور نہ ہی توبہ کی توفیق رہتی ہے۔ توبہ کا وقت گزر چکا ہوتا ہے ورنہ تو فرعون نے بھی غوطے آنے پر جب موت کے فرشتے دیکھے تو کہا کہ اب میں توبہ کرتا ہوں تو حکم ہوا کہ اب توبہ کی قبولیت کا وقت گزر چکا جب وقت تھا تو تم اکڑتے رہے۔

علمائے حق نے بحث کی ہے کہ گناہ گار مومن کی توبہ نزع کے عالم میں جبکہ وہ فرشتوں اور آخرت کو بھی دیکھ لے، تب بھی قبول کر لی جاتی ہے۔ کافر کو جب فرشتے نظر آ جائیں یا آخرت منکشف ہو جائے اور پھر وہ توبہ کر لے تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ گویا ایمان اتنی قیمتی دولت ہے اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کی ہمیں رات دن حفاظت کرنی چاہیے۔ مومنوں پر یہ اللہ کا احسان ہے کہ اگر وہ برزخ کے نظر آ جانے پر بھی توبہ کر لیں تو اللہ گناہ معاف کر دیتے ہیں۔

حاصل کلام:

فرمایا: فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۸﴾ بے شک اس میں بڑی نشانی (عبرت) ہے اور ان میں اکثر ایمان لانے والے نہیں۔ فرمایا! اس قصے میں بھی بہت دلائل ہیں اگر کوئی دلیل حاصل کرنا چاہے، کوئی اپنے حالات کو پرکھنا چاہے کہ وہ کس حد تک شریعت کا اتباع کر رہا ہے تو وہ اپنا دل اور

باطن سامنے رکھ کر دیکھ سکتا ہے۔ اتباعِ شریعت پر آخرت میں اللہ کا انعام تو ہے ہی اس میں دنیا کا سکون بھی ہے۔ بندۂ مومن کو بیماری وہ تکلیف نہیں دیتی جو بدکار کو دیتی ہے، مصائب اس طرح سے کڑوے نہیں لگتے جیسے کسی بدکار کو لگتے ہیں۔ مومن کو کانٹا بھی چُبھ جائے تو تلافیٔ مافات اور ترقیٔ درجات کا سبب بن جاتا ہے۔ جب کافر پر مصیبت آتی ہے تو از قسمِ عقوبات ہوتی ہے، بطور سزا ہوتی ہے اس میں دل بھی جلتا ہے۔ کافر کو بخار ہو تو صرف اس کا بدن ہی نہیں تپتا بلکہ اس کا دل بھی جلتا ہے، سو اس پر جو دکھ آتا ہے اس کے دل کو متاثر کرتا ہے۔ مومن پر اگر مصیبت بھی آجائے تو اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ اللہ کریم مومن کو ایسی پریشانی جس میں دل پھٹنے کو آجائیں نہیں دیتے۔ ان حکایات میں لوگوں کے لیے دلائل ہیں سو لوگوں کو اپنے کردار پر اور اللہ کی عطا پر نظر کر کے دیکھنا چاہیے کہ میں اس کی عطا کا شکر ادا کر رہا ہوں یعنی اس کی اطاعت کر رہا ہوں یا اس کی نافرمانی کر کے ناشکری کر رہا ہوں۔

حضرت صالح علیہ السلام کی قوم میں اکثریت ایسی تھی جو ایمان لانے والی ہی نہیں تھی۔ اللہ کریم دلوں کے حال سے واقف ہیں، فرمایا میں نے نبیؑ مبعوث کیا، میرے نبیؑ کی تعلیمات اُن کے سامنے آئیں۔ پھر خود انہوں نے معجزہ طلب کیا اور اپنی طرف سے بڑا مشکل سمجھ کر مانگا وہ بھی انہیں عطا کر دیا لیکن وہ تو ماننے والے تھے ہی نہیں وہ تو معجزہ بھی محض اعتراض کرنے کے لیے مانگ رہے تھے۔

فرمایا: وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۵۹﴾ تیرا پروردگار غالب ہے ہر چیز پر قادر ہے لیکن وہ بہت بڑا رحم کرنے والا ہے۔ اُنہیں بھی اُس نے بہت مہلت دی تمہیں بھی فرصت، صحت، گھر بار اولاد اور مال دے رکھا ہے۔ یہ سب اس کی رحمت ہے لیکن یاد رکھو اس نے یہ طریقہ کار متعین فرمایا ہے کہ نافرمانی پر سزا ہوگی اور اطاعت پر اُس کی عطا ہوگی۔ چنانچہ نافرمانی کو ترک کر دو اور اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اختیار کرو، اللہ کی کتاب کا اتباع کرو۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں اور بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

سورۃ الشعراء رکوع 9 آیات 160 تا 175

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۱﴾
اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۶۲﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ
مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۴﴾ اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ
قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿۱۶۶﴾ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۷﴾
قَالَ اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾
فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۷۲﴾
وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَاۗءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا
كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۷۵﴾

قوم لوطؑ نے (بھی) پیغمبروں کو جھٹلایا ﴿۱۶۰﴾ جب ان کے (قومی) بھائی لوط (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿۱۶۱﴾ بے شک مَیں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں ﴿۱۶۲﴾ سو اللہ سے ڈرو اور میری بات مان لو ﴿۱۶۳﴾ اور میں اس پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا میرا صِلہ تو بس (پروردگارِ عالم کے ذمہ ہے ﴿۱۶۴﴾ کیا تم اہلِ عالم میں سے لڑکوں پر مائل ہوتے ہو ﴿۱۶۵﴾ اور تمہارے پروردگار نے جو تمہارے لیے تمہاری بیویاں پیدا فرمائی ہیں ان کو چھوڑ دیتے ہو درحقیقت تم حد سے نکل جانے والے ہو ﴿۱۶۶﴾ وہ کہنے لگے لوط (علیہ السلام) اگر تم باز نہ آئے تو ضرور (شہر سے) نکال دیے جاؤ گے ﴿۱۶۷﴾ انہوں نے فرمایا

بے شک مَیں تمہارے کام سے سخت بیزار ہوں ﴿۱۶۸﴾ اے میرے پروردگار! مجھے اور میرے گھر والوں کو ان کے کاموں (کے وبال) سے نجات عطا فرمایے ﴿۱۶۹﴾ سو ہم نے ان کو اور ان کے سب گھر والوں کو نجات بخشی ﴿۱۷۰﴾ مگر ایک بڑھیا کہ پیچھے رہ گئی ﴿۱۷۱﴾ پھر ہم نے اوروں کو ہلاک کر دیا ﴿۱۷۲﴾ اور ہم نے ان پر ایک خاص قسم کا (پتھروں کا) مینہ برسایا۔ سو کیا بُرا مینہ تھا جو ان لوگوں پر برسا جن کو (انجام بد سے) ڈرایا گیا تھا ﴿۱۷۳﴾ اس میں بلاشبہ عبرت ہے اور ان میں اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں ﴿۱۷۴﴾ اور بے شک آپ کا پروردگار ہی غالب (اور) مہربان ہے ﴿۱۷۵﴾

تفسیر ومعارف

انبیاء مقصدِ حیات سمجھاتے ہیں:

دنیا میں جو اللہ کے نبیؑ مبعوث ہوتے ہیں وہ بنیادی طور پر انسانوں کو اُن کا مقصدِ حیات سمجھاتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ دنیا کی زندگی ایک آزمائش اور امتحان ہے اور ہمارے سامنے ہمارا گھر یعنی آخرت ہے لہٰذا جو صحیح سمت میں سفر کرے گا وہ اپنے گھر پہنچ جائے گا۔ سفر سے مراد ہے دنیا کے اعمال و کردار اور اعمال و کردار کی صحت کے لیے صحتِ عقیدہ بنیاد ہے۔ اگر عقیدہ درست نہ ہو تو یہ امید رکھنا کہ کردار صحیح ہوگا، یہ ناممکن ہے۔ جب بنیاد ہی غلط ہو تو اُس پر صحیح عمارت کیسے بن سکتی ہے تو انبیاؑ علیہم الصلوٰۃ والسلام عقیدے کی دعوت دیتے ہیں اور پھر پوری زندگی کا نصاب سمجھاتے ہیں کہ اس عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنی ہے تو یہ کرنا ہے یہ نہیں کرنا۔

عقیدہ ذاتِ باری پر ایمان لانے کا ایک خانہ ہے جو ہر انسان میں فطری طور پر موجود ہے چونکہ لوگ عقیدے کی جگہ کچھ غلط نظریات رکھ لیتے ہیں یا اس خانہ میں فرضی خداؤں کو بیٹھا لیتے ہیں یا بت رکھ لیتے ہیں۔ جب بنیاد ہی غلط ہو جاتی ہے تو پھر اُن کا سارا کردار غلط ہو جاتا ہے۔

ہمارے ہاں ایک غلط فہمی بہت رواج پا چکی ہے کہ اکثر مسلمان بھائی یہ کہتے ہیں کہ کافر قومیں بڑی دیانت داری سے کام کرتی ہیں یاد رہے کہ اُن کی دیانتداری بھی دنیا کے لیے ہے۔ وہ کوئی چیز ایجاد کرتے ہیں کوئی دوا ایجاد کرتے ہیں ان دواؤں سے اربوں کماتے ہیں۔ اتنے دیانتدار ہیں کہ پانچ چھ سال ایک دوا کے اشتہار آتے رہتے

ہیں جب خوب پیسہ کما لیتے ہیں پھر کہہ دیتے ہیں یہ دوا اچھی نہیں تھی اس کے بدلے اب یہ ہے۔ یعنی وہ اس انداز سے بے ایمانی کرتے ہیں کہ ہمارے لوگوں کو سمجھ بھی نہیں آتی۔ جب ایمان نہ ہو تو دیانت و امانت کہاں سے آ گئی؟ وہ جو بظاہر دیانت و امانت نظر آتی ہے وہ کسی دنیوی فائدے اور لالچ کے لیے کی جاتی ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی محفل میں ہم حاضر تھے، قاضی ثناء اللہ (مرحوم) بھی موجود تھے۔ قاضی صاحب سادہ اور ضعیف انسان تھے۔ حاضرین میں سے کسی نے نہرو کے بارے بات کی جو ہندوستان کا وزیر اعظم تھا اور انہی دنوں مرا تھا کہ وہ بہت دانشور اور عقل مند سیاستدان تھا۔ قاضی صاحب (مرحوم) اپنے دھیان میں بیٹھے تھے لیکن اس بات پر چونک گئے اور انہوں نے سر اٹھا کر کہا، کیا کہہ رہے ہو؟ بہت عقلمند تھا؟ وہ خاک عقلمند تھا؟ عقلمند ہوتا تو ایمان لے آتا۔ یہ خاک عقلمند تھا جو ہندو مر گیا۔ سو انسان کی یہ جہالت ہے کہ فرضی خداؤں سے اس خانے کو پُر کر لیتا ہے۔ انبیاؑ جب آتے ہیں تو انسان کی بنائی ہوئی یہ ساری عمارت عقیدے سے لے کر کردار تک ڈھا دیتے ہیں کیونکہ یہ غلط تعمیر ہوئی ہے۔ وہ سمجھاتے ہیں کہ فرضی خداؤں کو دلوں سے نکال کر اللہ ربّ العزت پر ایمان لاؤ اور پوری زندگی اللہ کے نبیؐ کی تعلیمات کے مطابق ڈھال لو۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں یہ نعمت نصیب ہوتی ہے، ایمان نصیب ہوتا ہے۔ ورنہ ہر آدمی اپنے طرزِ حیات پر مُصر ہوتا ہے اور کوئی بھی خود کو غلط نہیں سمجھتا بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں ہی ٹھیک کر رہا ہوں۔ یوں لوگوں کی اکثریت انکار کر دیتی ہے کہ ہم کیوں کسی کے کہنے پر سارا نظامِ حیات، عقیدے سے لے کر عمل تک بدلیں!

ہمارا عالم تو یہ ہے کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت قبول کر لی، ساری ضروریات دین مان لیں لیکن اس کے باوجود ہم شریعت پر عمل نہیں کرتے بلکہ اپنی مرضی پر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہماری بخشش ہو جائے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت اور قوم کا جواب:

فرمایا: كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ لوگوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی تعلیمات کا بھی انکار کر دیا اور انبیاؑ کی دعوت ایک ہی ہوتی ہے۔ اس سورۃ میں اب تک بہت سے انبیاؑ کا ذکر خیر گزر چکا ہے اور آگے جن کا آ رہا ہے سب کی ایک ہی دعوت تھی۔ فرمایا: اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ جب اُن کے قومی بھائی لوط علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تمہیں اللہ سے حیا نہیں آتی؟ وہ جو تمہارا خالق ہے، رازق ہے تم اس پر یقین نہیں رکھتے نہ ہی اس پر اعتماد کرتے ہو۔ تم اُس کو نہیں مانتے؟ تم اس سے بغاوت کر کے زندگی گزارتے ہو تو کیا تم اپنے کردار کے

نتیجے سے بے خوف ہو گئے ہو؟ اَلَا تَتَّقُوْنَ۔۔۔ تمہیں اللہ سے حیا نہیں آتی؟

فرمایا: اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۶۳﴾ میں اللہ کی طرف سے تمہارے پاس بھیجا ہوا اللہ کا رسول ہوں اور امانت دار ہوں۔ یعنی رسالت اور امانت جُڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر رسولؑ امین ہوتا ہے کہ اللہ کا کوئی رسولؑ یا نبیؑ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا بلکہ پوری امانت و دیانت سے اللہ کے احکامات اللہ کی مخلوق تک پہنچاتا ہے۔ فرمایا: فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۶۴﴾ سو اللہ جل شانہٗ سے اپنا تعلق درست کرو فَاتَّقُوا اللّٰهَ ۔۔۔ اللہ کریم سے اپنے تعلقات صحیح کر لو اور یہ کیسے درست ہوں گے وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۶۴﴾ جب وہ اپنے نبیؑ کی اطاعت کرے گا تو اس کا تعلق اپنے اللہ سے قائم ہو جائے گا، درست ہو جائے گا کہ اطاعتِ پیغمبرؑ کے باہر کوئی ایسا راستہ نہیں جو بارگاہِ الوہیت کو جاتا ہو۔ سارے راستے گمراہی کے ہیں، بربادی کو، جہنم کو جاتے ہیں، ناکامی کو جاتے ہیں۔ کامیابی کا راستہ صرف ایک ہے کہ اللہ کے رسولؑ کا اتباع خلوصِ دل سے کیا جائے اور پوری محنت سے کیا جائے۔ فرمایا: وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۴﴾

رسالت و نبوت اپنا کوئی بدلہ دنیاداروں سے نہیں مانگتی۔ اللہ کے نبیؑ ماننے والوں سے کچھ نہیں چاہتے اور نہ ہی کوئی ماننے والا اُن کا اجر دے سکتا ہے۔ جتنا عظیم کام وہ سرانجام دیتے ہیں کہ بندوں کو واصل باللہ کرتے ہیں اس کا معاوضہ کوئی دے ہی نہیں سکتا۔ فرمایا، میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا، مجھے تم سے کسی بدلے کی، دولت یا اقتدار کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ میں اللہ کا کام کر رہا ہوں جو کائنات کے ایک ایک ذرّے کا خالق ہے، اُسے قائم رکھنے والا ہے، اُسے پالنے والا ہے۔ میں اس کا کام کر رہا ہوں جو رب العالمین ہے، تمام جہانوں کا پالنہار ہے مجھے معاوضہ بھی وہی دے گا۔ میرا اجر اس ذات کے ذمے ہے جو کائنات کو پال رہا ہے جس کی بارگاہ میں کوئی کمی نہیں ہے اور جس کا پیغام میں لایا ہوں۔

آج کل تو یہ رواج ہو گیا ہے کہ کسی کو وعظ کہنا آ جائے تو وہ پندرہ منٹ کی تقریر کے پندرہ ہزار لے لیتے ہیں بلکہ لاکھوں میں معاوضہ لیتے ہیں۔ بلکہ یہ طے کیا جاتا ہے کہ گھنٹہ بھر تقریر کریں گے ہوائی جہاز کا ٹکٹ دیا جائے، کسی اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں قیام کا بندوبست کیا جائے اور اتنا معاوضہ دیا جائے۔ یاد رہے اللہ کا دین برائے فروخت نہیں ہے۔ اگر دین کا کام آپ سے نہیں ہو سکتا تو نہ کریں اس پر معاوضہ لینے کی کیا ضرورت ہے۔ انبیاؑ کا اور خاصانِ خدا کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کا کام اللہ کے لیے کرتے ہیں اور اپنا روزگار معروف ذرائع سے حاصل کرتے ہیں۔

حضرت لوط علیہ السلام نے قوم سے فرمایا: اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۵﴾ کیا تم اہلِ عالم میں سے لڑکوں پر مائل ہوتے ہو دنیا میں تم واحد قوم ہو جو لڑکوں کی طرف مائل ہوتے ہو۔ اُن سے بدکاری کرتے ہو ایسا تو

دنیا کی کوئی قوم نہیں کرتی۔تم کیسے عجیب لوگ ہو کہ تم نے غیر فطری عمل کو زندگی کا شعار بنالیا ہے اور دنیا میں ایک تم ہی ہو جو لڑکوں سے برائی کرتے ہو، غیر فطری عمل کرتے ہو۔ فرمایا: وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۔۔۔اور اللہ نے جو تمہارے جوڑے بنائے تھے تمہیں بیویاں عطا کیں ایک تمہارے برابر کی مخلوق پیدا کی، اُسے تم نے چھوڑ دیا۔اس لیے کہ: بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿۱۶۶﴾ تم حد سے گزر جانے والی قوم ہو۔تم حد سے گزر چکے ہو۔ایک عجیب بات قابل غور ہے کہ جتنی قومیں تباہ ہوئیں اُن کا کسی ایک برائی میں حد سے بڑھے ہوئے ہونے کا تذکرہ قرآن میں ملتا ہے۔جیسے لوط علیہ السلام کی قوم میں لڑکوں کے ساتھ بدکاری عام تھی تو اس کا ذکر کیا گیا۔آج اگر ہم بحیثیتِ مسلمان اپنے کردار پر نظر کریں تو گزشتہ اقوام میں جو ایک ایک انفرادی برائی تھی ان سب کو جمع کرلیں تو من حیث القوم ہم میں ہر برائی موجود ہے۔شاید ہم نے کبھی اس پر غور نہیں کیا، توجہ ہی نہیں دی۔

سوانہوں نے فرمایا کہ تم عجیب قوم ہو کہ مرد، مردوں سے برائی کرتے ہو۔اللہ نے انسانوں کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے تمہارے لیے بیویاں پیدا کی ہیں اور تم پر شرعی طریقے سے اُن سے نکاح کرنا حلال کیا ہے۔پھر اُن سے آگے نسلِ انسانی چلتی ہے، تم کدھر نکل گئے ہو، حد سے گزر گئے ہو۔حضرت لوط علیہ السلام نے اس قبیح فعل کی برائی اور نقصان بھی بتایا، اللہ کی نافرمانی سے بھی ڈرایا لیکن جب اُن کے پاس جواباً کوئی دلیل نہیں تھی تو وہ لڑائی پر اتر آئے۔ کہنے لگے: قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۷﴾ اے لوط! اگر تم اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں اور تمہارے ماننے والوں کو جو چند افراد ہیں، سب کو شہروں سے نکال دیں گے۔تم اپنی الگ بستیاں بساتے پھرنا اپنے شہر بنالینا جو نیکوکاروں کے شہر ہوں گے۔ہم تمہیں اپنے شہروں سے بے دخل کردیں گے۔حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا: قَالَ اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ تمہارے کردار سے میں بہت بیزار ہوں۔میں تم جیسے لوگوں میں رہنا خود بھی پسند نہیں کرتا۔مجھے تمہارے ساتھ رہنے میں خوشی ہے نہ ہی مسرت ہے بلکہ تم مجھے کیا نکالو گے میں خود تم سے الگ رہنا چاہتا ہوں۔میں تو تمہیں اللہ کا پیغام پہنچا رہا ہوں کہ توبہ کرو اور میری اطاعت کرلو تو یقیناً ہدایت پاجاؤ گے۔اگر تم اپنے اسی کردار پر رہنا چاہتے ہو تو میں تمہارے کردار سے بے زار ہوں اور تم مجھے شہروں سے کیا نکالو گے میں ایسے شہروں میں رہنا پسند ہی نہیں کرتا۔میں تو اللہ کے حکم سے پابند ہوں کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ تم تک اللہ کی بات پہنچادوں، سو میں پہنچا رہا ہوں ورنہ مجھے تمہارے درمیان رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام نے پھر دعا فرمائی: رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ اے اللہ! مجھے اور میرے گھر والوں کو نجات عطا فرما۔اے اللہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں یہ اپنے لیے ایک عمیق گڑھا کھود رہے ہیں جس میں بالآخر سر کے بل گریں گے تو ہم چونکہ انہی کے شہروں میں مل جل کر رہ رہے ہیں تو جب ان پر آپ کی گرفت آئے تو مجھے اور

میرے گھر والوں کو محفوظ رکھنا۔ اب 'اہل' سے مراد صرف اہل خانہ نہیں ہے بلکہ جتنے لوگ آپؑ پر ایمان لائے، وہ کم تھے یا زیادہ، جنہوں نے آپ علیہ السلام کی اطاعت اختیار کی وہ سب اس 'اہل' میں شامل ہیں۔ جب عذاب آیا تو جن لوگوں کو بچایا گیا اُن میں صرف لوط علیہ السلام کے اہل خانہ نہیں تھے بلکہ وہ لوگ بھی تھے جو اُن پر ایمان لائے اور اطاعت کرتے تھے۔ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ سو ہم نے اُن کو اور اُن کے سب گھر والوں کو نجات بخشی۔

اللہ کے عذاب جب آتے ہیں تو اجتماعی طور پر جو لوگ برائی کو برا نہیں سمجھتے وہ بھی برائی کرنے والوں کے ساتھ تباہ ہو جاتے ہیں۔ سو فرمایا: اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ مگر ایک بڑھیا کہ پیچھے رہ گئی۔ پھر ہم نے اوروں کو ہلاک کر دیا۔

فرمایا، حضرت لوط علیہ السلام کی اہلیہ اطاعت نہیں کرتی تھی گو رہتی اُنؑ کے ساتھ تھی لیکن اس کا دل اس قوم کے ساتھ تھا چنانچہ اُنہی کے ساتھ ہلاک ہوئی۔ اس کی نجات نہ ہو سکی کہ وہ جسمانی طور پر اللہ کے نبیؑ کے گھر پر رہتی تھی جبکہ روحانی اور قلبی طور پر اس کا رابطہ اس قوم کے ساتھ تھا۔ سو جدھر قلبی تعلق تھا ادھر ہی گئی۔ وہ بھی قوم کے ساتھ عذاب کی نذر ہو گئی، تباہ ہو گئی، ہلاک ہو گئی۔

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ بات کردار پر ہے اور کردار ویسا ہوتا ہے جیسا دل چاہے کہ انسان وہی کرتا ہے جو اس کا دل چاہتا ہے۔ اگر دل نبیؑ کی نافرمانی پر خوش ہے تو پھر فرمانبرداروں میں شمار ہونا مشکل ہے۔ ہم بھی غلامی کا دعویٰ تو کرتے ہیں، اُمتی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن بات دعووں پر نہیں ہوتی کہ دیکھا کردار جاتا ہے کہ بندے کا دل کدھر الجھا ہوا ہے۔ اس خاتون کا دل چونکہ کفار کے ساتھ تھا لہٰذا اُن کے ساتھ تباہ ہو گئی۔ سب نافرمانوں کو اللہ نے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا اور ہلاک بھی کیسے کیا: وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۔۔۔ ہم نے اُن پر ایک خاص قسم کے پتھروں کا مینہ برسایا اور: فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۳﴾ جنہیں اس انجامِ بد سے ڈرایا گیا تھا، باخبر کیا گیا تھا لیکن وہ نہ مانے تو یہ مینہ انہی پر برسا اور اُن کا انجام بہت ہی برا ہوا، وہ تباہ کر دیے گئے۔

امام ابوحنیفہؒ نے یہاں سے اخذ کیا ہے کہ اگر کوئی مرد کسی مرد یا لڑکے سے بدفعلی کرتا ہے تو اس کو یہی سزا دی جائے جو اللہ نے اُس قوم کو دی تھی۔ اُسے یا تو بہت بلندی سے گرا دیا جائے یا اس کے اوپر کوئی دیوار گرا دی جائے اور ہلاک کر دیا جائے۔ یہ سزا ہے مرد سے بدفعلی کرنے کی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے نزدیک اور رہی عورت کی بات تو بیوی بھی شرعی طریقے سے ہی حلال ہے۔

اگر کوئی اپنی حلال بیوی سے بدکاری کرتا ہے اور اس میں بیوی کی مرضی بھی شامل ہو تب بھی وہ سزا کا مستحق ہوگا، اس پر حد جاری ہوگی۔ اپنی منکوحہ بیوی سے بھی غیر فطری عمل جائز نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے

مردوں اور عورتوں پر لعنت فرمائی ہے کہ دونوں ملعون ہیں۔ جو بھی ایسا کرتا ہے مرد بھی اور عورت بھی اگر پکڑے جائیں اور مجرم ثابت ہو جائیں تو اُن کی سزا بھی وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔

اللہ کریم نے قومِ لوط کو یہ سزا دی کہ فرشتے نے اُن کے شہروں کو زمین کی ساتویں تہہ تک اُکھیڑ کر وہ خطہء زمین اٹھالیا اور آسمان کے اتنے قریب لے گیا کہ جتنے فاصلے سے مرغ کی اذان سنائی دیتی ہے پھر وہاں سے الٹ کر انہیں پھینک دیا۔ اُن پر پتھروں کی بارش ہوئی جو خاص قسم کے تھے۔ آج بھی وہ جگہ ہے جہاں کبھی وہ آباد تھے۔ اُن کے غرق ہونے سے ایک بہت بڑا گڑھا بن گیا اور اس میں دریا آ کر گرتے ہیں۔ وہ ایک بڑی جھیل، ایک بحیرہ بن گیا ہے جسے بحیرۂ مردار کہتے ہیں کہ اس میں کوئی چیز زندہ نہیں رہتی۔

حاصلِ کلام:

فرمایا: اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۷۴﴾ اس میں بہت سے دلائل ہیں نشانیاں ہیں کہ اللہ کی عظمت کا انکار کرنے پر اللہ کے نبیؑ کی نافرمانی پر کتنی عبرتناک سزائیں ہیں۔ یہ تو دنیا میں ہیں، آگے آخرت میں ہمیشہ کے لیے کیا عذاب بھگتیں گے وہ ابھی آنے ہیں۔ اگرچہ ان قصوں میں بہت بڑے دلائل ہیں لیکن لوگوں کی اکثریت مان کر نہیں دیتی اور ایمان نہیں لائی۔

فرمایا: وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۷۵﴾ اور یقیناً آپ کا پروردگار غالب ہے۔ جب چاہے، جو چاہے کر سکتا ہے۔ کوئی بھی اس کی گرفت سے بھاگ نہیں سکتا کوئی اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔ اس کی قدرتِ کاملہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے لیکن وہ الرَّحِیْمُ ہے۔ بہت رحم کرنے والا ہے کہ جو لوگ دنیا میں گناہ کر رہے ہیں یہ اس کی رحمت ہے کہ وہ اُن پر گرفت نہیں کر رہا لیکن وہ یہ نہ سمجھیں کہ اُن کا کوئی کچھ کر نہیں سکتا۔ وہ غالب ہے جب چاہے جس عمل پر چاہے گرفت کر لے جس سے کوئی بچ کر بھاگ نہیں سکتا، کہیں چھپ نہیں سکتا۔ وہ غالب ہے لیکن وہ بہت مہربان بھی ہے۔

سورۃ الشعراء رکوع 10 آیات 176 تا 191

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ اِنِّيْ
لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ
اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ
الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۲﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ
اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ
وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۸۴﴾ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ
مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۸۶﴾ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ
اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۷﴾ قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ
فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۸۹﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۹۱﴾

بَن کے رہنے والوں نے (بھی) پیغمبروں کو جھٹلایا ﴿۱۷۶﴾ جب ان سے شعیب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں؟ ﴿۱۷۷﴾ بے شک مَیں تمہارے لیے امانت دار پیغمبر ہوں ﴿۱۷۸﴾ پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو ﴿۱۷۹﴾ اور میں تم سے اس کام کا کوئی صلہ نہیں مانگتا، میرا صلہ تو بس پروردگارِ عالم کے ذمہ ہے ﴿۱۸۰﴾ تم لوگ پورا ناپا کرو اور (صاحبِ حق کا) نقصان نہ کیا کرو ﴿۱۸۱﴾ اور سیدھی ترازو سے تولا کرو ﴿۱۸۲﴾ اور لوگوں کا ان کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو اور زمین میں فساد مت مچایا کرو ﴿۱۸۳﴾ اور اس سے ڈرو جس نے تم کو اور تمام

اگلی مخلوقات کو پیدا فرمایا﴿۱۸۴﴾ وہ کہنے لگے بے شک آپ پر جادو کر دیا گیا ہے﴿۱۸۵﴾ اور آپ ہماری طرح صرف (عام) آدمی ہیں اور ہم آپ کو جھوٹے لوگوں میں سے خیال کرتے ہیں﴿۱۸۶﴾ اگر آپ سچے ہیں تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دیں﴿۱۸۷﴾ انہوں نے فرمایا تمہارے اعمال کو میرا پروردگار خوب جانتا ہے﴿۱۸۸﴾ سو وہ لوگ ان کو (برابر) جھٹلاتے رہے پس ان کو سائبان کے دن کے عذاب نے آ پکڑا۔ بے شک وہ بہت بڑے دن کا عذاب تھا﴿۱۸۹﴾ بلاشبہ اس میں بڑی عبرت ہے۔ اور ان میں اکثر ایمان لانے والے نہیں﴿۱۹۰﴾ اور بے شک آپ کا پروردگار ہی غالب (اور) مہربان ہے﴿۱۹۱﴾

تفسیر ومعارف

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم:

فرمایا: كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ اسی طرح جنگلوں میں رہنے والے لوگوں نے اللہ کے رسولوں ؑ کی تعلیمات کا انکار کیا۔ یہ لوگ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم تھی اور جہاں یہ رہتے تھے اُن کے گردا گرد بہت بڑے جنگل تھے اس لیے اُن کو پکارا ہی اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ پکارا گیا ہے۔ جنگلوں میں، بَن میں رہنے والے لوگ کہا گیا ہے۔

ان کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے لیکن اس قوم نے بھی اپنے نبیؑ کی تعلیمات کا انکار کر دیا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ انسان نے اپنے طور پر اللہ کی ذات کی جگہ کوئی بت بٹھایا ہوتا ہے۔ اسی طرح کردار میں بھی اپنے نفع ونقصان کا معیار خود مقرر کیا ہوتا ہے کہ ایسا کروں گا تو فائدہ ہوگا، ایسا کروں گا تو نقصان ہوگا۔ جب اُسے مرضیاتِ باری اور تعلیماتِ رسالت کے مطابق سب کچھ بدلنا پڑتا ہے تو اسے بہت مشکل لگتا ہے لہٰذا بھاگ جاتا ہے۔ عہد حاضر میں ہم نے بھی یہ راہ نکالی ہے کہ یہ کہا جائے کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں، یہ کہا جائے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مانتے ہیں، آخرت کو بھی مانتے ہیں لیکن کام اپنی مرضی سے کرتے جاؤ یہ ایک جدید راہ ہے یعنی جو لوگ نہیں مانتے تھے وہ انکار کر دیتے تھے، جو مانتے تھے وہ مکمل اطاعت کرتے تھے لیکن عہد حاضر میں یہ ایک تیسرا طبقہ بھی آ گیا ہے۔ اب ہم

اس تیسرے طبقے کو بھی دیکھ رہے ہیں جو کہتا ہے کہ میں مانتا ہوں لیکن اطاعت نہیں کرتا۔ یہ ایسی عجیب بات ہے کہ اللہ کریم ہمیں ہدایت دیں اور معاف فرمائیں ورنہ ہمارا انجام بے حد خطرناک ہوسکتا ہے۔

سوبن کے رہنے والوں نے بھی اللہ کے پیغمبروں کی تعلیمات کا انکار کر دیا جب انہیں یہ دعوت ملی، فرمایا: اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ جب انہیں حضرت شعیب علیہ السلام نے دعوت دی کہ کچھ اللہ کا خوف کرو، اس کی عظمت کا اقرار کرو۔ اسی کی کائنات میں بستے ہوئے اسی کی عطا کردہ بے پناہ نعمتیں استعمال کرتے ہو اور اُسی کی بات نہیں مانتے، تم کیسے عجیب لوگ ہو۔ اللہ نے تمہیں پیدا کیا اور بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ تمہیں دل دیا دماغ دیا حواسِ خمسہ دیے، پھر صحت، مال و دولت، اقتدار اولاد دی اور رشتے عطا کیے۔ ایسی کون سی نعمت ہے جو اللہ تمہیں نہیں دے رہا؟ ایک تم ہو کہ اُسی کی عظمت کا انکار کیے بیٹھے ہو۔ کیسے عجیب لوگ ہو۔ کیا تم اس بات سے ڈرتے نہیں کہ جو تم کر رہے ہو یہ بہت بڑی گستاخی ہے جس پر پکڑے جاؤ گے اور سزا ملے گی؟

فرمایا: اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۷۸﴾ میں تمہارے لیے اللہ کا فرستادہ، اللہ کا پیغمبر ہوں اور امانت دار ہوں۔ میں اپنی طرف سے تمہیں کچھ نہیں بتاتا۔ اپنی ذاتی رائے سے کچھ نہیں کہتا۔ میں پوری امانت و دیانت سے وہی بات تم تک پہنچاتا ہوں جو اللہ نے پہنچانے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا: فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾ تم اللہ کی عظمت کا اقرار کرو، اس کی عظمت سے ڈرو۔ اس کی نافرمانی کر رہے ہو اپنے اس کردار سے ڈرو کہ اس پر پکڑے جاؤ گے۔ اس ساری مصیبت سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے: وَاَطِیْعُوْنِ۔۔۔ میری اطاعت کرو۔ جو میں کہوں اسے دل سے مانو اور اس پر عمل کرو۔ فرمایا: وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ۔۔۔ اس کام پر مجھے تم سے کوئی اجرت نہیں چاہیے۔ مجھے تم سے کسی معاوضے کی ضرورت نہیں ہے کہ تم مجھے بادشاہ بنالو یا مجھے مال و دولت پیش کرو۔ مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے سوائے اس کے کہ تم اللہ کی عظمت کا اقرار کرلو اور اللہ کی اطاعت کرلو۔ تمہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا یہ بتانا میری ذمہ داری ہے کہ اللہ نے مجھے رسول مبعوث کیا ہے۔ اللہ کی صفات کیسی ہیں، اللہ پر ایمان کیسے لانا ہے، آخرت کیا ہے، جزا و سزا کیا ہے، نیکی اور برائی کیا ہے، کون سا عمل درست ہے کون سا غلط ہے، یہ سب حقائق تم تک پہنچانا میری ذمہ داری ہے۔ یہ سب میں اللہ کی رضا کے لیے تم تک پہنچا رہا ہوں۔ فرمایا: اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۸۰﴾ میرا صلہ اُس ذاتِ وحدہٗ لاشریک پر ہے جو تمام جہانوں کا خالق، مالک اور پالن ہار ہے۔ مجھے بھی وہی دے گا میں تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ اب اس قوم میں خرابی کیا تھی؟ فرمایا: اَوْفُوا الْكَیْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِیْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ ﴿۱۸۲﴾ تم لوگ پورا ناپا کرو اور (صاحب حق کا) نقصان نہ کیا کرو۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ ہر قوم میں کوئی ایک خرابی نمایاں طور پر رہی۔ اس قوم کا یہ حال تھا کہ عجیب کام کرتے تھے۔ ایک تو ناپ تول میں ڈنڈی مارتے تھے اور دوسرا لوگوں کو لوٹتے تھے کہ مال دیتے ہوئے کم دیتے اور قیمت لیتے وقت فالتو یا زیادہ لیتے تھے۔ مال دیتے وقت کم دیتے اور خریدتے وقت زائد لے آتے۔ الغرض لین دین میں بددیانتی کر کے دولت کمانا ان کا شعار بن گیا تھا۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا، تم لوگ پورا پورا ناپا کرو، لین دین میں بددیانتی چھوڑ دو اور جو چیز جیسی ہے ویسی بیچو، جتنی اس کی قیمت ہے اتنی ہی لو۔

قرآنِ کریم دعوتِ عمل دیتا ہے، عقیدہ بھی بتاتا ہے، صحیح عمل بھی بتاتا ہے۔ اس میں انبیاؑ کا ذکر ہے اقوام کے قصے بطور دلیل آئے ہیں کہ اس قوم نے یہ جرم کیا اور اُسے یہ سزا ملی تاکہ ہم اس جرم سے بچ جائیں اور اس پر مرتب ہونے والی سزاؤں سے بچ جائیں۔

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم بازار سے گزرے، کسی صحابیؓ کا گندم کا کاروبار تھا وہاں اُن کی دکان کے سامنے گندم کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُس گندم میں اپنا دستِ مبارک ڈالا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو گندم اندر سے ذرا سی گیلی محسوس ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اس میں تو نمی ہے۔ عرض کیا گیا کہ جب دانوں سے خاک یا باریک مٹی کو الگ کرنا مقصود ہوتا ہے تو گندم کو پانی سے گزارتے ہیں، جس سے مٹی پانی میں حل ہو کر نکل جاتی ہے اور دانے صاف ہو جاتے ہیں۔ پھر اُن دانوں کو ہم سکھاتے ہیں شاید اس لیے تھوڑی نمی موجود ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ یہ تو درست ہے مگر کوئی خریدار آئے تو اُسے بتانا کہ اس کے اندر نمی ہے، اُسے کہنا کہ ہاتھ ڈال کر دیکھ لے کہ اس میں تھوڑی سی نمی ہے۔ یہ تھا طریقہ کاروبار کرنے کا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے سمجھایا کہ جس چیز کی قیمت لیتے ہو وہ مال پورا دو، معیاری دو اور خریدتے وقت قیمت پوری دو اور وزن بھی پورا لو۔ افسوس کہ ہمارے ہاں اکثریت کی کوشش ہوتی ہے کہ جو دیں وہ تھوڑا ہو اور جو لیں وہ زیادہ ہو۔ جو دیا جائے اس کے اوپر بڑی چمک دمک ہو اندر خواہ بھوسا بھرا ہو۔ جہاں تک ترازو سیدھی رکھ کر تولنے کا تعلق ہے تو تولتے وقت کانٹا ہی ایسا رکھتے ہیں یا تولنے والے اوزان میں کمی کر دیتے ہیں جس سے ناپ تول میں کمی ہو جاتی ہے۔

لین دین میں بددیانتی فساد فی الارض کا سبب ہے:

فرمایا: وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ اور لوگوں کا ان کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو اور اللہ کی زمین میں فساد مت مچایا کرو۔ یہ بات نہایت قابلِ توجہ ہے کہ کہاں کا رشتہ کہاں جُڑ رہا ہے؟ ارشاد ہو رہا ہے کہ اگر تم ناپ تول میں کمی کرو گے تو تمہاری قوم میں فساد پیدا ہو جائے گا۔ شروع

میں توخریدار احتجاج کرے گا، واپس آ کر شکایت کرے گا کہ گھر جا کر سامان دیکھا تو صحیح نہیں تھا جس پر بیچنے والا اصرار کرے گا کہ خریدنے والے نے دیکھ بھال کر چیز لی تھی اور اس کی دوکان سے ٹھیک حالت میں سامان گیا تھا۔ اس پر خریدار کے دل میں ایک انتقام کا جذبہ پیدا ہوگا اور وہ بیچنے والے کا نقصان کرنا چاہے گا۔ اس کے جواب میں دوسرا شخص بھی نقصان کے درپے ہوجائے گا اور یوں پوری قوم فساد میں مبتلا ہوجائے گی۔

سو فرمایا، لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو اُن کو نقصان مت پہنچاؤ اور زمین پر فساد نہ مچاؤ۔ قوم چونکہ دونوں کام کرتی تھی کہ راہزنی بھی کر لیتے اور ناپ تول میں بھی کمی کرتے تھے۔ راہزنی بھی زمین پر فساد ہے جبکہ ناپ تول میں کمی تو فساد کی بنیاد اور جڑ ہے سو فرمایا اس سے بچو ورنہ تم پر آپس میں لڑائی بھڑائی اور فساد کی مصیبت آجائے گی۔

وطنِ عزیز میں فساد اور اس کا حل:

اب جبکہ وطنِ عزیز میں ناپ تول میں کمی کا رواج ہے دھوکا دہی سے پیسے لینے کا رواج عام ہے تو ساری قوم ایک عذاب میں مبتلا ہوگئی ہے۔ اس عذاب کا نام ہے فساد جو حد سے زیادہ پھیل چکا ہے۔ گلیوں محلوں میں گولیاں چل رہی ہیں۔ عبادت خانوں میں دھماکے ہو رہے ہیں حتیٰ کہ قبرستانوں اور مقابر پر بھی حملے ہوتے ہیں۔ یہاں تو یہ عالم ہے کہ آخری علاج کے طور پر استعمال ہونے، جان بچانے کی ادویات، جو بے حد مہنگی ہوتی ہیں وہ بھی جعلی نکل آتی ہیں۔ غریب آدمی زمین بیچ کر مکان بیچ کر یا زمین کا کوئی قطعہ رہن رکھ کر قرضہ اٹھا کر وہ دوائی لے کر آتا ہے اور وہ نقلی ہوتی ہے۔ اس کا گھر بھی بک جاتا ہے اور مریض بھی مر جاتا ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ اسلامی ملک ہے اور آئے روز خبروں میں پڑھتے ہیں کہ کتنے من گدھے کا گوشت پکڑا گیا، کتنے من کتے کا گوشت پکڑا گیا جو ہوٹلوں کو پہنچایا جا رہا تھا۔ ایک اور بات عام ہو رہی ہے کہ اب مارکیٹ میں گرم مرغی اور ٹھنڈی مرغی کھلے عام بیچی جا رہی ہے۔ دونوں کے الگ نرخ ہیں۔ پوچھنے پر پتا چلتا ہے کہ ٹھنڈی مرغی سے مراد ہے جو مری ہوئی پڑی ہے، حرام ہے اور سستی ہے جبکہ گرم مرغی اپنے سامنے ذبح کرائی جا سکتی ہے۔ گدھے اور کتے کا گوشت بیچنے والے چھپ کر چوری سے بیچتے ہیں لیکن ان مرغی بیچنے والوں کی دیدہ دلیری دیکھنے کے قابل ہے کہ مارکیٹ میں رکھ کر مرغی بیچ رہے ہیں۔ جس قوم کا یہ حال ہو چکا ہو وہاں فساد نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟

ہمارے ملک میں جس طرح بیماری کا علاج کرنے کے دو طریقے رائج ہیں، ایک ایلوپیتھی کہلاتا ہے اور دوسرا طب۔ ایلوپیتھی میں انگریزی ادویات سے علاج کیا جاتا ہے اور اُن کا نشانہ ہوتا ہے مرض کا خاتمہ چنانچہ گولی کھاتے ہیں یا ٹیکہ لگواتے ہیں تو فوری آرام آجاتا ہے لیکن دوسرے ہی دن بیماری پھر شروع ہوجاتی ہے۔ دیسی طریقہ علاج

اس سے مختلف ہوتا ہے۔اس کا نشانہ مرض کا سبب ہوتا ہے تو جب دیسی طریقے سے علاج کروایا جاتا ہے تو اس میں کچھ دن تو ضرور لگ جاتے ہیں لیکن بیماری کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جاتا ہے۔

ملک میں دہشت گردی اور بدامنی کا طاقت سے سدباب کرنا گویا ایلوپیتھی علاج ہے، اچھی بات ہے لیکن یہ فوری اور عارضی علاج ہے جبکہ اس کا اصل علاج تو قرآن کریم بتا رہا ہے کہ ناپ تول میں کمی نہ کرو ورنہ یہ فساد کا عذاب تم پر آجائے گا۔ بنیادی وجہ ختم کی جائے تب ہی ان بھیانک نتائج سے بچا جا سکتا ہے۔ سو اس کا مستقل علاج یہ ہے کہ حکومت ایسے ادارے بنائے جو چیزوں کا معیار، ناپ تول پر نگرانی کرے یعنی کوالٹی کنٹرول کی جائے۔ آخر یہ ادارے کافر حکومتوں نے بنا رکھے ہیں تو ہمارے ملک میں کیوں نہیں بن سکتے؟ اُن ممالک میں کوئی نقلی چیز نہیں چل سکتی۔ ایک مرتبہ نیویارک میں اس بات کا تجربہ ہوا کہ ایک چیز پسند آئی خریدنے کی نیت سے اُٹھا کر دیکھی تو اس پر لکھا تھا 'Made in Korea' دوکاندار سے پوچھا کہ تم کوریا کا بنا ہوا بیچ رہے ہو کہنے لگا کہ آپ امریکہ سے خرید رہے ہیں اس کا معیار اعلیٰ ہوگا اس لیے کہ امریکہ میں کوالٹی چیک کا نظام ہے اگر چیز معیار کے مطابق ہوگی تب ہی امریکہ میں بک سکے گی۔ چونکہ کوریا میں مزدوری سستی ہے اس لیے بہت سی امریکی کمپنیوں نے وہاں کارخانے لگا لیے ہیں۔ اس پر لکھا تو کوریا کا نام ہے لیکن اس کی کوالٹی وہی ہے جو اگر امریکہ میں بنتی تو ہوتی۔ وطنِ عزیز میں کوریا کا جو مال آتا ہے وہ گھٹیا اور نقلی ہوتا ہے۔ اگر کافروں نے اس کا اتنا اہتمام کیا ہوا ہے تو کیا ہمارے ملک کے مسلمان حکمرانوں سے نہیں ہو سکتا؟

مشرقِ وسطی میں بھی کوالٹی چیک ہے چنانچہ وہاں بھی نقلی چیزیں نہیں ملتیں۔ اگر کسی سے گڑبڑ کا اندیشہ ہو تو وہ اس مال کے جہازوں کے جہاز واپس کر دیتے ہیں کہ یہ مال معیاری نہیں ہے اور عموماً وہ مال وطنِ عزیز سے گیا ہوتا ہے۔ دنیا سے ہر طرح کے فساد کو روکنے کے لیے دیانت و امانت شرط ہے جہاں بددیانتی ہوگی، امانت میں خیانت ہوگی وہاں فساد ہوگا۔

قوم کا حضرت شعیب علیہ السلام سے مطالبہ:

حضرت شعیب علیہ السلام نے سمجھایا کہ: وَاتَّقُوا الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۸۴﴾ اس مالک اس عظیم خالق سے ڈرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے پہلے بے شمار لوگوں کو پیدا کیا۔ تم اللہ کی بہترین تخلیق ہو کہ تم شرفِ انسانیت سے نوازے گئے۔ اس نے بے پناہ مخلوق پیدا کی اگر تمہیں گدھا، کتا وغیرہ بنا دیتا تو اسے کون روک سکتا تھا لہٰذا اس کا احسان مانو کہ اس نے تمہیں انسانیت کا اعزاز بخشا ہے سو انسان بن کر دکھاؤ۔ تم یہ کیا جانوروں والی

خصلتیں لیے بیٹھے ہو؟ قوم سے جواب نہ بن پڑا تو کہنے لگی: قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۸۶﴾ بے شک آپ پر جادو کر دیا گیا ہے۔ کہنے لگے ایسا لگتا ہے کسی نے آپ پر جادو کر دیا ہے، سحر زدہ کر دیا ہے جس سے آپ بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں گمراہ ہوتے ہیں جب اُن کی خلافِ مرضی کوئی بات ہو تو فوراً کہتے ہیں کسی نے جادو کر دیا۔

آج ہمارے معاشرے میں مسلمان کہلانے والے بھی اسی وہم میں گرفتار ہیں۔ ہر بندہ ہی کہتا ہے کہ اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے حتیٰ کہ یہاں تک کہتے ہیں کہ کسی نے رزق باندھ دیا ہے کسی نے میری شادی باندھ دی ہے وغیرہ۔ اللہ کا خوف کرو! اللہ پر ایمان ہے تو پھر اس کی صفات پر بھی ایمان لاؤ وہ خود خالق و مالک ہے جسے پیدا کرنا چاہے تو کسی کا جادو اُسے روک نہیں سکتا۔ جسے مارنا چاہے کوئی اسے زندگی نہیں دے سکتا، جس پر مفلسی بھیج دے کوئی اسے جادو سے امیر نہیں کر سکتا اور جسے وہ دولت دے کوئی جادوگر روک نہیں سکتا۔ لوگ کیا سمجھتے ہیں کہ اس کائنات کا نظام اللہ نے جادوگروں کے سپرد کر رکھا ہے کہ جو چاہیں کریں؟ جتنے جادوگر بنے بیٹھے ہیں یہ تو خود آنے والوں کے پیسے پر گزارا کرتے ہیں اگر یہ اتنے کامل ہیں تو جادو کے زور پر اپنی روزی تو پیدا کر لیتے لوگوں سے تو نہ مانگ کر زندہ رہتے۔

یہ عادت انسانوں میں عرصہ دراز سے آ رہی ہے، پرانی قوموں سے چلی آ رہی ہے کہ چیز خلاف مرضی ہو تو کہتے ہیں جادو ہو گیا ہے۔ کاروبار میں نقصان ہو جائے تو کسی نے کاروبار باندھ دیا ہے بجائے اپنی غلطی دیکھنے کے بددیانتی چھوڑنے کے جادو کی طرف جاتے ہیں۔ ارے یہ باندھنے والے کون ہیں اگر یہ باندھنے والے ہوں تو ان سے کہو کہ کسی مرنے والے کو باندھ کر دکھا دیں روک لیں کہ اسے نہیں مرنے دیں گے یہ ابھی دس سال اور زندہ رہے گا! دراصل یہ ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے۔ ایسی باتیں انبیاؑ کو بھی سننا پڑیں کہ آپ پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے اور آپ اس کے زیرِ اثر بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام سے کہنے لگے: وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۸۷﴾ آپ بھی تو ہماری طرح انسان ہی ہیں، کھاتے پیتے ہیں، سوتے جاگتے ہیں بیمار ہوتے ہیں صحتمند ہوتے ہیں تو آپ میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ آپ نبیؑ بن گئے۔ آپ کے ساتھ سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا عام انسان کے ساتھ ہے۔ آپ بچے سے جوان ہوئے اب بوڑھے ہو رہے ہیں سو آپ ہماری طرح انسان ہی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ ہم آپ کو جھوٹا مانتے ہیں۔ اللہ نے آپ کو نبی نہیں بنایا اور کوئی پیغام نہیں دیا۔

اب وہ تو اللہ کے پیغام کو ان احکام کو اس لیے جھوٹا کہہ رہے ہیں کہ جو کچھ اُن کے دل میں راسخ ہو چکا ہے

وہی صحیح ہے، جواُن کا نظریہ ہے وہی ٹھیک ہے۔آج ہمارے معاشرے میں بگاڑ کا سبب بھی یہی ہے، گھروں کے اجڑنے کا سبب بھی یہی اندازِ فکر ہے کہ جوشوہر طے کرلیتا ہے،اسی بات پر اصرار کرتا ہےاور جو بیوی طے کرلیتی ہے وہ اُسی بات کو سچ سمجھتی ہے شوہر سے کہتی ہے کہ تم جھوٹے ہو۔ یوں ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں۔ بالآخر بات مقدموں تک اور طلاق تک جاتی ہے۔کوئی بندہ دوسرے کی بات سننے کو تیار نہیں ہے کہ ہوسکتا ہے میری رائے میں غلطی ہوتو دوسرے کی بات بھی سن لی جائے، ہوسکتا ہے اس کی رائے بہتر ہو بیٹھ کر بات تو کرلیں لیکن ایسا کرتے نہیں کہ ہر بندہ ہی خود کو عقلمند اور دوسرے کو پاگل سمجھتا ہے۔

اُن کی قوم اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر کہنے لگے: فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ﴿۱۸۷﴾ اگر آپ اللہ کے سچے نبیؑ ہیں جیسا کہتے ہیں تو پھر آپ ایسا کریں کہ ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دیجیے۔ ہماری آبادی پر آسمان گرادیجیے جس سے ہم تباہ ہوجائیں۔

انسان جب بھٹکتا ہے تو شیطان پھر اُسے گستاخی کی انتہا تک لے کر جاتا ہے، گمراہی کی انتہا تک لے کر جاتا ہے۔تباہی طلب کررہے ہیں، کہا جب تباہ ہوجاؤ گے تو پھر کیا مانو گے؟ حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا: قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴿۱۸۸﴾ سزا دینا یا انعام دینا یہ میرا کام نہیں ہے۔ یہ رب العالمین کا کام ہے وہ چاہے تو تم پر آسمان گرادے۔نہ چاہے تو نہ گرائے یہ اس کا کام ہے۔ میرا کام صرف اللہ کا پیغام پہنچانا ہے تم پر عذاب یا ثواب نازل کرنا نہیں ہے۔ میں نے تمہیں اجر اور بدلہ نہیں دینا یہ رب العالمین نے دینا ہے جو کائنات کا پالنہار ہے جو جانتا ہے کون کیا کررہا ہے۔جس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے سو اس کے مطابق وہ جزا و سزا دے گا، یہ کام میرا نہیں ہے کہ میں تمہیں سزا یا انعام دوں۔ یہ صرف اللہ کا کام ہے کہ وہ جانتا ہے تمہارے دل میں کیا ہے، تمہارے ارادے کیا ہیں، تم کیا کررہے ہو۔وہ جانتا ہے کہ اس کی اپنی مخلوق ہے۔

ہمارے ہاں فساد کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم خود فوراً سزا دینا چاہتے ہیں، عدالت تک بھی جانا گوارا نہیں کرتے بلکہ خود ہی فیصلہ کرتے ہیں کہ مخالف کا سر پھاڑ دو یا گولی ماردو۔

فرمایا: فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ۔۔۔وہ لوگ نبیؑ کو برابر جھٹلاتے رہے پس اُن کو سائبان کے دن کے عذاب نے آ پکڑا۔

اللہ کریم نے اُن پر عجیب وغریب عذاب نازل فرمایا کہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے خشک سالی ہوگئی پھر ایک دن بے پناہ گرمی پڑی۔ گرمی کی شدت ایسی تھی کہ لوگ تڑپ رہے تھے گھر کے اندر بیٹھا جاتا تھا نہ باہر چین ملتا تھا۔ اتنے میں جنگل کے ایک قطعے پر بادل آ گیا جس طرح کوئی خیمہ لگا دیا جاتا ہے۔ اُسی طرح اس بادل نے

چھاؤں کر دی۔ اسے دیکھ کر ساری قوم اس کے نیچے جمع ہوگئی کہ اس کے باہر شدید گرمی تھی۔ جب ساری قوم اس کے نیچے آ گئی تو اُس بادل سے آگ برسنا شروع ہوگئی اور وہ سب تباہ و برباد ہو کر رہ گئے۔ بظاہر تو وہ بادل بڑا سائبان نظر آ رہا تھا۔ بادل نے چھاؤں بنا دی ہے نیچے ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے لیکن جب سب نیچے جمع ہو گئے تو اسی سائبان سے آگ برسنا شروع ہوگئی۔ یہ تباہی اس لیے آئی کہ انہوں نے اللہ کے نبیؑ کی تعلیمات کا انکار کیا تھا۔ فرمایا: اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۸۹﴾ بے شک وہ بہت بڑے دن کا عذاب تھا۔ جب مشکل آتی ہے تو ایک لمحہ بھی سال کا لگتا ہے۔ وہ دن انہیں بہت بڑا لگ رہا تھا جب اُن پر آگ برس رہی تھی کہ یہ کب ختم ہوگی یہ تو بہت دیر ہوگئی۔ وہ سب تباہ و برباد کر کے رکھ دیے گئے۔ فرمایا: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ ان باتوں میں کتنے دلائل تھے عظمتِ الٰہی کے، ہدایت اور نیکی کو پانے کے لیے لیکن اُن لوگوں نے کوئی بات نہ مانی، اُن کی اکثریت برائی پر رہی۔

فرمایا: وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۹۱﴾ اور بے شک آپ کا پروردگار ہی غالب (اور) مہربان ہے۔ اس کے عذاب سے پھر کوئی بھاگ نہیں سکا کہ وہ غالب ہے۔ جو لوگ بچے ہوئے ہیں انہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ رحیم بھی ہے اس کی رحمت ناپیدا کنار ہے۔ اگر باز نہ آئے تو اسی انجام کو پہنچیں گے۔ سو جو زندہ ہیں اُن کے پاس مہلت ہے کہ وہ توبہ کر لیں، رجوع الی اللہ کر لیں اللہ کی ذات اور صفات پر ایمان لے آئیں اور اللہ کے نبیؑ کی اطاعت کریں۔

سورۃ الشعراء رکوع 11 آیات 192 تا 227

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ
لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۹۶﴾
اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۹۷﴾ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى
بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ كَذٰلِكَ
سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۰۰﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ
الْاَلِيْمَ ﴿۲۰۱﴾ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ
مُنْظَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ﴿۲۰۵﴾
ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿۲۰۷﴾
وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۸﴾ ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۰۹﴾
وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ
عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ
الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ
اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾
وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲۱۷﴾ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِي
السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۲۰﴾ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ
الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ

كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ
يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَسَيَعْلَمُ
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾

اور یقیناً یہ (قرآن) پروردگارِ عالم کا نازل فرمایا ہوا ہے ﴿۱۹۲﴾ اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے ﴿۱۹۳﴾ آپ کے قلب (اطہر) پر تاکہ آپ (بھی انجام بد سے) ڈرانے والوں میں سے ہوں ﴿۱۹۴﴾ صاف عربی زبان میں ﴿۱۹۵﴾ اور یقیناً اس (قرآن) کا ذکر پہلی امتوں کی (آسمانی) کتابوں میں (بھی) ہے ﴿۱۹۶﴾ کیا ان کے لیے اس میں دلیل نہیں ہے کہ علمائے بنی اسرائیل اس کو جانتے ہیں ﴿۱۹۷﴾ اور اگر ہم اس (قرآن) کو کسی غیر عربی پر نازل فرما دیتے ﴿۱۹۸﴾ پھر وہ ان کے سامنے اس کو پڑھ بھی دیتا یہ لوگ تب بھی اس کو نہ مانتے ﴿۱۹۹﴾ اسی طرح ہم نے اس (انکار) کو گناہگاروں کے دلوں میں داخل فرما دیا ہے ﴿۲۰۰﴾ وہ جب تک دردد ینے ولا اعذاب نہ دیکھ لیں گے اس کو نہیں مانیں گے ﴿۲۰۱﴾ پھر وہ ان پر اچانک آ پڑے گا اور ان کو خبر تک نہ ہوگی ﴿۲۰۲﴾ تو اس وقت کہیں گے کیا ہمیں مہلت ملے گی؟ ﴿۲۰۳﴾ تو کیا یہ ہمارے عذاب کو جلدی طلب کر رہے ہیں ﴿۲۰۴﴾ بھلا دیکھو اگر ہم ان کو برسوں فائدے دیتے رہیں ﴿۲۰۵﴾ پھر ان پر وہ (عذاب) آ واقع ہو جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے ﴿۲۰۶﴾ تو جو (دنیا کے) فائدے یہ اٹھاتے رہے ان کے کس کام آئیں گے؟ ﴿۲۰۷﴾ اور جو بستیاں ہم نے ہلاک کیں ان میں (انجامِ بد سے) ڈرانے والے (پیغمبر) بھیجے تھے ﴿۲۰۸﴾ تاکہ نصیحت حاصل کریں اور ہم زیادتی کرنے والے نہیں ﴿۲۰۹﴾ اور اس (قرآن) کو لے کر شیطان نازل نہیں ہوتے ﴿۲۱۰﴾ اور نہ ان کو سزاوار ہے اور نہ وہ اس کی طاقت رکھتے ہیں ﴿۲۱۱﴾ کیونکہ وہ

(شیاطین) تو اس کے (وحی آسمانی) کے سننے سے روک دیے گئے ہیں ﴿۲۱۲﴾ پس اللہ کے سوا کسی کو معبود مت پکارنا ورنہ تم عذاب پانے والوں میں ہو جاؤ گے ﴿۲۱۳﴾ اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈرایئے ﴿۲۱۴﴾ اور جو لوگ ایمان لا کر آپ کے پیرو ہو گئے ہیں ان سے شفقت سے پیش آیئے ﴿۲۱۵﴾ پھر اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں تو فرما دیجیے کہ میں تمہارے اعمال سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ﴿۲۱۶﴾ اور اللہ غالب مہربان پر بھروسہ کیجیے ﴿۲۱۷﴾ وہ جو آپ کو (عبادت کے لیے) کھڑے ہوتے وقت دیکھتے ہیں ﴿۲۱۸﴾ اور پھر نمازیوں کے ساتھ آپ کے بیٹھنے اٹھنے کو (دیکھتے ہیں) ﴿۲۱۹﴾ بیشک وہ خوب سننے والے خوب جاننے والے ہیں ﴿۲۲۰﴾ (لوگوں سے فرما دیجیے کہ) کیا میں تم کو بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں؟ ﴿۲۲۱﴾ ہر جھوٹے گناہگار پر اترتے ہیں ﴿۲۲۲﴾ جو (سنی سنائی بات ان کے) کان میں ڈالتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں ﴿۲۲۳﴾ اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں ﴿۲۲۴﴾ (اے مخاطب!) کیا تُو نہیں دیکھتا کہ وہ (خیالی مضامین کی) ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں ﴿۲۲۵﴾ اور یہ کہ وہ لوگ وہ کہتے ہیں جو وہ کرتے نہیں ﴿۲۲۶﴾ (ہاں) مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور کثرت سے اللہ کا ذکر کیا اور انہوں نے بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہو چکا اس کا بدلہ لیا اور ظالم عنقریب جان لیں گے کہ کس جگہ لوٹ کر جاتے ہیں ﴿۲۲۷﴾

تفسیر و معارف

عظمتِ قرآن:

فرمایا: وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ اور یقیناً یہ (قرآن) پروردگارِ عالم کا نازل فرمایا ہوا ہے نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے۔

قرآنِ کریم کی عظمت یہ ہے کہ اللہ کریم کی طرف سے نازل فرمایا گیا۔ وہ اللہ جو ساری کائنات کا پالنہار ہے۔ صرف وہی ہستی رب کہلانے کی مستحق ہے جو ہر ضرورت مند کی ہر ضرورت ہر جگہ پوری کرنے پر قادر ہو۔ ضرورت پوری کرنے کے لیے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کو ضرورت پوری کرنے پر قدرت ہو اور اس کا علم اتنا وسیع ہو کہ وہ ہر شئے کی ہر ضرورت کو ہر وقت جانتا ہو۔ اس کی قدرت کاملہ ایسی ہو کہ وہ ہر ضرورت مند کی ہر ضرورت پوری کر دے۔ یہ ہستی سوائے اللہ کے کوئی اور نہیں۔

اللہ کی ساری مخلوقات میں افضل ترین مخلوق انسان ہیں۔ انسان کو یہ شرف کس وصف کی بنا پر دیا گیا ہے؟ جتنے جاندار اللہ نے پیدا فرمائے ہیں بڑے سے بڑے جانور سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے حشرات الارض تک سب ہی ایک نظام کے تحت غذا حاصل کرتے ہیں، رہنے کو ٹھکانہ بناتے ہیں، اولاد پیدا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ انسان بھی یہی کام کرتا ہے تو پھر انسان اشرف کیسے ہو گیا؟ کیا انسان اپنے قد کاٹھ، حواس یا عقل کی وجہ سے ممتاز ہے؟ اللہ نے ہر مخلوق کو اس کی اپنی حیثیت کے مطابق اپنے وظیفہء حیات کے مطابق مادی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے، دیکھ بھال کرنے کے لیے عقل بھی دی ہے اور شعور بھی۔ اس کا وجود بھی اس کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے مطابق بنایا ہے تو پھر انسان کا شرف کیا ہے؟ انسان کا شرف یہ ہے کہ صرف وہی اللہ کی معرفت کی استعداد سے نوازا گیا ہے۔ باقی ساری مخلوق اللہ کے حکم کی پابند ہے۔ فرشتوں تک میں یہ مجال نہیں کہ وہ ذاتِ باری کی معرفت کے بارے سوال کرے۔ اللہ نے انسان کو یہ عظمت دی، اسے معرفتِ الٰہی کی استعداد دی۔

جب معرفتِ الٰہی کی استعداد دی تو ضروری تھا کہ معرفتِ حق کے لیے اس کی راہنمائی بھی کی جاتی، اللہ جو ربّ العالمین ہے، یہ اس کی ربوبیت کا تقاضا تھا کہ انسانوں کی جسمانی ضروریات کے ساتھ روحانی ضروریات کو پورا فرمائے لہٰذا اللہ نے اپنے نبی علیہ السلام بھیجے۔ وقتاً فوقتاً آسمانی کتابیں آتی رہیں۔

قرآنِ حکیم کا نزول اللہ کی صفتِ ربوبیت کا تقاضا تھا کہ جب انسان کو یہ منصب دیا تو پھر اس کی راہنمائی کا بھی پورا اہتمام کیا جاتا سو اللہ نے قرآنِ حکیم نازل فرمایا۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے۔ قرآنِ حکیم کی شان یہ ہے کہ فرشتوں کا سردار جو نہایت امانت دار ہے، جس کا لقب روح الامین ہے اس نے اسے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچایا۔ کیسے پہنچایا؟ فرمایا: عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ آپ کے قلب (اطہر) پر تا کہ آپ (بھی انجامِ بد سے) ڈرانے والوں میں سے ہوں۔

اللہ کریم کی معرفت پانے کا آلہ انسانی قلب ہے۔ جب تک قلب ذکر سے اطمینان نہ پالے اچھی باتیں بھی محض باتیں ہی رہ جاتی ہیں بندے کا حال نہیں بنتیں۔ قلب کی اس اہمیت کی وجہ سے قرآن حکیم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم

کے قلبِ اطہر پر نازل ہوا۔ ظاہر بین تو کہتے ہیں کہ سارا نظام عقل وخرد پر چل رہا ہے، عقل ہی چلا رہی ہے تو انہیں سوچنا چاہیے کہ اتنی عظیم کتاب جو کائنات کے ہر فردِ بشر کی راہنمائی کے لیے ہے تو یہ دماغ پر نازل کیوں نہ ہوئی، عقل پر کیوں نازل نہ ہوئی؟ کائنات میں ساری مخلوق میں بے مثل اور بے مثال ذات آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہے۔ آپ جیسا حُسن (حسین) اللہ نے دوسرا نہ تخلیق فرمایا نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم جیسا وجود عالی کسی اور کو نصیب ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم جیسا دماغِ عالی بھی اللہ نے کوئی دوسرا نہیں بنایا تو پھر دماغِ عالی پر قرآن کیوں نازل نہ ہوا؟ اس کے لیے انسان کی حقیقت جاننا ضروری ہے۔ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔ بدن اور روح۔ علمائے حق کے نزدیک اصل انسان روح ہے۔ جب انسان کا ذکر کیا جائے تو اس سے مراد روح ہوتی ہے اس لیے کہ روح کے آنے سے پہلے انسان کا کوئی وجود نہیں ہوتا اور روح کے بدن سے نکل جانے کے بعد اسے کوئی انسان نہیں کہتا، مردہ، میّت یا لاش کہتے ہیں۔

روح اس زمین وزماں کی مخلوق نہیں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ: قل الروح من امرِ ربّی۔۔۔ فرما دیجیے کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے۔ جہاں دائرہ تخلیق ختم ہوتا ہے مخلوقات کی حد ختم ہوتی ہے اس سے آگے عالمِ امر ہے۔ روح اللہ کی ایسی تخلیق ہے جس کی بنیاد، جس کا پیدا ہونا عالمِ تخلیق میں نہیں عالم امر میں ہے۔ وہاں اللہ کریم نے روح کیسے پیدا کی؟ اس کے بارے فرمایا: وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل:85) تم اس راز کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ تمہارے علوم کی حد سے بالاتر ہے۔ تمہارے لیے اتنا جاننا کافی ہے کہ روح امر سے ہے۔ امر سے کیسے ہے؟ اس کا علم نہیں دیا گیا۔ تمہارے علوم دائرہ تخلیق میں ختم ہو جاتے ہیں۔ انسان مخلوق ہے اس کا علم بھی مخلوق ہے، محدود ہے اور دائرہ تخلیق کے اندر ختم ہو جاتا ہے۔ روح عالم امر سے ہے۔ یہ تمہارے مادّی علوم سے بالاتر بات ہے۔

دماغ اور عقل کا دائرہ کار:

دماغ کا کام ہے، مادّی بدن کی ضروریات کا ادراک کرنا اور ان کی تکمیل کے لیے کوشش کرنا۔ بدن مادّی ہے، مادّے سے بنا ہے۔ دماغ اس کا حصّہ ہے۔ اس کا کام مادّی وجود سے ہی متعلق ہے۔ اس لیے جتنے دماغی علوم وکمالات ہیں اُن کے لیے ایمان شرط نہیں۔ وہ کافر کو بھی نصیب ہو جاتے ہیں۔ کفار بھی نئی نئی چیزیں ایجاد کرتا ہے۔ نئے نئے طرز کے گھر بناتا ہے، مشینیں ایجاد کرتا ہے۔ مادّی علوم میں جو جتنی کاوش کرے گا اتنا ہی وہ ماہر ہوگا، ان میں کمال حاصل کرے گا لیکن تمام دماغی قوت، ذہنی قوت سے جو حاصل کرے گا اس کا تعلق دنیوی اور مادّی

اشیاء تک محدود ہوگا۔

ذہنی اور دماغی قوت سے اکثر لوگ غلط کام بھی لیتے ہیں جیسے ہندو جوگی وغیرہ جنگلوں میں چلہ کشی کرتے، تنہا رہتے، کم سوتے، کم کھاتے اور اس کی طرح کی مشقتیں کرتے ہیں لیکن ان تمام مشقتوں کا حاصل یہی ہے کہ دور کی چیزیں قریب دیکھ لیں، دور کی آوازیں سن لیں۔ دنیا کے کسی دوسرے ملک کا حال دیکھ لیں۔ انسانی دماغ میں یہ استعداد ہے لیکن یہ کوئی کمال نہیں ہے۔ اس سے بہتر تو دنیوی ایجادات ہیں کہ مختلف کھیل دنیا کے ایک سرے پر ہو رہے ہوں تو دوسرے سرے پر بیٹھے لوگ Live دیکھ رہے ہوتے ہیں یا سیٹلائٹ سے دور کی آوازیں سن لیتے ہیں۔ فون پر دنیا کے ہر ملک میں بات کر سکتے ہیں۔ جو شعبدے باز ایسی مشقتیں کرتے ہیں ان کا مقصد شعبدے دکھا کر، کشف بتا کر لوگوں سے مال بٹورنا ہی ہوتا ہے۔

روح کا دائرہ کار:

روح کا مرکز قلب ہے۔ قلب خون پمپ کرنے والی مشین نہیں بلکہ اس کے اندر ایک لطیفہ ربانی ہے جسے عرف عام میں Subtle heart کہتے ہیں۔ قربِ الٰہی کی جتنی کیفیات ہیں ان سب کا مرکز یہ لطیفہ ربانی ہے۔ جس طرح دماغ کا کام ہے مادّی بدن کی ضروریات کا احساس کرے اور انہیں پورا کرنے کے لیے کوشاں رہے اسی طرح قلب کا کام ہے کہ روح کی ضروریات کا ادراک کرے اور ان کی تکمیل کے وسائل اختیار کرے۔ جس طرح دماغ کی، ذہن کی اپنی حیات ہے کہ خود زندہ اور صحت مند ہو تو باقی کے کام کر سکتا ہے اسی طرح روح کی حیات اور صحت وقوت پر روح کی ضروریات کی تکمیل کا انحصار ہے۔

صرف عربی مقدس زبان ہے:

فرمایا: بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾ صاف عربی زبان میں۔ قرآن حکیم کو خوبصورت، ہر بات کو واضح کر دینے والی زبان عربی میں نازل کیا گیا۔ یہاں سے علماء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ قرآن صرف عربی متن ہے۔ اردو، انگریزی، فارسی اور دیگر زبانوں میں قرآن کے ترجمے ہیں، قرآن نہیں ہے۔ اگر نماز اردو ترجمے میں یا کسی بھی زبان کے ترجمے میں پڑھی جائے گی تو نماز ادا نہیں ہوگی جب تک قرآن کا متن نہیں پڑھیں گے۔ جو لوگ تلاوت کے بغیر صرف ترجمہ پڑھ کر کہتے ہیں کہ ہم نے ختم قرآن کر لیا ہے تو اس طرح ختمِ قرآن نہیں ہوتا۔ ترجمہ پڑھنے کا ثواب اپنا ہے۔ عبادات میں تو متن ضروری ہے محض ترجمے سے گزارا نہیں ہوتا۔ متن کے ساتھ ترجمہ ضرور پڑھنا چاہیے۔ تفسیر ضرور پڑھنی چاہیے اس لیے کہ قرآن پڑھنے، سمجھنے اور عمل کرنے کے لیے ہے۔ ہم نے تو قرآن کو مرنے والوں پر

پڑھنے کے لیے مختص کر رکھا ہے۔ علامہ اقبال نے طنزاً کہا تھا:

ازیٰس او آسان بمیری

قرآن تو کتابِ حیات ہے لیکن ہم سورہ یٰس اس لیے پڑھتے ہیں کہ بندہ جلدی مر جائے۔

قرآن تو اللہ کی اتنی بڑی نعمت ہے کہ اسے لفظ لفظ پڑھنا اور اس سے لذت لینا چاہیے۔ ارشادِ باری ہے: وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (المزمل:4) اسے مزے لے کر پڑھو کہ یہ وہ الفاظ ہیں جو اللہ کا ذاتی کلام ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبانِ مبارک سے نکلے۔ اسے لطف لے کر پڑھنا، اسے سمجھنا اور اس پر عمل کرنا حقِ تلاوت ادا کرنا ہے۔

فرمایا، اسے ہم نے واضح عربی میں نازل فرمایا ہے۔ دنیا کی زبانوں میں یہ سب سے خوبصورت زبان ہے اور تقدس صرف عربی زبان میں ہے۔ اللہ کریم نے اسے پسند فرمایا ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبان ہے، اللہ کی قرآن کی زبان ہے، اہلِ جنت کی زبان ہے۔ باقی تمام زبانیں اپنا مطلب بیان کرنے کے لیے ہیں، اپنی بات کا مفہوم ادا کرنے کے لیے ہیں۔ اردو، انگریزی، فارسی، سب زبانیں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے ہیں۔ کسی زبان میں فی نفسہٖ بھلائی یا برائی نہیں ہے۔ عربی زبان میں تقدس بھی ہے، اس کا احترام بھی ہے اور یہ مبارک بھی ہے۔

فرمایا: وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ اور یقیناً اس (قرآن) کا ذکر پہلی امتوں کی (آسمانی) کتابوں میں (بھی) ہے۔ قرآن حکیم کا ذکر خیر تو پہلی کتابوں میں بھی ہے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم خاتم النبیین ہوں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر قرآن نازل ہوگا جو اللہ کا ذاتی کلام ہوگا۔ قیامت تک وہی کلام راہنمائی کرے گا۔ اس کے بعد کوئی کتاب نازل نہ ہوگی۔ فرمایا، یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے کہ قرآن نازل ہو گیا اور اس کا کسی نے پہلے ذکر ہی نہیں سنا۔ ایسا نہیں ہے۔ پہلی کتابوں میں قرآن کا ذکر خیر موجود تھا اور آج نزولِ قرآن کے وقت بھی پچھلی کتابوں کا علم رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ اللہ کے اس آخری کلام کا ذکر خیر پہلے سے چلا آ رہا ہے۔

فرمایا: اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۹۷﴾ کیا ان کے لیے اس میں دلیل نہیں ہے کہ علمائے بنی اسرائیل اس کو جانتے ہیں۔ قرآن کا نزول کوئی انوکھی بات نہیں۔ کیا یہ دلیل کم ہے کہ بنی اسرائیل کے علماء جو موجود ہیں (نزول قرآن کے وقت) یہ بھی جانتے ہیں کہ پہلی کتابوں میں موجود تھا کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلّم پر اللہ کی آخری کتاب نازل ہوگی لیکن انکار کرنے والوں کے لیے اعتراضات کی کمی نہیں۔ فرمایا: وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ﴿۱۹۸﴾ اگر ہم اس (قرآن) کو کسی غیر عربی پر نازل فرما دیتے۔

فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ پھر وہ ان کے سامنے اس کو پڑھ بھی دیتا یہ لوگ تب بھی اس کو نہ مانتے۔ اگر ہم اسے کسی غیر عرب پر نازل کرتے تو پھر نہ ماننے والوں کو ایک اور بہانہ مل جاتا۔ اس پر اعتراض کرتے کہ آپ تو غیر عرب ہیں۔ آپ نے کسی عربی دان سے سیکھ کر کتاب بنالی ہے۔ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۰۰﴾ اسی طرح ہم نے اس (انکار) کو گناہگاروں کے دلوں میں داخل فرما دیا ہے۔ قرآن حکیم کی عظمت کا انکار کرنے کے جرم میں ہم نے ان کے دلوں میں اس انکار کو گاڑ دیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جب یہ اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں، گناہ کرتے ہیں تو اس کی سزا کے طور پر انہیں قرآن پر ایمان لانے سے محروم کر دیا جاتا ہے اور کفر ان کے دلوں میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔ اس آیہء مبارکہ میں پھر سے قلب کی بات آ گئی کہ اللہ کریم ان لوگوں کے جرائم کے سبب کفر کو بدکاروں کے دلوں میں ٹھونس دیتے ہیں۔

یہ آیت کفار کا کردار اور ان کا انجام بتا رہی ہے اور ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کے لیے پیغام دے رہی ہے کہ اس محرومی سے بچو لیکن ہماری محرومی یہ ہے کہ ہماری عمریں گزر گئیں قرآن پڑھنے کی فرصت نہیں ملی۔ اگر پڑھا ہے تو پھر سمجھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تو کہیں ہماری بدکرداری اور برے اعمال ہمیں قرآن سے دور تو نہیں لے گئے؟ یہ ہم سب کو سوچنا ہوگا۔ مجھے بھی اور آپ کو بھی۔ ہم دوسروں کے بارے بہت سوچتے ہیں حالانکہ ان کا جواب ہم نے نہیں دینا۔ وہ اپنا جواب خود اللہ کو دیں گے۔ اپنے بارے فکر کیجیے اور دیکھیے کہ ہماری زندگی میں قرآن کا کتنا عمل دخل ہے۔ ہم قرآن کتنا پڑھتے ہیں؟ اگر پڑھتے ہیں تو اسے سمجھنے کی کتنی کوشش کرتے ہیں اور اس پر پھر عمل کتنا کرتے ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ کسی بھی مسلمان کا کوئی دن تلاوت کے بغیر گزرے بلکہ اچھے خوش قسمت لوگ وہ ہیں جو دن کے شروع میں تلاوت کرتے ہیں اور سونے سے پہلے پھر تلاوت کرتے ہیں۔

فرمایا، جن لوگوں کے دلوں میں ان کے جرائم کے سبب انکار گاڑ دیا گیا ہے كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۰۰﴾ وہ جب تک درد دینے والا عذاب نہ دیکھ لیں گے اس کو نہیں مانیں گے۔ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

پھر وہ ان پر اچانک آ پڑے گا اور ان کو خبر تک نہ ہوگی۔ عظمت والے کلامِ الٰہی کا انکار ایسا جرم ہے کہ اس پر آنے والا عذاب بھی بہت مہیب ہے وہ یہ کہ انہیں قرآن کو ماننے کی توفیق ہی نہیں ہوگی جب تک یہ آخرت اور آخرت کا عذاب عندالموت یا برزخ میں پہنچ کر نہ دیکھ لیں۔ جب دیکھ لیں گے تو احساس ہو جائے گا لیکن اس وقت توبہ اور عمل کا وقت گزر چکا ہوگا، اللہ کا نظام مقرر اور متعین ہے صرف انسان کو نہیں پتا کہ کسی لمحے موت آ جائے گی۔ کوئی بیمار ہو تو اس کی صحت کی فکر کی جاتی ہے اور صحت مند کی تو فکر ہی نہیں ہوتی لیکن موت ایسی چیز ہے کہ صحت مند کو بھی

بیٹھے بیٹھے دبوچ لیتی ہے اور بیمار کا بھی جب وقت آجائے تو اپنی گود میں سمو لیتی ہے۔ فرمایا، مجرمین کی تو موت پر اچانک آنکھ کھلتی تو کہتے ہیں یہ کیا ہو گیا: فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ تو اس وقت کہیں گے کیا ہمیں مہلت ملے گی؟ پھر کہتے ہیں یا اللہ! کیا ہمیں کوئی مہلت ملے گی؟ اب ہمیں سمجھ آئی ہے کہ قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا کیا اجر ہے اور عمل کرنے کا کیا اجر ہے دنیا میں تو ہمیں پتا ہی نہیں تھا۔ اب سمجھ آ گئی ہے۔ اب اگر ہمیں مہلت دے دے تو ہم واپس جا کر ساری کمی پوری کر لیں۔ جواب ہوگا: اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ تو کیا یہ ہمارے عذاب کو جلدی طلب کر رہے ہیں۔ کہا جائے گا تم وہی لوگ نہیں ہو جو دنیا میں کہتے تھے کہ کہاں ہے عذاب، لے آؤ اس عذاب کو جس سے ہمیں ڈراتے ہو۔ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ بھلا دیکھو اگر ہم ان کو برسوں فائدے دیتے رہیں۔ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ پھر ان پر وہ (عذاب) آ واقع ہو جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿۲۰۷﴾ تو جو (دنیا کے) فائدے یہ اٹھاتے رہے ان کے کس کام آئیں گے؟

آپ نے دیکھا ہم نے انہیں برسوں مہلت دی۔ سالوں تک یہ زندہ رہے۔ ان پر انبیاؑ بھیجے، کتابیں نازل کیں۔ اس وقت تو انہوں نے مان کر نہ دیا اب کہتے ہیں مہلت دے دیں۔ پھر اللہ نے انبیاؑ کی زبانی اپنی کتابوں میں جن عذابوں کا ذکر کیا تھا جب وہ آ گیا تو کفر پر ہی مرے، اب شور کرنا کیسا! دنیا میں تو بہت اکڑتے تھے کہ ان کے پاس اقتدار تھا، حکومت تھی، دولت و طاقت تھی۔ اس سب کا کیا فائدہ کہ ساری زندگی انہی کے پیچھے سرگرداں گزار دی اور میرا قرآن پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کی کوشش ہی نہ کی توفیق ہی نہ ہوئی تو وہ عہدے، حکومتیں اور مال و دولت کہاں ہے اور کس کام آئی؟

اللہ کریم کے کرم کی تو کوئی حد ہی نہیں کوئی کنارا ہی نہیں۔ اللہ نے کبھی کسی کو عذاب نہیں دیا جب تک ان پر حق واضح کرنے کا اہتمام نہیں کر دیا۔ فرمایا: وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۸﴾

اور جو بستیاں ہم نے ہلاک کیں ان میں (انجامِ بد سے) ڈرانے والے (پیغمبر) بھیجے تھے۔ ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۰۹﴾ تاکہ نصیحت حاصل کریں اور ہم زیادتی کرنے والے نہیں۔

ہم نے تو دنیا میں پورا اہتمام کر دیا کہ حق کی آواز اُن تک پہنچتی رہی۔ نصیحت کرنے والے اللہ کی طرف سے نصیحت کرتے رہے۔ اللہ کے نبی راہنمائی فرماتے رہے۔ فیصلہ ان کا اپنا تھا نتیجہ ان کے فیصلے پر مرتب ہوا۔ فرمایا، ہم کسی سے زیادتی کرنے والے نہیں۔ اللہ کو زیب ہی نہیں دیتا کہ وہ کسی سے زیادتی کرے۔ مخلوق کی حیثیت ہی کیا ہے۔ لوگ اپنے ساتھ خود ظلم کرتے ہیں۔ نافرمانی کر کے، کفر کر کے اپنے اوپر بوجھ لادتے چلے جاتے ہیں یہ نہیں سوچتے کہ ان گناہوں کے عذاب سے جان کیسے چھوٹے گی۔ منکرین کیسی گھٹیا بات کہتے ہیں کہ انہیں تو شیطان باتیں

سکھا جاتا ہے (معاذ اللہ) تو دراصل ان کی اس بات سے ان کا خبث باطن ظاہر ہوتا ہے۔ جو کسی کا مزاج ہوتا ہے وہی اس کے کردار اور اور گفتار سے ظاہر ہوتا ہے۔ شیطان سراپا برائی ہے بات بھی کرے گا تو بری ہی کرے گا۔ کفار کا یہ کہنا انتہائی لغو بات ہے۔ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾

فرمایا، شیطان اس کو لے کر نہیں آیا۔ شیطان کا یہ کام ہی نہیں۔ وہ برائی کا مرکز ہے۔ وہ اچھائی کیسے کر سکتا ہے؟ اس کا تو یہ حال ہے کہ وہ نیکی کی استطاعت کھو بیٹھا ہے اب وہ مجسم برائی ہے۔ وہ برائی ہی کر سکتا ہے نیکی کر ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ شیطان کو اللہ نے نیک بات سننے سے بھی محروم کر دیا ہے۔ نیک بات کہنا تو دور کی بات ہے اس پر عمل کرنا اور دور کی بات وہ تو نیک بات، بھلی بات سننے سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ اس کی سزا یہ ہے کہ وہ بھلی بات سن بھی نہیں سکتا۔ وہ قرآن کیا لائے گا وہ تو قرآن سننے سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾

ساری تعلیمات کا ماحصل یہ ہے کہ اپنی ساری امیدیں اللہ کریم سے وابستہ کر لی جائیں۔ اللہ کے سوا کسی سے امید نہ رکھی جائے۔ دنیا عالم اسباب ہے۔ اسباب اختیار کرنا عبادت ہے۔ اسباب اختیار کر کے نتائج کی امید صرف اللہ پر ہو۔ تنگدستی آ جائے تو تو جائز وسائل اختیار کیے جائیں، محنت کی جائے اور امید اللہ کریم سے ہو۔ بیماری آ جائے تو علاج کے لیے صحیح طریقے اختیار کیے جائیں اور شفا کی امید اللہ کریم سے رکھی جائے۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ غربت آ جائے تو سود لے لیتے ہیں، ایک اور ذلت میں پھنس جاتے ہیں سود کا قرضہ ادا ہی نہیں ہوتا۔ جب سود لیا تو دوزخ میں چھلانگ لگا دی اب آگ ہی آگ ہے۔ ہر طرف سے بے سکونی ہے۔

فرمایا، اپنے قریبی لوگوں کی اصلاح کیجیے۔ اپنے والدین پر محنت کیجیے۔ اپنی اولاد کی اصلاح کیجیے۔ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ محنت کیجیے۔ جو قریبی ہیں ان کا زیادہ حق بنتا ہے۔ بلاشبہ تبلیغ بہت بڑا کام ہے۔ انبیاؑ کا مشن ہے یہ دین ہے کہ اللہ کی بات، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات لوگوں تک پہنچائے جائیں لیکن تبلیغ کے زیادہ مستحق آپ کے گھر والے اور رشتہ دار ہیں پھر بستی والے۔ یہ درست نہیں کہ اپنے گھر میں حرام پکتا رہے، بچے غلط کام کرتے رہیں اور بندہ تبلیغ کے لیے سفر پر روانہ رہے۔

ایک اپنا وجود ہے اور اہل خانہ وجود کا حصّہ ہیں، رشتہ دار قریبی ہیں۔ اگر آپ کا اپنا وجود اور وجود کے حصے غلاظت سے بھرے ہوں اور آپ لوگوں کو کہہ رہے ہوں کہ صفائی اچھی چیز ہے، صفائی اللہ کو پسند ہے تو یہ کہنا کیا ہوگا؟ ہر فرد کی زندگی میں اس کے اعزاء و اقرباء کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اگر وہ برائی کے راستے پر چلیں گے تو آپ کی زندگی بھی

ان سے متاثر ہوگی۔ان کا اثر آپ تک بھی آجائے گا لہٰذا ہر مسلمان کے لیے حکم ہے کہ اپنے ماحول کو یعنی اپنے گھر اپنے خاندان کو پاک رکھیں۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾ اور جو لوگ ایمان لا کر آپ کے پیرو ہو گئے ہیں ان سے شفقت سے پیش آیئے۔یعنی ان پر اپنی نگاہ کرم رکھیے انہیں اپنے دامان شفقت میں سمو لیجیے، انہیں اپنے بازوؤں میں لے لیجیے۔

کیا یہ آیہء کریمہ صرف صحابہ کرامؓ کے لیے تھی، کیا قرآن ہمیشہ کے لیے نہیں، کیا قرآن کی تعلیمات ہمیشہ کے لیے نہیں ہیں؟ آج بھی جو خلوص سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کرتا ہے وہ ایسے ہے جیسے اُسے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے بازوؤں میں لے لیا ہو، سینہء مبارکہ سے لگا لیا ہو۔جاننے والوں کے لیے تو یہ بہت بڑا انعام ہے۔دو جہاں سے بڑھ کر انعام ہے۔اس طرح احساس کریں تو پتا چلتا ہے کہ صلوٰۃ، روزہ، حلال حرام کی تمیز کرنا یہ بہت بڑا مقام ہے، بہت بڑا مرتبہ ہے۔اس کی قدر کرنی چاہیے۔اللہ کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے دامانِ شفقت میں سمو لینے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے یہ نہیں فرمایا کہ جو امیر ہو، با اثر ہو، دنیوی عہدہ رکھتا ہو تو اسے سینے سے لگا لیں۔ نہیں۔ایسا نہیں بلکہ فرمایا کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لا کر میری توحید، میری عظمت کا قائل ہو، میرے احکام کی اطاعت کرے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی غلامی کرے تو اسے اپنے سینے سے لگا لیں۔اس سے بڑے مقام کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ لیکن اگر لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی پیروی نہ کریں، نافرمانی کریں تو انہیں بتا دیجیے کہ تم جو کر رہے ہو میں اس سے الگ ہوں میرا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یہاں معیار بتا دیا گیا کہ کوئی مفلس ہے تو بھی اور اگر کوئی امیر ہے تو بھی معیار ایک ہی ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی غلامی کر لے وہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شفقت پا لے گا۔امیر ہونا عار ہے نہ غریبی اس راہ میں رکاوٹ ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲۱۷﴾ اور اللہ غالب مہربان پر بھروسہ کیجیے۔یعنی اپنا بھروسہ اس مالک پر رکھیے جو غالب ہے اور رحم کرنے والا ہے۔لوگوں کو توبہ کرنے کے لیے مہلت دیتا ہے، یہ بھی اللہ کی رحمت ہے۔وہ تو قادر ہے کہ جب چاہے کسی کو پکڑ لے۔اس سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں۔

الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۲۰﴾ فرمایا، وہ جو آپ کو عبادت میں کھڑے ہوتے وقت دیکھتے ہیں پھر نمازیوں کے ساتھ آپ کے اٹھنے بیٹھنے کو (دیکھتے ہیں) بے شک وہ خوب سننے والے جاننے والے ہیں۔یہاں مخاطب حضور صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں تو فرمایا جا رہا ہے کہ میں آپ کو ہر

حال میں دیکھتا ہوں۔ آپ سجدہ کرنے والوں، عبادت گزاروں، اللہ کو یاد کرنے والوں کے درمیان پھر رہے ہوتے ہیں۔ یقیناً وہ پاک ذات سننے والی، جاننے والی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس نے کسی سے سن کر جاننا ہے۔ وہ تو ہر بات کو ازل سے جانتا ہے۔ ہر ایک کے ارادے اور سوچ تک سے واقف ہے۔

یہ رکوع عظمتِ قرآن سے شروع ہوا کہ قرآن کریم کی عظمت یہ ہے کہ یہ اللہ کریم کی طرف سے نازل ہوا اور پورے رکوع میں تسلسل سے اللہ کریم کی عظمت کی طرف دعوت دی جارہی ہے۔ جو نہیں مانتے ان کے کردار پر بحث ہے اور ان کے انجام کی خبر دی گئی ہے۔ قرآنِ کریم توحید باری کی تعلیم دیتا ہے، ایمان بالرسالت کا تقاضا کرتا ہے۔ انجام کی خبر دیتا ہے انسانی تخلیق پر بحث کرتا ہے، انسانی زندگی کے جملہ امور پر بحث کر کے بہترین نظامِ حیات چھانٹ کر انسان کے سامنے رکھتا ہے۔ ہر کام کو کرنے کا صحیح ترین طریقہ اور سلیقہ سکھاتا ہے اور آسان ترین سلیقہ سکھاتا ہے۔ زندگی کے مقصد سے آگاہ کرتا ہے۔ مقصدِ حیات واضح کرتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ خالقِ کائنات سے جاملاتا ہے۔ اللہ کی ذات، اُس کی صفات، اللہ پر ایمان یہ سارے مراحل قرآن طے کرواتا ہے

کفار سے اور مشرکین سے جب کوئی جواب نہ بن پڑتا تو وہ یہ الزام لگاتے کہ یہ باتیں شیطان انہیں سکھا دیتا ہے پھر کہتے کہ یہ شعر و شاعری ہے اور شاعر کچھ بھی کہتے رہتے ہیں یہاں قرآنِ کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم لوگوں کو اس بات سے آگاہ نہ کر دوں کہ شیطان کیسے لوگوں پر نازل ہوتے ہیں؟ یعنی یہ درست ہے کہ شیاطین بھی باتیں سکھاتے ہیں۔ شیاطین بھی دل و دماغ میں بال ڈالتے ہیں لوگوں کو باتیں بتاتے بھی ہیں سکھاتے بھی ہیں تو وہ کون لوگ ہیں جن پر شیطان نازل ہوتے ہیں۔ لیکن جن پر شیطان نازل ہوتے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں؟ فرمایا! هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾

کیا میں تم کو بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں؟ میں تمہیں بتادوں شیطان کن لوگوں پر نازل ہوتے ہیں؟ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾ ہر جھوٹے گناہگار پر اترتے ہیں شیطان خود سراپا برائی ہے۔ سراپا کفر ہے اور کفر اور برائی سے بھلائی نہیں نکلتی وہ جتنا پھیلے گا کفر ہی پھیلے گا جتنی پھیلے گی برائی پھیلے گی، شیطان بات کرتا ہے بدکاروں سے اپنے جیسوں سے جن کا مزاج شیطانی ہو جاتا ہے جن کا دل سیاہ ہو کر شیطان کی طرح خراب ہو جاتا ہے جن کا کردار خراب ہو جاتا ہے جن کے نظریات اور عقائد بگڑ جاتے ہیں شیطان ان سے باتیں کرتا ہے۔ خلاف واقعہ بات کو اِفک کہتے ہیں جھوٹی بات کو افک کہا جاتا ہے اس لیے کسی پر بہتان لگانے کو افک کہتے ہیں جو برائی کوئی خود کرتا ہے اسے اِثم کہتے ہیں۔ یہاں ان لوگوں کی خصوصیت بیان کی گئی جن پر شیطان اترتے ہیں یعنی ایک تو جو بات کرتے ہیں وہ خلاف واقعہ اور جھوٹ ہوتی ہے جو کام کرتے ہیں وہ غلط ہوتا ہے بُرا ہوتا ہے ان کے اپنے لیے بھی بُرا ہوتا ہے اور

دوسروں کے لیے بھی بُرا ہوتا ہے سراپا تکلیف ہوتا ہے سراپا خطا ہوتا ہے جن لوگوں کا ایمان بھی خراب ہوتا ہے جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں غلط باتیں کرتے ہیں اور جن کا کردار بھی بُرا ہوتا ہے شیطان اُن سے باتیں کرتے ہیں۔ یُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ۝ جو (سنی سنائی بات ان کے) کان میں ڈالتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ اللہ کے نزدیک جھوٹ اتنی بُری چیز ہے کہ جب قوموں پر عذاب آیا تو فرمایا گیا، جھوٹ سنتے تھے اور حرام کھاتے تھے: سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ۔۔۔(المائدہ:42)

دو باتیں تھیں ان میں، کھانے میں حلال حرام کی پروا نہیں کرتے تھے ناجائز وسائل سے ناجائز ذرائع سے کماتے تھے یعنی حرام کھاتے تھے اور جھوٹ سنتے تھے جو جھوٹ سنتے تھے ان پر عذاب الٰہی نازل ہوا تو جھوٹ بولتے ہیں تو ان کا گناہ میں یا خطا میں درجہ کہاں پہنچ گیا؟ سنی سنائی بات کو آگے چلا دینا بھی جھوٹ ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ جو ہر سنی سنائی بات کو بلا تحقیق آگے بیان کر دیتا ہے یہ بھی جھوٹ ہے تو ایسے ہی لوگوں پر شیطان نازل ہوتے ہیں اور ان سے جو باتیں کرتے ہیں وہ بھی جھوٹ ہی ہوتا ہے وہ شیطان انہیں کوئی سچ نہیں بتاتے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شیطانوں کو خود کو کوئی علم نہیں ہوتا یہ چونکہ ہوا کی طرح سفر کر سکتے ہیں اس لیے یہاں سے بات سنی آگے سنا دی وہاں سے سنی ادھر سنا دی، اتفاقاً ان میں کوئی بات سچی نکل آئے ورنہ وہ بولتے جھوٹ ہی ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک بندہ جھوٹ بولتا رہے تو سو میں سے کوئی ایک بات اتفاقاً واقعہ کے مطابق بھی ہو جائے۔ حادثاتی طور پر ایسا ہو جانا ایک الگ بات ہے لیکن بولتے جھوٹ ہی ہیں۔ یُّلْقُوْنَ السَّمْعَ۔۔۔کانوں میں تو ڈالتے رہتے ہیں لیکن اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ پھر شیطان جن کے کان میں بات ڈالتا ہے کچھ شیطان کی سن لیتے ہیں کچھ وہ خود ملا لیتے ہیں اور اسے آگے چلا دیتے ہیں۔

شیطانی عملیات کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں اور لوگ ان پر جمگھٹا کیے بیٹھے رہتے ہیں، ہوتا یہی ہے کہ وہ بکتے رہتے ہیں اور لوگ تاویلیں نکال کر اپنے حالات پر منطبق کرتے رہتے ہیں اور جھوٹ کو مان کر عمر بھر عقیدہ بھی ضائع کیا، کردار بھی تباہ کیا، عمل بھی تباہ کیے، دولت بھی غلط کمائی اور اکثر اوقات آبرو بھی گنوا بیٹھے۔

دوسرا طبقہ شعراء کا ہے جو مبالغہ آرائی کرتے ہیں فرمایا: وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ۝ اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں اکثر گمراہ لوگ ہی ان کے پیچھے چلتے ہیں یعنی بندے کا پتا کرنا ہو تو یہ دیکھو اس کے اردگرد کون لوگ ہیں آپ کسی کو نیک دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ تلاش کریں کہ جن لوگوں سے اس کا میل جول اٹھنا بیٹھنا ہے کیا وہ نیک ہیں پھر تو یقیناً وہ بندہ نیک ہوگا، بدکاروں کا اٹھنا بیٹھنا میل جول بدکاروں میں ہوگا جس مزاج کا بندہ ہوگا اس مزاج کے لوگ اس کے گرد جمع ہوں گے تو فرمایا تم کہتے ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے شاعری کی، قرآن کریم

شاعری ہے! نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے گرد تو جو لوگ ہیں فرشتے بھی ان کے تقدس پر رشک کرتے ہیں، شاعروں کے اردگرد کل بدکار جمع ہوجاتے ہیں: يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ﴿۲۲۴﴾ گمراہ لوگ بھٹکے ہوئے لوگ ان کی باتیں سنتے ہیں۔ کیا سارے شاعر ایسے ہی ہوتے ہیں؟ نہیں قرآن نے آگے استثنیٰ دیا ہے شعر کی بہت سی قسمیں ہیں جنہیں اصنافِ شعر کہا جاتا ہے اسی طرح شاعروں کی بھی بہت سی قسمیں ہیں جنہیں بنیادی طور پر قرآن حکیم نے دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے ورنہ تو ہر ایک حصّے کے آگے پھر کئی حصے بن جاتے ہیں تو ایک حصہ تو وہ ہے فرمایا: اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ﴿۲۲۵﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ﴿۲۲۶﴾ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ شاعر ہر وادی میں جھانکتے ہیں خیالات اور تصوّرات اور معلومات اور واقعات کی ہر وادی میں جھانکتے ہیں اور وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ﴿۲۲۶﴾ اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو ناقابلِ عمل ہوتیں ہیں اور جو ہو نہیں سکتا جس پر خود عمل کر سکتے ہیں نہ دوسرا کر سکتا ہے۔ وہ بات قابلِ عمل ہوتی ہی نہیں ہے اور اسے بڑا کمال فن سمجھتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ بڑا کمال کر دیا۔ واہ واہ! کیا مصرعہ کہا کیا شعر کہہ دیا! حالانکہ وہ ساری خرافات ہوتی ہیں اور اس پر عمل کیا نہیں جا سکتا، عمل کرنا ممکن نہیں ہوتا وہ ایسی باتیں ہر شعبہ زندگی کے متعلق کہتے ہیں، خود کرتے کچھ بھی نہیں اپنی کسی بات پر بھی اُن کا کوئی عمل نہیں ہوتا۔ ناقابلِ یقین ہوتی ہیں۔

رگِ گل سے بلبل کے پَر باندھتے ہیں۔

کہاں سے رگِ گل نکلے گی اور بلبل کے پروں کو کون باندھے گا؟ فضول بات ہے۔ ایسی شاعری خرافات کا مجموعہ ہے۔ فضول باتیں ناقابلِ عمل باتیں ہیں ناقابلِ یقین باتیں ہیں تو یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں جھوٹے ہوتے ہیں، جھوٹے اور گمراہ لوگ ہی ان کے گرد جمع ہوجاتے ہیں لیکن سارے نہیں۔ کچھ شاعر ایسے بھی ہیں اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا۔۔۔ (ہاں) مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور کثرت سے اللہ کا ذکر کیا۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں نورِ ایمان نصیب ہے جو ایمان لائے وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۔۔۔ جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اتباع کیا۔ نیک کام، اچھا کام اور عمل صالح کا معیار کیا ہوگا؟ یہاں تو قرآن نے عمل صالح کہہ دیا اور انسانی مزاج یہ ہے کہ انسان جو کسی کو قتل بھی کر دے تو اس کے پاس جواز ہوتا ہے کہ میں نے ٹھیک کیا۔ ڈاکو کے پاس بھی، چور کے پاس بھی، بدکار کے پاس بھی۔ ہر انسان اپنے گناہ کا جواز لیے پھرتا ہے کہ یہی کرنا چاہیے تھا میں نے ٹھیک کیا سارے ہی ٹھیک کرتے ہیں تو پھر ٹھیک کام کیا ہوگا؟ بین الاقوامی طور پر عالمِ انسانیت میں ٹھیک غلط کا معیار کیا ہوگا؟ معیار وہ ہے جو قرآنِ کریم نے دے دیا ہے کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کیا ہے، کرنے کا حکم دیا ہے یا کسی نے کیا ہے تو اسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پسند کر لیا ہے تو یہ سارے اعمال صالح ہیں یعنی معیار یہ ہے کہ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کیا ہے یا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو پسند ہے وہ عمل صالح

ہے اس کے علاوہ سارے کام غیر صالح ہیں۔ کسی عمل میں صلاحیت تب پیدا ہوتی ہے جب وہ اتباع رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم میں کیا جائے۔ تو یہ بین الاقوامی اور دائمی معیار ہے بعثتِ عالی سے لے کر قیامت تک ایک ہی معیار ہے۔ میں نے بات کی، میرے منہ سے نکلی، کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے میں کرتا تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم پسند فرماتے کہ وہ صالح بات ہے، جس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناراض ہوتے وہ غیر صالح ہے، ہم نے تو کبھی خیال ہی نہیں تکلف ہی نہیں کیا کہ سارا دن کیا کہتے رہتے ہیں۔ مومن کو منہ کھولتے وقت سوچنا چاہیے کہ جو کہہ رہا ہوں۔ کیا یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے تابع ہے یا اس کے خلاف ہے ہم ایک اس بات کو اپنا لیں تو ہمارے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ سارے فساد ختم ہو جائیں بلکہ سارے فرقے ختم ہو جائیں اس ایک بات پر ہم جم جائیں تو ہم میں گروہ بندی اور فرقہ بندی بھی نہ رہے۔

فرمایا! شاعروں میں وہ بھی ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرتے ہیں وہ ٹھیک ہیں بندہ مخلوق ہے اس کی حسیات مخلوق ہیں اس کا علم مخلوق ہے اس کی نظر مخلوق ہے اس کا دل دماغ مخلوق ہے تو اللہ سے تعلق کیسے بنے؟ اللہ خالق ہے بندے کا اللہ سے تعلق کیسے ہو؟ فرمایا اللہ کے ذکر کے ذریعے، ایمان لانا بھی ذکر کا ایک درجہ ہے کہ اس میں اللہ کی یاد ہے۔ ہر ایک عبادت ذکر ہے۔ ہر نیک کام عملی ذکر ہے، ذکر الٰہی ہے کیونکہ اُس میں بھی اللہ کی یاد موجود ہے اس کے علاوہ قرآنِ کریم نے اسمِ ذات کے ذکر کی کثرت کا حکم دیا ہے۔ فرمایا: وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (سورۃ المزمل:8) اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کیجیے اور اتنا کیجیے کہ تَبَتَّلْ۔۔۔ یعنی کائنات سے انقطاع نصیب ہو جائے دل میں، دماغ میں صرف اللہ رہ جائے۔

فرمایا کچھ شاعر ایسے بھی ہیں جنہیں ایمان بھی نصیب ہے اور وہ اعمال بھی نیک کرتے ہیں اللہ کو یاد بھی کرتے ہیں وہ ٹھیک شاعری کرتے ہیں۔ ان کے شعر ایسے نہیں ہوتے جو نا قابلِ عمل ہوں ان کی باتیں ایسی نہیں ہوتیں جو نا قابلِ یقین ہوں اور پھر وہ بات وہاں کرتے ہیں جہاں ان کو حق پہنچتا ہو جیسے صحابہ کرامؓ میں بھی شعراء تھے وَانْتَصَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا۔۔۔ وہ اللہ کی عظمت اور حمد بھی بیان کرتے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعت بھی بیان کرتے تھے کافروں کی ہجو کا بھی جواب دیتے تھے اور فرمایا وہ بھی ان کا حق بنتا ہے اس لیے کافروں نے ان پر ظلم کیے انہیں مکہ مکرہ سے اپنے شہر سے نکال دیا۔ ہجرت پر مجبور کیا پھر وہاں بھی ان پر حملہ آور ہوتے رہے پھر ان کی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجو کہہ کر مسلمانوں کی توہین کرتے تھے، صحابہؓ نے جواب میں ان کی ہجو کی انہیں اس کا حق پہنچتا تھا۔

نعت کا مطلب ہے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعریف، اب حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعریف کوئی کیا کرے گا! حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعریف وہ ہے جو ربّ العالمین نے فرمائی ہے قرآن کریم میں جگہ جگہ، جا بجا ہر ہر پارے، ہر رکوع میں کہیں نہ کہیں، فرمایا پوری زندگی کا ہر عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے تابع ہو، اب اس سے بڑی نعت کیا ہوگی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ہر لفظ نورِ یقین سے بھرا ہوا ہے ہر کام ایمان کا مظہر اور ایمان کی دلیل ہے۔ یہ تعریف کرنا تو نعت ہے یہ جو آج کل نعت بن گئی ہے کہ ہندوستانی گانوں کی طرز پر گایا جاتا ہے اور مانگنے کے لیے نعت کہی جاتی ہے جیسے یہ مصرعہ ''بھر دے جھولی میری'' کیا غضب ہے اور کس چیز سے بھر دے؟ وہ خواہشات کیا ہیں؟ بندہ سنے تو حیران رہ جائے یہ نعت نہیں، یہ خرافات ہیں فضولیات ہیں۔ نعت صرف وہ ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کی جائے اور وہ تعریف کی جائے جو اللہ نے کی ہے جو مدح وثناء قرآن کریم نے کی ہے اللہ کریم نے فرمائی ہے جو مدح وثناء حدیث شریف میں ملتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ عالی پر جو عطا ہوئی، اللہ کے جو احسانات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے بیان فرمائے ہیں ان کو منظوم کرنا نعت کہلاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے اتباع کے لیے لوگوں میں تحریک پیدا کرنا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی فضیلت بیان کرنا نعت کہلاتا ہے اور نعت کے نام پر اپنی دنیوی خواہشات کو گا گا کر بیان کرنا کہ مجھے وہ دے دو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی نعت نہیں ہے۔ ان کی اپنی خواہشات ہیں اسے نعت کا نام دے دیتے ہیں تو یہ تمیز کرنی چاہیے۔ نعت کے نام پر دنیوی خواہشات مانگنے والے اس پہلی قسم کے شاعروں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اعمال اچھے کرتے ہیں ان کا کردار صحیح ہوتا ہے ان کے شعروں میں تو اللہ نے برکت رکھی ہے اور کتنے لوگ ان کے شعروں سے سدھر جاتے ہیں ایمان لے آتے ہیں اور ان کے کردار کی اصلاح ہو جاتی ہے وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا۔۔۔ وہ لوگ جن پر کفار نے ظلم کیا تو اللہ نے ان کی مدد کی اور وہ انہیں جواب دینے کے قابل ہوئے انہوں نے ان سے جہاد بھی کیے، قتال بھی کیے، اللہ نے ان کی مدد کی اور انہوں نے فتح بھی پائی تو ان کو جواب دینے میں انہوں نے شعر بھی کہے جواب دینا ان کا حق بھی بنتا تھا۔

اب رہ گیا وہ طبقہ جو اپنی غلط کاری پر مصر ہے فرمایا! وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾ اور ظالم عنقریب جان لیں گے کہ کس جگہ لوٹ کر جاتے ہیں۔ جو لوگ غلط کاری پر مُصر ہیں وقت آ رہا ہے وہ خود دیکھ لیں گے کہ وہ پلٹ کر کہاں پہنچے، انسانی زندگی ہے، ہر بندہ فنا سے وجود میں آیا۔ عدم تھا، کچھ نہیں تھا۔ اللہ نے پیدا کر دی۔ اپنی اپنی باری پر ہر کوئی دنیا میں آ رہا ہے کوی باپ کی پشتوں میں ہے کوئی ماں کی پیٹوں

میں ہے کسی کے اجزاء ابھی زمین میں منتشر ہیں انسان کے اجزاء کہیں گندم کی صورت میں کہیں پھلوں سبزیوں کی صورت میں پڑے ہیں کسی کے (سیل) خلیات مٹی میں پڑے ہیں کہیں جانوروں کے گوشت میں ہیں وہ سارے اکٹھے ہوتے ہوئے آخر انسان بنتا ہے پھر وہ بچہ ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے، بوڑھا ہو جاتا ہے پھر واپس عدم میں ہی چلا جاتا ہے، عدم سے آیا تھا واپس عدم میں چلا گیا اب اس کا عدم کیا ہے؟ جہاں وہ جاتا ہے وہ کیا ہے؟ جہاں سے آیا تھا تو وہاں تو کچھ نہیں تھا۔ جہاں واپس آ گیا ہے فرمایا، وہاں اس کو اس کے کردار کے مطابق جگہ ملے گی اس نے دنیا میں جیسا کیا ہے اس کے مطابق وہ جگہ ملے گی۔ اچھا کیا ہے تو انجام اچھا ہوگا بُرا کیا ہے تو انجام بُرا ہوگا۔ لہٰذا جب کفار اور بدکار اور بُرے لوگ پلٹ کر آئیں گے تو انہیں خوب اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ وہ کہاں پہنچے وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا۔۔۔ زیادتی کرنے والے غلط کام کرنے والے عنقریب جان لیں گے اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ﴿۲۲۷﴾ کیسی جگہ پر وہ لوٹ کر پہنچے۔ ہمارا جو کردار ہے جو لفظ ہم کہتے ہیں، جو عمل ہم کرتے ہیں، جو بات ہم سوچتے ہیں، اس کا ایک نتیجہ ہے وہ جمع ہو رہا ہے جب آدمی یہاں سے واپس عدم کی طرف چلتا ہے تو آگے عدم نہیں ہے آگے پھر وہ مقام ہے جہاں ہماری زندگی کا کردار اور اس کا بدلہ جمع ہے وہاں پہنچیں گے تو پتا چل جائے گا کہ ہم نے کیا کیا اور اس کا نتیجہ کیا پایا۔

سورۃ النمل رکوع 1 آیات 1 تا 14

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰسٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۙ ﴿١﴾ هُدًى وَّبُشْرٰى
لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ ﴿٢﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ
هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿٣﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ
يَعْمَهُوْنَ ؕ ﴿٤﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ
الْاَخْسَرُوْنَ ﴿٥﴾ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ﴿٦﴾ اِذْ قَالَ
مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّىْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ
قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿٧﴾ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِىَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِى النَّارِ
وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨﴾ يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ۙ ﴿٩﴾ وَاَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ
يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۚ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۖ ﴿١٠﴾ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ
ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١﴾ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِىْ جَيْبِكَ
تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۚ فِىْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ
كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿١٢﴾ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ
مُّبِيْنٌ ۚ ﴿١٣﴾ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۚ ﴿١٤﴾

طٰسٓ۔ یہ قرآن اور روشن کتاب کی آیتیں ہیں ﴿۱﴾ ایمان والوں کے لیے ہدایت (کا سبب) اور خوشخبری سنانے والی ﴿۲﴾ وہ لوگ جو نماز کی پابندی کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ آخرت پر (پورا) یقین رکھتے ہیں ﴿۳﴾ بے شک جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ہم نے ان کے اعمال (بد) ان کی نظر میں پسندیدہ بنا رکھے ہیں پس وہ (ان میں) بھٹک رہے ہیں ﴿۴﴾ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے بُرا عذاب ہے اور آخرت میں وہ بہت بڑا نقصان اٹھانے والے ہیں ﴿۵﴾ اور یقیناً آپ کو قرآن (اللہ) حکمت والے (اور) علم والے کی طرف سے عطا فرمایا جاتا ہے ﴿۶﴾ جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ بے شک مَیں نے آگ دیکھی ہے مَیں وہاں سے (راستے کا) پتہ لاتا ہوں یا سلگتا ہوا انگارہ تمہارے پاس لاتا ہوں تاکہ تم تاپو ﴿۷﴾ جب وہ اس کے پاس آئے تو ان کو (اللہ کی طرف سے) آواز دی گئی، جو آگ کے اندر ہیں (فرشتے) ان پر بھی برکت ہو اور جو اس (آگ) کے پاس (موسیٰؑ) ہیں ان پر بھی اور پاک ہے اللہ جو جہانوں کا پروردگار ہے ﴿۸﴾ اے موسیٰ (علیہ السلام)! میں ہی اللہ ہوں (جو بے کیف کلام فرما رہا ہوں) غالب (اور) دانا ﴿۹﴾ اور اپنی لاٹھی ڈال دیں پس جب انہوں نے اس کو حرکت کرتے دیکھا جیسے اژدھا ہو تو پیٹھ پھیر کر بھاگے اور مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ (تو ارشاد ہوا) اے موسیٰ (علیہ السلام) ڈریے نہیں ہمارے حضور پیغمبر ڈرا نہیں کرتے ﴿۱۰﴾ ہاں جس نے ظلم کیا پھر برائی کے بعد اُسے نیکی سے بدل دیا تو بے شک میں بخشنے والا مہربان ہوں ﴿۱۱﴾ اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالیں وہ بے عیب روشن سفید نکلے گا (یہ دو معجزے) نو معجزوں میں (داخل ہیں) فرعون اور اس کی قوم کے پاس (جائیں) کہ یقیناً وہ بدکردار لوگ ہیں ﴿۱۲﴾ پھر جب ان کے پاس ہماری روشن دلیلیں پہنچیں تو کہنے لگے یہ صاف جادو ہے ﴿۱۳﴾ اور انہوں نے (جان بوجھ کر) ان (معجزات) کا انکار کیا ظلم اور تکبر سے اور ان کے دل ان کو مان چکے تھے سو دیکھ لیجیے فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا ﴿۱۴﴾

تفسیر ومعارف

سورۃ النمل شروع ہوتی ہے۔ یہ مکی سورتوں میں سے ہے اور سورۃ الشعرآء کے مضمون کو آگے بڑھا رہی ہے۔ قرآن کریم کی ترتیبِ نزول مختلف ہے جبکہ ترتیبِ کتاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم سے دی گئی۔ آیات کا نزول واقعات پر ہوا۔ جو واقعہ ہوا اس کے مطابق حکم نازل ہو گیا۔ قرآن کریم جس طرح سے علمِ الٰہی میں، لوح محفوظ میں موجود تھا اسی طرح سے بحکم الٰہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہر آیت کو اپنی اپنی جگہ ترتیب سے درج کرایا۔ سورۃ الفاتحہ سے والنّاس تک تمام ترتیب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے دی۔

سورۃ النمل چونکہ سورۃ الشعرآء سے متصل ہے چنانچہ اسی مضمون کو آگے بڑھا رہی ہے کہ یہ اعتراض کہ یہ قرآن محض شاعری ہے یا شیطانی القا ہے، اس کا جواب تو سورۃ الشعرآء میں دے دیا گیا اب یہاں قرآن کریم کی تعریف بیان کی جا رہی ہے۔

کتابِ مبین:

فرمایا: طٰسٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۱﴾ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴿۲﴾

طٰسٓ۔۔۔ یہ قرآن اور روشن کتاب کی آیتیں ہیں۔ ایمان والوں کے لیے ہدایت (کا سبب) اور خوشخبری سنانے والی۔

یہ قرآن کی آیات ہیں۔ یہ مُسَجَّع یا مُقَفّٰی عبارت یا شاعری نہیں ہے یہ قرانی آیات ہیں۔ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو روشن اور واضح ہے اور حقائق کو کھول کر بیان کر دیتی ہے اور روئے زمین کے ہر حصّے میں بسنے والے ہر انسان کے لیے قیامت تک کے لیے ہر کام کرنے کا صحیح طریقہ متعین کر دیتی ہے۔ هُدًى ۔۔۔ سے مراد بھی یہی ہے کہ ہر کام کو کرنے کا صحیح ترین طریقہ۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اقوامِ عالم کے ممالک مختلف ہیں، مزاج، رنگ اور زبانیں مختلف ہیں۔ ان کے موسم اور شب و روز کے اوقات مختلف ہیں۔ ان سارے اختلافات کے باوجود اس کتاب کا کمال یہ ہے کہ یہ سب کے لیے قابلِ عمل احکامات ارشاد فرماتی ہے۔ جس کام کو کرنے کا حکم دیتی ہے وہ کام ہر قوم، ہر ملک، مختلف موسم اور مختلف مزاج کے حامل لوگوں کے لیے کرنا ممکن ہے، آسان اور درست ہے اور جن چیزوں سے روک دیتی ہے وہ قیامت تک آنے والے ہر انسان کے لیے نقصان دہ ہے۔ اگر کوئی ان کو اپنائے گا تو نقصان ہی اٹھائے گا۔ یہ معمولی بات نہیں ہے اور ایسا وہی ہستی کر سکتی ہے جو اس کائنات کی خالق ہے، مالک ہے اور ہر متنفس کی ہر

ضرورت سے ہر آن آگاہ ہے۔

قرآنِ مبین کی ہر آیت ھدیٰ ہے اور جو اس کی بات پر ایمان لے آتے ہیں، یقین کر لیتے ہیں اُن کو بشارت بھی دیتی ہے۔ جب قرآن کی باتوں پر یقین نصیب ہوتا ہے تو توحید باری پر بھی یقین آ گیا، آخرت اور ضروریاتِ دین سب پر یقین آ جاتا ہے۔ سو فرمایا یہ مومنین کو خوشخبری بھی سناتی ہے کہ اگر وہ اس کا دامن تھام لیں گے اور زندگی اس کے مطابق بسر کریں گے تو یہ صرف راہنمائی ہی نہیں کرتی بلکہ یقینی نیک انجام کی خوشخبری بھی اُسی وقت دے دیتی ہے۔ یہ بشارت دیتی ہے کہ اگر ایسا کرو گے تو تمہیں یہ انعامات ملیں گے، تمہیں قربِ الٰہی نصیب ہوگا، تمہیں انبیاؑ کا قرب ملے گا، تمہیں جنت اور اس کی نعمتیں عطا ہوں گی۔ یہ کتاب محض راہنمائی نہیں کرتی بلکہ منزل کی نعمتوں سے آگاہ بھی کرتی ہے اور ماننے والوں کو ان نعمتوں کے ملنے کی خوشخبری بھی سناتی ہے۔

خوشخبری کن کے لیے؟

وہ لوگ جو ان آیات پر یقین کر لیتے ہیں اس قرآن کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں اور اللہ کی ذات وصفات کو ویسا مانتے ہیں جیسا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم منواتے ہیں۔ یہ مومنین کیسے لوگ ہوتے ہیں؟ فرمایا: الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ ۔۔۔ وہ لوگ جو نماز کے پابند ہیں۔

وہ لوگ زندگی کے تمام مسائل کا سامنا کرتے ہیں۔ ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے تگ ودو کرتے ہیں۔ روزگار کے کمانے کے مسائل ہیں، بچے پالنے ہیں، والدین کی خدمت بھی کرنی ہے، عزیز واقارب کے ساتھ رہن سہن لین دین کے بھی مسائل ہیں۔ قومی سطح پر بھی انہیں لین دین اور معاملات درپیش ہیں اور بین الاقوامی برادری میں بھی زندہ رہنا ہے۔ یہ ساری ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے صلوٰۃ کو قائم کرتے ہیں، نماز کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں۔ ایسا نہیں کرتے کہ فرصت ہوئی تو نماز پڑھ لیں گے۔ یہ رویہ ایمان کے منافی ہے۔ ایمان یہ ہے کہ نماز کے وقت اللہ کی بارگاہ کی حاضری کا یقینی طور پر پورے طور سے اہتمام کرتے ہیں۔ اُن کے یقین کی دلیل یہ ہے کہ عملاً اللہ کی اطاعت کرتے ہیں اور عبادات کی ادائیگی میں بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

فرمایا: وَیُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ ۔۔۔ اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ دنیا میں ہر انسان کو دولت کی ضرورت ہے۔ جس کے پاس تھوڑا ہے اُسے بھی ضرورت ہے اور جس کے پاس بہت زیادہ ہے اُسے بہت زیادہ ضرورت ہے۔ جو محض گزارا کر رہے ہیں انہیں بھی مزید کی خواہش ہے جن کے پاس حکومت اور سلطنت ہے وہ بھی مزید پانے کی تمنا رکھتے ہیں، بس کوئی نہیں کرتا۔

مومن جائز وسائل سے حلال رزق ضرور کماتا ہے پھر اس میں سے زکوٰۃ ادا کرتا ہے اس لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ رزق میرے پاس اللہ کی امانت ہے، یہ اللہ کا مال ہے اور اللہ نے مجھ پر زکوٰۃ فرض کر دی ہے۔ مومن اللہ کے حکم کے مطابق جس کا حق بنتا ہے اُسے دے دیتا ہے۔ گویا مومن صابر و شاکر ہے کہ اللہ کے حکم سے اپنے زائد از ضرورت مال سے دوسروں کی مدد کرتا ہے۔ مال کی محبت اس پر غالب نہیں ہے بلکہ اللہ کی اطاعت غالب ہے اور فرمایا: وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اور وہ آخرت پر پورا یقین رکھتے ہیں۔

یہ بات توجہ طلب ہے کہ اللہ اور اس کی ذات و صفات پر ایمان، قرآن پر ایمان، نبوت پر ایمان اور آخرت پر ایمان کی بات پہلے گزر چکی۔ جب ایمان کی بات آ گئی تو اس میں تمام ضروریاتِ دین کا اقرار آ گیا۔ اس کے باوجود فرمایا: وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اور وہ آخرت کا یقین رکھتے ہیں۔ یہ حق ہے کہ جب تک آخرت پر یقین نہ ہو توفیقِ عمل نہیں ہوتی۔ آخرت کا یقین ایمان کی بنیاد اور سب سے اہم جز ہے۔ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ ٹھیک ہے ہم آخرت کو مانتے ہیں لیکن آخرت کو کس نے دیکھا ہے؟ جائیں گے تو دیکھیں گے۔ ایسا کہنا کفر ہے اور یہ ایمان کو ضائع کر دیتا ہے۔ پہلی بات تو ہے کہ اللہ کریم نے بات بتا دی تو بات ختم۔ سب سے سچی بات اللہ کی ہے۔ دوسری بات جو وحی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلّم پر آئی اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے پوری دیانت اور امانت سے ہم تک پہنچا دی۔ اللہ کریم نے اس کی حفاظت کا اعلان فرما دیا تھا کہ اسے ہم نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے تو حق مکمل ہو گیا۔ یہ قرآنِ کریم کا معجزہ ہے کہ پندرہ سو سال عالم کفر نے اپنا پورا زور لگا لیا لیکن کوئی اس کا ایک نقطہ تک تبدیل نہیں کر سکا۔ قرآن من و عن وہی الفاظ ہیں جو اللہ کریم نے ارشاد فرمائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے لب ہائے مبارک سے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے سنے۔ اب جو قرآن میں بار بار آخرت کا ذکر ہو رہا ہے تو لوگ یہ کہیں کہ ہم دیکھیں گے تو مانیں گے پھر تو بات ہی ختم ہو گئی۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اللہ سے سنا یقیناً سارا حق تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسے یقینی طور پر پورے اعتماد سے لفظ بہ لفظ اللہ کی مخلوق تک پہنچا دیا۔ اس سب کے باوجود اللہ کریم آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو معراج پر لے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے شبِ معراج خود تشریف لے جا کر جنت و دوزخ کو ملاحظہ فرمایا۔ برزخ کے حالات بھی ارشاد فرمائے کہ کس گناہ کی پاداش میں کون کیا سزا بھگت رہا تھا۔ کچھ لوگوں کے حالات بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمائے۔ فرماتے ہیں کہ میں جنت کا معائنہ کر رہا تھا کہ مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی تو میں سمجھا آگے کوئی جا رہا ہے تو میں پہچان گیا کہ وہ بلالؓ کے قدموں کی چاپ تھی۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے خادمِ خاص تھے۔ کیسے لوگ تھے جو رہتے زمین پر تھے اور بستے جنت میں تھے۔ یہ تمام حقائق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے بچشم خود ملاحظہ فرمائے اور پھر سارے حالات بتائے سب کچھ من وعن پہنچا دیا تو پھر کوئی یہ کہتا ہے کہ جا کر دیکھیں گے تو پتا چلے گا یا لوگ کہتے ہیں کہ ''یہ جہاں میٹھا آخرت کو کس نے دیکھا؟'' کمال ہے، حد ہوگئی! اسی لیے قرآنِ کریم جگہ جگہ تلقین فرماتا ہے کہ آخرت پر پختہ یقین ہو اور انعامات پانے والے لوگوں کی یہ خصوصیت ارشاد فرمائی جارہی ہے کہ انہیں آخرت پر مستحکم یقین ہوتا ہے اور وہ اس کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ آنکھ بند ہوگی تو آنکھ کھل جائے گی یعنی موت کے ساتھ حقیقی زندگی شروع ہو جائے گی اور اگر دامن میں اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم ہوگا تو پیش کریں گے لہٰذا اس حاضری کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اطاعت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

ایک عجیب سزا:

اللہ کریم کا اپنا ایک نظام ہے اور اللہ کی سزائیں بھی عجیب ہیں۔ جو لوگ اس نظریے کے حامل ہوتے ہیں کہ جب آخرت آئے گی تو دیکھا جائے گا کہ وہاں کیا ہوگا ابھی تو اپنی مرضی سے کام کرلیں۔ جو ہمیں اچھا لگتا ہے وہ کام کرلیں اور اپنی من مانی کرلیں تو انہیں ان کے اعمال ایک عبرتناک سزا تک پہنچا دیتے ہیں۔ وطنِ عزیز میں بھی ایسے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے کہا کہ یہ وضو، یہ پانچ وقت کی نماز پڑھنا سارا فضول مشغلہ ہے۔ اُن کی رائے میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوئے تھے تو فراغت کا زمانہ تھا۔ لوگوں کے پاس کرنے کو زیادہ کام نہیں تھے۔ موسم آنے پر کھجوریں لگا دی جاتیں۔ لوگ تجارتی سفر پر چلے جاتے تو چونکہ لوگ نکمے ہوتے تھے انہیں وضو کا حکم دے دیا گیا اور نمازیں فرض کردی گئیں تاکہ مصروف رہیں۔ اب صبح اُٹھ کر شیو (Shave) کرتے ہیں تو وضو ہی ہے پھر دفتر جاتے ہیں تو دفتر کا پورا کام کریں تو یہ نمازیں ہوگئیں۔ یہ تعبیریں ہیں جو ہم نے کتابوں میں پڑھی اور سنیں بھی۔ اللہ کریم فرماتے ہیں: اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ زَیَّنَّا لَہُمۡ اَعۡمَالَہُمۡ فَہُمۡ یَعۡمَہُوۡنَ ﴿۴﴾ بے شک جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ہم نے ان کے اعمال (بد) ان کی نظر میں پسندیدہ بنا رکھے ہیں پس وہ (ان میں) بھٹک رہے ہیں۔

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ہم سزا کے طور پر اُن کی برائیوں کو اُن کی نظر میں خوبصورت بنا دیتے ہیں۔ جو جھوٹ وہ بولتے ہیں جو لکھتے ہیں جو برے کام کرتے ہیں وہ سب بطورِ سزا انہیں اچھے لگنے لگ جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے فاضل ہیں ہم بالکل صحیح کر رہے ہیں۔ یہ اللہ کریم کی سزا ہے۔

ہم میں سے ہر ایک کو یہ جان لینا چاہیے کہ جب گناہ میں لذت نصیب ہو اور دل گناہ کر کے خوش ہو تو سمجھ لو کہ یہ نئی آزماش آ گئی۔ اللہ نے میری نظر میں گناہ کو خوبصورت کر دیا ہے اس سے جان چھوٹنا مشکل ہو گی کہ یہ سزا ہے۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے انہیں اپنے برے کام بڑے خوبصورت لگتے ہیں اور وہ ان میں ہی زندگی ضائع کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو اپنی برائیوں پر فخر کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے میں نے اتنے بندے قتل کر دیے میں نے اتنے ڈاکے مارے میں تو اتنا نڈر ہوں۔ کوئی دوستوں میں بیٹھ کر بڑے فخر سے کہتا ہے کہ میں فلاں محکمے میں کام کرتا تھا میں نے کروڑوں غبن کر لیے اور میرا کسی نے کیا بگاڑ لیا؟ یعنی اُسے یہ خوف نہیں ہے کہ اس نے کسی کا حق مارا، حرام کھایا بلکہ اپنے کام پر فخر کر رہا ہے۔ دراصل گناہ پر فخر کرنا اللہ کے عذاب کی صورت ہے۔ جسے وہ اپنی بارگاہ سے دھتکار دیتا ہے اُسے گناہ خوبصورت لگنے لگ جاتے ہیں اور وہ اُسی میں عمر ضائع کر جاتا ہے۔ فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے بُرا عذاب ہے اور آخرت میں وہ بہت بڑا نقصان اٹھانے والے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے بدترین عذاب ہیں جو نہایت سخت ہوں گے۔ یہ لوگ آخرت کی کبھی نہ ختم ہونے والی دائمی زندگی میں سخت خسارے میں ہوں گے۔

قرآن کی عظمت:

گزشتہ مضمون میں تذکرہ چل رہا تھا قرآن کی حقانیت کا اور بدنصیب لوگوں کا جو اس پر ایمان نہیں لاتے بلکہ طرح طرح کی باتیں بناتے رہتے ہیں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ان کا کفر جحودی ہے۔ ان کا دل مانتا ہے مگر یہ ضد میں آ کر نہیں مانتے۔ اسی پیرائے میں فرمایا جا رہا ہے: وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝ اور یقیناً آپ کو قرآن (اللہ) حکمت والے (اور) علم والے کی طرف سے عطا فرمایا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے انکار سے قرآن کی صداقت پر تو حرف نہیں آ سکتا کہ یہ تو اس ہستی کی طرف سے نازل کیا جا رہا ہے جو صاحبِ حکمت ہے اور اس کا علم کامل اور اکمل ہے۔ اللہ کریم کا علم حضوری ہے، اس میں ماضی حال یا مستقبل نہیں ہے۔ وہ ہر بات کو جانتا ہے۔ جو ہو چکا ہے اُسے بھی جانتا ہے کہ ماضی بھی اس کی بارگاہ میں حاضر ہے۔ جو ہو رہا ہے وہ بھی اس کے روبرو ہے۔ ہر حال سے ہر ذرّے ہر ذی روح ہر مخلوق کی ہر حالت سے آگاہ ہے۔ اس کے سامنے مستقبل بھی حاضر ہے۔ اس علیم اور حکیم ہستی نے یہ کتاب نازل فرمائی ہے جس نے مخلوق کی زندگی اور آخرت کی کامیابی کی راہ بتائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع ہی وہ راہ ہے اور اس پر عمل تب نصیب ہوتا ہے جب آخرت پر یقینِ کامل نصیب ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر اس عظیم دانا تر اور سب سے زیادہ جاننے والی ذات نے قرآن کریم نازل فرمایا ہے۔ وہ لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں

جو اللہ کے نبیوںؑ پر ایمان لاتے ہیں اور جن کا تعلق اللہ سے بگڑ چکا ہوتا ہے وہ انتہائی بدنصیب ہوتے ہیں۔ اللہ کریم انہیں ایمان قبول کرنے کی توفیق نہیں دیتے اور اُن کے ایمان نہ لانے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے تبلیغ کرنے کے مجاہدے میں کمی آتی ہے نہ ہی قرآن کی شان میں بلکہ اُن کا کردار ہی اُن کے لیے راستے کی دیوار بن گیا ہے۔ اسی ضمن میں فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم دیکھ لیجیے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ پہلے انبیاؑ کے ساتھ بھی کفار کا یہی وطیرہ، یہی سلوک رہا ہے اور اس کا نتیجہ بھی دیکھ لیجیے جنہوں نے ایمان قبول نہیں کیا بالآخر رسوا ہو کر، تباہ و برباد ہو کر دنیا سے مٹ گئے۔ وہ آخرت پر ایمان نہیں لائے لہٰذا آخرت کے لیے کچھ بنایا نہیں اور دنیا کسی کے پاس رہی نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ:

اللہ تعالیٰ کی حکمت ہر کام کے ساتھ ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو مصر سے نکالا، فرعون کے گھر سے نکال کر حضرت شعیبؑ (علیہ السلام) کے گھر پہنچایا اور وہاں برسوں رکھا۔ آپؑ نے وہاں شادی کی اور اولاد ہوئی اور برسوں بعد واپس مصر جانے کا ارادہ فرمایا، گھر جانے کا ارادہ تھا۔ بیوی بچے اور خادم ہمراہ تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی اپنی حکمت ہے کہ چلتے چلتے انہیں رات ہوگئی سردی بھی تھی اور اندھیرا بھی، سو فرمایا: اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا۔۔۔ جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ بے شک میں نے آگ دیکھی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک وادی میں روشنی ہے تو سمجھے کسی نے آگ جلا رکھی ہے یقیناً وہاں کچھ لوگ ہوں گے سو آپؑ انہوں نے اہل خانہ سے کہا کہ مجھے آگ دکھائی دے رہی ہے، روشنی ہے۔ فرمایا: سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ۝ میں وہاں سے (راستے کا) پتا لاتا ہوں یا سلگتا ہوا انگارہ تمہارے پاس لاتا ہوں تاکہ تم تاپو۔ مفسرینِ کرام لکھتے ہیں کہ وہ راستے سے بھٹک کر وہاں جا پہنچے تھے یہ اللہ کریم کی اپنی شان ہے وہ انہیں وہاں لے جانا چاہتے تھے۔ اب ایک پریشانی تھی کہ رات کا اندھیرا اور ٹھنڈ بھی ہوگئی تھی اہل خانہ ہمراہ تھے اور راستہ بھی معلوم نہیں تھا۔ سو جب دور سے روشنی نظر آئی تو فرمایا کہ وہاں کسی نے آگ جلائی ہے شاید ہماری طرح کوئی مسافر ہو اور راستے کی خبر رکھتا ہو۔ میں اس سے راستے کی خبر بھی لاتا ہوں اور اگر خبر نہ بھی ملی تو آگ تو جل رہی ہے وہاں سے تمہارے لیے کوئی انگارہ اٹھا لاؤں گا تاکہ اس سردی میں تم لوگ آگ کو تاپ سکو۔ جب بچوں کو چھوڑ کر آگے بڑھے اور وادی میں قدم رکھا۔

فرمایا: فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ جب وہ اس کے پاس آئے تو ان کو (اللہ کی طرف سے) آواز دی گئی، جو آگ کے اندر ہیں

(فرشتے) ان پر بھی برکت ہو اور جو اس (آگ) کے پاس (موسیٰؑ) ہیں ان پر بھی اور پاک ہے اللہ جو جہانوں کا پروردگار ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وادی میں قدم رکھا تو انہیں من جانب اللہ آواز آئی، ہاتف کی آواز سنائی دی کہ موسیٰ (علیہ السلام) یہ آگ نہیں ہے یہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نور ہے اور اس کے اندر اور گرداگرد اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں اور وہ سب اللہ کے بابرکت بندے ہیں۔ جو اس آگ کے اندر ہیں یا اس کے اردگرد ہیں سب ہی بابرکت ہیں۔ اللہ پاک ہے جو سب جہانوں کا پالنہار ہے۔ اے موسیٰ (علیہ السلام) یہ وہ آگ نہیں ہے جس کا انگارہ لینے آپؑ آئے ہیں نہ ہی یہاں کوئی مسافر یا بندہ بیٹھا ہے۔ یہ تو تجلیاتِ باری ہیں اور اللہ کے فرشتے ہیں۔ اس کے اندر بھی بابرکت فرشتے ہیں اور اردگرد بھی بڑے مبارک فرشتے ہیں۔ اللہ کی برکات ہیں، جو پاک ہے اور سب جہانوں کا ربّ ہے۔

یہاں علمائے حق اور مفسرینِ کرام نے بڑی لمبی اور دلچسپ بحثیں لکھی ہیں۔ اُن کا بنیادی موضوعِ بحث یہ سوال ہے کہ وہ تجلیات اللہ کریم کی ذاتی تھیں یا صفاتی تھیں۔ اس پر بہت لمبی بحثیں ملتی ہیں اور ہر ایک نے اپنے اپنے دلائل بھی لکھے ہیں۔ اللہ کریم نے جو سمجھ مجھے عطا کی ہے، جو میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ صفاتی تجلی تھی۔ اللہ کریم اس چیز سے پاک اور بالاتر ہیں کہ ذاتی طور پر کسی شئے میں، درخت، جھاڑی یا شاخ میں ذاتی طور پر حلول کریں۔ اس کا ردّ تو یہاں کیا جا رہا ہے: سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۸ اللہ پاک ہے، جہانوں کا پروردگار ہے۔ ہر شئے اس کی مخلوق ہے، وہ خالق ہے، غیر مخلوق ہے اور خالق مخلوق میں نہیں سما سکتا۔ ذاتی تجلی کی بحث تو قرآن نے یہاں ہی ختم کر دی۔ اس کا مطلب ہے کہ بات ربوبیت کی ہو رہی ہے اللہ کی عطا کی ہو رہی ہے نیز یہ تعلیم کے لیے تھا۔ ربوبیت اللہ کی صفت ہے، سب کو پالنے والا ہے اور سب کی نگہبانی کرنے والا سو ارشاد ہوا: يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۹ اے موسیٰ (علیہ السلام)! میں ہی اللہ ہوں (جو بے کیف کلام فرما رہا ہوں) غالب (اور) دانا۔

اس بات سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ تجلی ذاتی تھی اور اللہ کریم اس تجلی سے بول رہے ہیں اور وہاں مقید ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے بلکہ فرما رہے ہیں کہ یہ سارے جلوے میں دکھا رہا ہوں۔ میں اللہ ہوں، غالب ہوں اور دانا تر ہوں جو چاہوں کر سکتا ہوں میں نے اپنی صفاتی تجلی میں سے آپؑ کو آواز دی۔ آواز اللہ کریم دے رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ میں اللہ ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ اس تجلی میں مقید ہو کر کہہ رہے ہیں۔ وہ تو اُن کی صفات کا ایک پرتو تھا۔ فرمایا، میں غالب ہوں حکمت والا ہوں یعنی جو کام مشیتِ باری کے مطابق ہوتا ہے اس میں اللہ کریم کی بے شمار حکمتیں ہوتی ہیں۔ انسان ان حکمتوں کو سمجھ سکے یا نہ سمجھ سکے لیکن اللہ کریم کی طرف سے صادر ہونے والا کوئی کام

حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اللہ کریم جو کرنا چاہیں اُسے کوئی روک نہیں سکتا کہ وہ غالب ہے۔ فرمایا، آپؑ میری قدرت کا تماشہ دیکھیں: وَاَلْقِ عَصَاكَ۔۔۔ اور اپنی لاٹھی پھینک دیجیے۔

مفسرینِ کرام نے تشریح فرمائی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کلامِ باری ہوتا تھا تو صرف یہ نہیں کہ اُنؑ کے کان سنتے تھے کہ کان تو خود مخلوق ہیں، اللہ جسے سنانا چاہتا ہے اس کا ہر ذرّہ بدن کان بن جاتا ہے۔ ایک ایک خلیہ (Cell) سنتا ہے۔ اللہ کسی کا محتاج نہیں ہے کہ کانوں سے سنوائے، یہ تو مخلوق کے لیے ہیں۔ اللہ جب سنوانا چاہتا ہے تو ہر ذرّہِ بدن سنتا ہے۔ جب ارشاد ہوا کہ قدرت کا تماشا دیکھنا چاہیں تو جو لاٹھی آپؑ کے ہاتھ میں ہے وہ پھینک کر دیکھیں۔ آپؑ نے لاٹھی پھینک دی: فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ۔۔۔ پس جب انہوں نے اس کو حرکت کرتے دیکھا جیسے اژدھا ہو: وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ۔۔۔ تو پیٹھ پھیر کر بھاگے اور مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ موذی جانور سے دور ہٹتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ لاٹھی اژدھا بن گئی ہے تو آپ علیہ السلام بھی اس سے پیٹھ پھیر کر دوسری طرف بھاگے اور مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیائے کرامؑ میں بھی انسانی فطری خصوصیات ہوتی ہیں اگر کہیں ان کا اظہار نہ ہو تو وہ بطور معجزہ ہوتا ہے۔

اللہ کریم نے فرمایا: يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ۔۔۔ (تو ارشاد ہوا) اے موسیٰ (علیہ السلام) ڈریے نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ انبیاؑ کے مزاجِ عالی میں بھی انسانی خصوصیات ہوتی ہیں اور انہیںؑ بھی سارے مراحل سے گزرنا ہوتا ہے۔ انہیں بھی گرمی سردی، بھوک پیاس، صحت، بیماری جھیلنا پڑتی ہے۔ انبیاؑ کو انسانوں کی طرح سوچنا اور رہنا ہوتا ہے کہ وہ بھی انسانوں میں سے ہوتے ہیں۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ موذی جانور سے دور بھاگا جائے سو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی ایسا ہی کیا۔

فرمایا: اِنِّیْ لَا يَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۰﴾ ہمارے حضور پیغمبرؑ ڈرا نہیں کرتے۔ اللہ کی بارگاہ میں جب آپ کے رسولؑ حاضر ہوتے ہیں تو پھر انہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انبیاؑ جس حضوری کی حالت میں بارگاہ الٰہی میں پیش ہوتے ہیں غیر اللہ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی اُن کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ نبیؑ تو معصوم عن الخطا ہوتے ہیں، معصوم ہوتے ہیں جن سے خطا کا صدور ممکن نہیں ہے اللہ کریم ہمیشہ ان کی حفاظت فرماتے ہیں۔

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱﴾ ہاں جس نے ظلم کیا پھر برائی

کے بعد اُسے نیکی سے بدل دیا تو بے شک میں بخشنے والا مہربان ہوں۔

میری بارگاہ تو ایسی عظیم الشان ہے کہ اگر کوئی شخص برائی ہی کرتا رہے اور برائیاں کرتا کرتا تھک جائے پھر اُسے کبھی احساسِ ندامت ہو اور وہ برائی سے توبہ کر کے نیکی شروع کر دے تو میں اُسے معاف کر دیتا ہوں کہ میں معاف کرنے والا بخشنے والا مہربان ہوں۔ سو انبیاؑ اور رسولوں کو میری بارگاہ میں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے یہاں توبہ کی وضاحت بھی ہو گئی کہ توبہ ایک زبانی قول کا نام نہیں ہے بلکہ توبہ کا مطلب ہے کہ دل میں گناہ پر ندامت ہو اور ایسی ندامت ہو کہ وہ عمل پر اثر انداز ہو۔ انسان برائی ترک کر کے نیکی اختیار کر لے تو فرمایا کہ پھر کوئی یہ نہ دیکھے کہ گناہ کتنے بڑے ہیں بلکہ یہ دیکھے کہ میری رحمت کتنی وسیع ہے، میں سب کو معاف کر دیتا ہوں۔

معجزاتِ موسیٰ علیہ السلام:

فرمایا کہ میری قدرت کے اور نظارے دیکھیے: وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ۔۔۔ اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالیں وہ بے عیب روشن نکلے گا۔

آپ علیہ السلام اپنا ہاتھ اپنے دامن میں، بغل میں ڈالیے تو وہ چاند کی طرح روشن بلکہ چاند میں تو کچھ داغ بھی نظر آتے ہیں آپؑ کے ہاتھ میں کوئی داغ بھی نظر نہیں آئے گا، ایسا روشن ہو جائے گا۔ فرمایا: فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ۔۔۔ (یہ دو معجزے) نو معجزوں میں (داخل ہیں)۔

آپ علیہ السلام کو نو معجزے دیے گئے۔ دو معجزوں کی تفصیل تو یہاں بتا دی اب ان دو کے سمیت کُل نو عطا کیے ہیں یا ان کے علاوہ نو عطا کیے اس کی تفصیل اس آیہ کریمہ میں نہیں آئی۔ اس کی تفصیل ایک اور مقام پر ملتی ہے۔ فرمایا: اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۱۲﴾ فرعون اور اس کی قوم کے پاس (جائیں) کہ یقیناً وہ بدکردار لوگ ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ارشاد فرمایا کہ آپؑ فرعون اور اس کی قوم کے پاس تشریف لے جایئے کہ وہ قوم اللہ کی نافرمانی میں دھنس چکی ہے اور برائی ہی اس کا شعار بن چکا ہے۔ فرعون بھی ایک بہت طاقتور حکمران تھا جس کے پاس ایک عظیم الشان سلطنت تھی۔ فرعون ایک جابر مطلق العنان بادشاہ تھا جس کے پاس بہت بڑے لاؤ لشکر اور شاہی خزانے تھے، بہت عالی شان محلات تھے۔ وہ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں خدائی کا دعویٰ کرنے والا متکبر انسان تھا جو اپنی ذات کو سجدہ کرواتا تھا۔ قرآن میں ذکر آتا ہے: فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (النّٰزِعٰت:24) اس نے کہا میں تمہارا سب سے بڑا پالنہار ہوں۔ یعنی اگر کوئی اور ربّ ہے بھی تو میں اس سے بھی بڑا ہوں سب سے اعلیٰ ہوں۔

اللہ کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دے رہے ہیں کہ آپؑ اس متکبر بادشاہ کی طرف جایئے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو مثال پیش کی جارہی ہے کہ یہ لوگ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی عظمت کا انکار کررہے ہیں، قرآن کی عظمت کا انکار کررہے ہیں یہ نئی بات نہیں ہے۔ ایسا ہوتا آیا ہے لیکن اللہ کی شان دیکھیے۔ اب موسیٰ علیہ السلام دنیوی اختیار سے تہی دست ہیں کوئی فوج یا لاؤلشکر نہیں ہے، نہ ہی کوئی دولت ہے کچھ بھی نہیں ہے۔ اللہ کا نام ہے اور اللہ نے ایسے کمالات عطا فرما دیے ایسے معجزات عطا فرمائے جو عقل کی گرفت سے باہر ہیں۔ ہر دور میں جس قسم کے کمالات لوگوں میں ہوتے اسی قسم کے معجزات اُن قوموں کی طرف مبعوث ہونے والے انبیاؑ کو عطا کیے جاتے۔ فرعون کے زمانے میں جادو اور جادوگروں کا بہت زور تھا اور وہ اپنے فن میں بڑے ماہر تھے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کریم نے ایسے معجزات عطا فرمائے جو جادوگروں کی عقل سے بالاتر تھے۔ چنانچہ یہ معجزات عطا کر کے حکم دیا گیا کہ فرعون کے پاس جائیں۔ وہ اپنی خدائی کا دعویدار ہے۔ آپ علیہ السلام اُسے دعوت دیں کہ وہ بھی اللہ رب العالمین کو مان لے اور اس کی بارگاہ میں خود سجدہ ریز ہوجائے۔ فرمایا: فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾ پھر جب اُن کے پاس ہماری روشن دلیلیں پہنچیں تو کہنے لگے یہ صاف جادو ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حوصلہ افزائی فرمائی جارہی ہے اس لیے یہاں واقعہ نقل نہیں کیا گیا بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ فرعون کتنی بڑی طاقت تھی۔ اللہ کے رسولؑ اور اللہ کے نبیؑ بڑی بڑی طاقتوں کے پاس محض اللہ کے بھروسے پر جاتے رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بغیر کسی لاؤلشکر کے وہاں پہنچے اور بڑے ڈٹ کر کاوش کرتے رہے۔ ان کے معجزات اور دعوت بہت روشن، واضح تھی لیکن فرعونیوں نے ماننے سے انکار کردیا اور کہا کہ یہ تو صاف جادو ہے۔ اسی طرح جب آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے دین پیش فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس بھی کوئی دنیوی طاقت نہیں تھی۔ کوئی لاؤلشکر تھا نہ ہی دولتِ دنیا تھی۔

کفرِ جحودی:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا فرعونیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کہہ دیا کہ یہ تو صاف صاف جادو ہے۔ فرمایا: وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴﴾ اور انہوں نے (جان بوجھ کر) ان (معجزات) کا انکار کیا ظلم اور تکبر سے اور انکے دل ان کو مان چکے تھے سو دیکھ لیجیے فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا۔

ان فرعونیوں کے دل تو مان گئے تھے کہ یہ جادو نہیں ہے بلکہ اللہ کے نبیؑ کا معجزہ ہے لیکن محض ضد اور عناد میں آ

کرانہوں نے انکار کر دیا۔ اسے کہتے ہیں کفرِ جحودی کہ دل مان رہا ہے لیکن ضد میں کفر کی راہ اپنائی جائے۔ دل مان رہا ہو کہ بات سچی ہے لیکن اگر مانیں گے تو ہماری شان میں کمی آئے گی لہٰذا نہیں مانیں گے بلکہ مقابلہ کریں گے، یہ کفر جحودی ہے۔ فرعونیوں نے بھی کفر کا انتخاب کیا، ظلم کیا، اپنی بڑائی کے اسیر ہو گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے بعد ایک دن ابوجہل بہت پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ ابوجہل کا ایک دوست آیا اور اُسے پریشان دیکھ کر اس کے پاس بیٹھ گیا کہنے لگا، تم اس وادی کے سردار ہو، تمہارا یہاں حکم چلتا ہے تم ابوالحکم کہلاتے ہو اور ایک نوجوان کی وجہ سے پریشان ہو۔ ساری وادی تمہارے قدموں میں ہے جس کی چاہو گردن اڑا دیتے ہو کوئی تمہیں پوچھنے والا نہیں ہے اور تم ایک نوجوان کے ہاتھوں پریشان بیٹھے ہو؟ اگر وہ تمہارے خلاف ہے تو ایک بندہ ہی ہے اسے قتل کر دو۔ اس پر ابوجہل کہنے لگا کہ تمہارا کیا خیال ہے میں نے کوئی کسر اٹھا رکھی ہے؟ میں پوری کوشش کر چکا ہوں لیکن کمال یہ ہے کہ وہ اللہ کا سچا نبیؐ ہے اس لیے ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اللہ اس کے ساتھ ہے۔ وہ دوست بہت حیران ہوا اور کہنے لگا کہ کیا تجھے پتا ہے کہ وہ اللہ کا سچا نبیؐ ہے؟ ابوجہل کہنے لگا اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم نے اب تک قصّہ تمام نہ کر دیا ہوتا، اللہ اس کی حفاظت کرتا ہے، ہم اللہ سے کیسے مقابلہ کریں؟ اس کے دوست نے کہا، ظالم! اگر جانتا ہے کہ سچا نبیؐ ہے تو مان کیوں نہیں لیتا؟ کہنے لگا مان لیں گے تو پھر ہم تو مِٹ جائیں گے ہم تو پھر اس کے غلام ہو جائیں گے اور ہماری حیثیت ختم ہو جائے گی۔ ہم حکومت سے اتر کر غلامی میں آ جائیں گے۔ یہ ہے کفر جحودی۔

فرمایا کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم دیکھ لیجیے کہ فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا، نتیجہ کیا ہوا؟ موسیٰ علیہ السلام کامیاب ہوئے اور فرعون اور اس کی قوم کس ذلت و رسوائی سے غرقِ آب ہو گئے، تباہ ہو گئے اور اُن کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ اپنے سارے محلات، خزانے، باغات اور چشمے پھر اُنہی لوگوں کے لیے چھوڑ گئے جن پر ظلم کیا کرتے تھے۔

سورۃ النمل رکوع 2 آیات 15 تا 31

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰي وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾ وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۣ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَاۗىِٕبِيْنَ ﴿۲۰﴾ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاْذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۱﴾ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۲﴾ اِنِّىْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا

تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۶﴾ قَالَ
سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ
اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ
اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾
اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

اور بے شک ہم نے داؤد اور سلیمان (علیہما السلام) کو علم عطا فرمایا اور انہوں نے کہا اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا فرمائی ﴿۱۵﴾ اور سلیمان (علیہ السلام) داؤد (علیہ السلام) کے وارث ہوئے اور فرمایا اے لوگو! ہم کو پرندوں کی بولی تعلیم کی گئی ہے اور ہم کو ہر چیز عطا فرمائی گئی ہے بے شک یہ ہی بہت بڑا فضل ہے ﴿۱۶﴾ اور سلیمان (علیہ السلام) کے لیے جنوں، انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے پس وہ قسم وار کھڑے کیے جاتے تھے ﴿۱۷﴾ یہاں تک کہ جب چیونٹیوں کے میدان میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا اے چیونٹیو! اپنے اپنے بلوں میں داخل ہو جاؤ، کہیں تم کو سلیمان (علیہ السلام) اور ان کے لشکری کچل نہ دیں اور ان کو اس کی خبر بھی نہ ہو ﴿۱۸﴾ تو وہ اس کی بات پر مسکراتے ہوئے ہنس پڑے اور عرض کرنے لگے اے میرے پروردگار! مجھے توفیق عنایت فرمایے کہ جو احسان آپ نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائے ہیں ان کا شکر ادا کروں اور یہ کہ نیک کام کروں جس سے آپ خوش ہوں اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرمایے ﴿۱۹﴾ جب انہوں نے پرندوں کا جائزہ لیا تو فرمایا کہ کیا وجہ ہے کہ ہُدہُد نظر نہیں آتا یا کہیں غائب ہو گیا ہے؟ ﴿۲۰﴾ مَیں ضرور اُسے سخت سزا دوں گا یا اُسے ذبح کر ڈالوں گا یا (اپنی بے قصوری کی) میرے سامنے صاف دلیل پیش کرے ﴿۲۱﴾ سو تھوڑی ہی دیر میں وہ آ گیا اور کہنے لگا، مَیں ایسی خبر لایا ہوں جس کے بارے آپ کو علم نہیں اور مَیں آپ کے پاس (شہر) سبا سے ایک یقینی خبر لایا

ہوں ﴿۲۲﴾ مَیں نے ایک عورت کو دیکھا ہے وہ ان پر بادشاہی کر رہی ہے اور اس کو ہر چیز میسر ہے اور اس کا ایک بہت بڑا تخت ہے ﴿۲۳﴾ اور مَیں نے پایا (دیکھا) کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال ان کو آراستہ کر کے دکھائے ہیں پھر ان کو راستے سے روک رکھا ہے۔ سو وہ (سیدھے) راستے پر نہیں ہیں ﴿۲۴﴾ کہ اُس اللہ کو سجدہ نہیں کرتے جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں (جیسے بارش اور نباتات) کو باہر لاتے ہیں اور تمہارے پوشیدہ اور ظاہر اعمال سے باخبر ہیں ﴿۲۵﴾ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہی عرشِ عظیم کا مالک ہے ﴿۲۶﴾ انہوں نے فرمایا اچھا دیکھیں گے تُو نے سچ کہا یا تُو جھوٹوں میں سے ہے ﴿۲۷﴾ یہ میرا خط لے جا پھر اُن کی طرف ڈال دے پھر اُن کے پاس سے واپس آ تو دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں ﴿۲۸﴾ اُس عورت (ملکہ) نے کہا اے سردارو! بے شک میرے پاس ایک بہت باوقعت خط ڈالا گیا ہے ﴿۲۹﴾ بے شک وہ سلیمان (علیہ السلام) کی طرف سے ہے اور (مضمون) یہ ہے کہ شروع اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم کرنے والے ہیں ﴿۳۰﴾ (بعد اس کے یہ) کہ مجھ سے سرکشی نہ کرو اور میرے پاس مطیع ہو کر چلے آؤ ﴿۳۱﴾

تفسیر ومعارف

انبیاؑ کی دولت علم:

انبیاؑ کو جو دولت اللہ کریم کی طرف سے ملتی ہے وہ علم ہوتا ہے اور عقائد سے لے کر اعمال تک جو علم عطا ہوتا ہے وہ انبیاؑ کا حال بن جاتا ہے۔ وہ صرف کہتے نہیں، کرتے ہیں۔ دنیا میں ایسے نبیؑ بھی گزرے ہیں جن پر کوئی ایک شخص بھی ایمان نہیں لایا لیکن وہ خود اپنی شریعت پر پوری طرح عمل بھی کرتے رہے۔ لوگوں نے رکاوٹیں ڈالیں، مقابلے کیے، تکلیفیں پہنچائیں لیکن کسی نبیؑ نے اپنی شریعت پر عمل میں سستی نہیں کی اس لیے کہ ان کے پاس علم تھا جو اللہ کریم نے انہیں عطا فرمایا تھا۔

ہم لوگوں سے ایک غلطی ہوتی ہے کہ ہم صرف جاننے کو علم سمجھتے ہیں کہ کسی نے کوئی بات سیکھ لی ہے وہ اس کا عالم ہو گیا۔ یہ درست نہیں بلکہ یہ جاننا صورتِ علم ہے، حقیقتِ علم نہیں ہے یہ اخبار ہیں۔ ہمارے پاس بہت سی خبریں جمع ہو گئیں بہت سی چیزوں کے بارے اطلاع مل گئی اگر وہ حال بن جائیں تو علم ہیں ورنہ محض خبریں۔ اخبار میں روزانہ کتنی خبریں چھپتی ہیں لیکن اس سے کاغذ کو کیا فرق پڑتا ہے کاغذ تو کاغذ ہے، نہ چھاپو تو بھی کاغذ کو فرق نہیں پڑتا۔

اسی طرح ذہن تک معلومات جمع ہو جائیں تو خبریں ہیں اور اگر وہی حال بن جائیں عمل پر لگا دیں تو علم ہے۔ ہمارے ہاں بڑے پڑھے لکھے لوگ ہیں، Ph.d ہوتے ہیں لیکن اُن کی عملی زندگی کو دیکھیں تو اکثر بھٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ انہیں عقائد کی خبر ہوتی ہے نہ احوال کی بلکہ اپنے اندازے سے نیکی بدی کے فیصلے کرتے رہتے ہیں۔

اگر برائی کی خبریں حال بن جائیں تو بھی وہ علم نہیں کہلائے گا بلکہ جہالت ہو گی اس لیے کہ گناہ کی بنیاد علم پر نہیں بلکہ جہالت پر ہے۔ قرآن ہر گناہ کو جہالت کہتا ہے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی جب گناہ کرتا ہے تو وہ جہالت ہے۔ اچھائی کی خبر ہم تک پہنچے اور ہمارا حال بنے تو علم ہے۔ ایک بات اور قابلِ ذکر ہے یہ جان لیں کہ ہر شعبے کو جاننا اللہ کریم کی صفت ہے۔ ہر پڑھا لکھا بندہ بھی کسی نہ کسی پہلو سے اَن پڑھ ہوتا ہے ایک انسان سائنس میں Ph.d ہے تو ضروری نہیں اُسے History بھی آتی ہو۔ جو History میں ماہر ہے ضروری نہیں کہ وہ سائنس بھی جانتا ہو تو سائنس دانوں کے لیے وہ ان پڑھ ہے۔ اگر ایک پڑھے لکھے شخص کو گاڑی چلانا نہیں آتی تو اس شعبے میں وہ ان پڑھ ہے۔ سو ہم جو کُلّی بھروسہ کسی پر کر لیتے ہیں یہ درست نہیں بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ جس شعبے کا عالم ہے اگر وہ اس کا حال بن گیا ہے، نیک علم ہے اور وہ اس پر عمل پیرا بھی ہے تو یہ علم ہے۔ جس شعبے میں علم نہیں رکھتا اس میں جاہل ہے۔

یہ اللہ کریم کی صفت ہے کہ عالم ہے، ہر بات کو ہر شئے کو ہمہ وقت جانتا ہے اور پھر جتنا علم وہ چاہتا ہے اپنے انبیاؑ کو عطا فرماتا ہے۔ اللہ کریم علم کی اتنی اہمیت بتا رہے ہیں کہ یہ انبیاؑ کو دیا گیا گویا عظمتِ نبوت علم سے ہے۔ اس پر بھی بہت بحثیں ہوتی ہیں۔ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ اللہ کا سارا علم انبیاؑ کو مل گیا۔ وہ یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ انبیاؑ بھی مخلوق ہیں۔ اللہ خالق ہے اور خالق کی صفات خالق کو ہی زیب دیتی ہیں کسی مخلوق میں کوئی صفت ساری نہیں آسکتی۔ اگر کسی مخلوق میں کوئی ایک صفت بھی مکمل مان لی جائے تو پھر مخلوق ایک صفت میں تو حصے دار ہو گئی۔ ہاں! انبیاؑ کو جو فریضہ عطا کیا جاتا ہے اس فریضہء نبوت سے متعلق ساری ضروریات کا علم عطا کر دیا جاتا ہے اور وہ

صورتِ علم نہیں ہوتا بلکہ حقیقتِ علم ہوتا ہے۔

فرمایا: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۔۔۔اور بے شک ہم نے داؤد اور سلیمان (علیہما السلام) کو علم عطا فرمایا۔

اللہ کریم علم کی اتنی عظمت اور اہمیت بتا رہے ہیں کہ انبیاؑ کو علم دیا گیا۔ اُنؑ کے فرائض نبوت کے مطابق انؑ کو اس کا مکمل طور پر علم دیا جاتا ہے اور انؑ کا عمل بھی اس علم کے مطابق ہوتا ہے۔ علم اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور انبیاؑ کو حقیقی علم نصیب ہوتا ہے۔

ہمارے پاس بھی آخرت کی خبر ہے ہم نے سن رکھا ہے، قرآن اور سنت میں پڑھا ہے کہ قیامت قائم ہوگی، انصاف اور حساب کتاب ہوگا۔ اگر یہ خبر ہمارا حال بن جائے تو ہماری زندگی بدل جائے اور ہم گویا میدان حشر میں زندہ رہیں، برائی سے بھاگتے ہوں اور نیکی کی طرف لپکتے ہوں تو پھر یہ علم بن جائے گا۔ اب ہر بندہ جانتا ہے کہ قیامت قائم ہوگی، جو کم تولتا ہے وہ بھی جانتا ہے کہ قیامت ہے جو رشوت لیتا ہے، دوسرے کا حق چھینتا ہے وہ بھی جانتا ہے لیکن یہ محض صورتِ علم ہے۔

ایک واقعہ یاد آیا کسی عزیز نے ایک مولوی صاحب سے پوچھا کہ یہ جو پیلی ٹیکسی اسکیم متعارف ہوئی ہے کیا اس میں سود ہے؟ ان مولانا نے کہا کہ اس میں سود ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے ٹیکسی نہیں لی، پھر وہ اسکیم بھی ختم ہوگئی۔ کچھ عرصے کے بعد وہی عزیز مولوی صاحب سے ملنے ان کے گھر گیا تو وہاں دو پیلی ٹیکسیاں کھڑی تھیں تو وہ بہت حیران ہوگیا۔ مولوی صاحب سے کہنے لگا کہ آپ نے تو کہا تھا کہ اس میں سود ہے یہ حرام ہے لہٰذا میں نے تو نہیں لیں لیکن آپ کے گھر تو دو ہیں۔ مولوی صاحب کہنے لگے کہ مسئلہ تو وہی ہے یہ حرام ہے اس میں سود ہے لیکن میں نے تو لے لیں تم بھی لے لیتے میں نے تمہیں لینے سے تو نہیں روکا تھا۔ گویا مولوی صاحب کے پاس محض خبر تھی علم نہ تھا۔ اگر علم ہوتا تو ہرگز اس میں ملوث نہ ہوتے۔ سو خبر صورتِ علم ہے یعنی بظاہر لگتا ہے کہ اسے اس کا علم ہے اور اگر حال بن جائے تو حقیقتِ علم ہے۔

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ہم نے داؤد علیہ السلام کو اور سلیمان علیہ السلام کو علم عطا فرمایا اور انہوں نے عرض کی: وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵﴾ انہوں نے کہا اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا فرمائی۔

یہ فضیلت کیا تھی؛ مخلوق میں کمال علم کیا ہے؟ یہ فضیلت اور کمال علومِ نبوت ہے جو صرف انسانوں کو عطا کی

گئی۔جس کی وجہ سے پوری انسانیت اشرف المخلوقات کہلائی وہ کمال نورِ نبوت ہے کہ انسانوں کے علاوہ کسی دوسری مخلوق کو نبوت عطا نہیں کی گئی۔

کائنات کا ہر ذرّہ اللہ کے حکم کا تابع ہے، حاکم کا تابع ہے لیکن کسی ذرّے میں یہ جرأت نہیں ہے کہ وہ آنکھ اٹھا کر دیکھے کہ حاکم کون ہے، کیسا ہے؟ ہر ذرّہ، ہر قطرہ آب، زمین و آسمان ساری تخلیق جہاں تک ہے حاکم کی مطیع ہے۔ مقربانِ بارگاہ فرشتے بھی حکم بجا لاتے ہیں، حاکم کی طرف نگاہ اٹھانے کی مجال نہیں ہے۔ یہ شرف صرف حضرتِ انسان کو نصیب ہوا ہے کہ یہ معرفتِ الٰہی کی استعداد رکھتا ہے لہٰذا یہ رتبے میں فرشتوں سے بھی بڑھ گیا ہے۔ انسان یہ جان سکتا ہے کہ اللہ کون ہے، کیسا ہے اور پھر یہ اللہ سے باتیں کرتا ہے، اللہ کی باتیں سنتا ہے اور اللہ اس سے باتیں کرتے ہیں۔ انبیاؑ پر تو وحی ہوتی ہے لیکن اپنے نیک بندوں سے بھی اللہ کریم بات کرتے ہیں جیسے قرآن میں ارشاد ہے: وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى ۔۔۔(القصص:7) اور ہم نے موسیٰ کی والدہ کو الہام فرمایا۔ اسی طرح حضرت مریم کے قصے میں بھی یہ ملتا ہے کہ ہم نے مریمؑ سے یہ کہا۔ سوا انبیاؑ کے علاوہ اہل اللہ کو بھی شرفِ ہمکلامی نصیب ہوتا ہے۔ یہ عظمتِ انسانی ہے اور یہ سارا کیا ہے؟ یہی علم ہے۔

حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام نے کہا ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں جس نے بے شمار نیک بندوں پر ہمیں فضیلت بخشی اور نبوت سے سرفراز کیا۔

وراثتِ انبیاؑ:

فرمایا: وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ ۔۔۔اور سلیمان (علیہ السلام) داؤد (علیہ السلام) کے وارث ہوئے۔

انبیاؑ علیہم السلام کی وراثت کی وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات سے ہوتی ہے کہ انبیاؑ کی وراثت دولتِ دنیا یا حکومت و اقتدار نہیں ہوتا بلکہ وہ علوم ہوتے ہیں جس سے اللہ نے انہیں فضیلت دی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے پردہ فرمانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ترکے میں چند تلواریں، چند کمانیں اور سواری اور جہاد کے لیے چند گھوڑے تھے لیکن وہ بطور وراثت تقسیم نہیں ہوئے تھے۔ یہ چیزیں بطور انعام یا تحفہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قریبی حضراتؓ کو عطا کی گئیں۔ سو فرمایا کہ سلیمان علیہ السلام علمِ نبوت کے وارث ٹھہرے اور نبیؑ ٹھہرے۔ یہاں حکومت کی وراثت کی بات نہیں ہو رہی بلکہ اُن علوم و کمالات یعنی شریعت کا علم، مرضیاتِ باری کے متعلق علم جو حضرت سلیمان علیہ السلام کو دیا اور ساتھ داؤد علیہ السلام کے علم کی وراثت بھی دی۔

یہاں یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ اہل اللہ سے خلافت پانے کی شرط بھی صرف اہلیت ہے محض رشتہ داری

نہیں ہے۔ البتہ اگر بیٹے یا بھتیجے وغیرہ میں کام کرنے کی اہلیت ہو تو بیٹا ہونا باعثِ عیب نہیں ہے۔ اگر بیٹے میں اہلیت نہیں ہے اور کسی دوسرے شخص کو اللہ کریم نے اہل بنا دیا ہے تو اُسے قائم مقام بنایا جا سکتا ہے، خلافت دی جا سکتی ہے۔ بیٹا اگر اہلیت رکھتا ہے تو اس کا حق ہے یعنی جو اہل ہوگا اُسے خلافت ملے گی۔

فرمایا: وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ اور فرمایا اے لوگو! ہم کو پرندوں کی بولی تعلیم کی گئی ہے اور ہم کو ہر چیز عطا فرمائی گئی ہے بے شک یہ بہت ہی بڑا فضل ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو علوم عطا ہوئے، ان میں اضافہ کر دیا گیا اور انہیں جنات چرند پرند نیز وحوش پر بھی حکومت دی اور ان سب کی زبانیں سمجھنے کا علم عطا ہوا۔ انہوں نے اعلان فرما دیا کہ اللہ نے جو نعمتیں دی ہیں اس میں ایک کمال یہ بھی ہے کہ ہم پرندوں کی زبان بھی سمجھتے ہیں۔ یہاں پرندے بطور مثال کہا اللہ کریم نے ہر چیز کی زبان انہیں سمجھا دی تھی۔ قرآنِ کریم میں ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑ، شجر و حجر بھی ذکر کرتے تھے، اللہ اللہ کرتے تھے۔ ہر شئے اپنی ایک زبان رکھتی ہے، اپنا ایک ضمیر رکھتی ہے، اپنی حیثیت کے مطابق اللہ کا ذکر کرتی ہے، اطاعت کرتی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ۔۔۔ (بنی اسرائیل:44) اور کوئی ایسی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ کائنات کی بقا ذکر میں ہے کہ جو ذرّہ ذکر چھوڑ دیتا ہے فنا ہو جاتا ہے۔ پہاڑ ذکر چھوڑ دے گر جاتا ہے، دریا ذکر چھوڑ دے خشک ہو جاتا ہے، درخت ذکر چھوڑ دے تو جل جاتا ہے۔ یہ چیزیں کیسے ذکر کرتی ہیں؟ یہ اپنی اپنی حیثیت میں کرتی ہیں۔ اپنی اپنی زبان میں ارض و سما کا ہر ذرہ اللہ کی عظمت بیان کرتا ہے۔ اپنی زبان میں اللہ کی بارگاہ میں اپنی گزارشات پیش کرتے ہیں اللہ کے احکام سنتے ہیں اور اگر کوئی غافل ہو جائے تو تباہ ہو جاتا ہے۔

خاک و آب و باد و آتش بندہ اند
با من و تو مردہ با حق زندہ اند

ہمارے لیے وہ بے جان ہیں لیکن اللہ کے لیے تو سب میں جان ہے۔ سب اللہ کی باتیں سنتے بھی ہیں اور اس کی حمد و ثنا بھی کرتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمیں تو اللہ نے پرندوں کی زبان سمجھنے کی بھی طاقت عطا کر دی ہے۔ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۔۔۔ اور ہم کو ہر چیز عطا فرمائی گئی ہے۔ ہمیں بے شمار کمالات عطا فرمائے اِنَّ هٰذَا

لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ﴿۱۶﴾ بے شک یہ بہت ہی بڑا فضل ہے۔

یہ اللہ کا ایسا احسان ہے جو ساری مخلوق کو نظر آ رہا ہے، واضح احسان ہے جو ہر مخلوق کو ذرّاتِ زمین سے لے کر شجر و حجر تک، ذرّاتِ آب سے لے کر بادلوں اور ہواؤں تک ہر شے کو نظر آ رہا ہے۔

اللہ کریم بتا رہے ہیں کہ جب وہ کسی کو علم عطا فرماتے ہیں تو اس بندے کی رسائی کہاں تک ہوتی ہے اور کیا کیا عطا ہوتا ہے سو فرمایا: وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ﴿۱۷﴾ اور سلیمان علیہ السلام کے لیے جنوں، انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے پس وہ قسم وار کھڑے کیے جاتے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنا لشکر جمع کیا جس میں جن بھی تھے، انسان اور پرندے بھی جو اپنے اپنے مقام پر صف آرا ہو گئے اور ایک سمت کی طرف اپنے لاؤ لشکر سمیت روانہ ہوئے۔

جانوروں میں بھی شعور ہے:

فرمایا: حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ﴿۱۸﴾

یہاں تک کہ جب چیونٹیوں کے میدان میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا اے چیونٹیو! اپنے اپنے بلوں میں داخل ہو جاؤ، کہیں تم کو سلیمان (علیہ السلام) اور اُن کے لشکری کچل نہ دیں اور اُن کو اس کی خبر بھی نہ ہو۔

حضرت سلیمان علیہ السلام اور اُن کے لاؤ لشکر کا ایک وادی پر گزر ہوا جہاں چیونٹیاں کثرت سے تھیں جب لشکر کے آنے اور فوجیوں کے چلنے کی آوازیں قریب آئیں تو ایک چیونٹی جو اُن کی سردار تھی اس نے چیونٹیوں کو حکم دیا کہ اپنے گھروں میں گھس جاؤ۔ اس نے خبردار کیا کہ ایسا نہ ہو کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کا لشکر تمہیں مسل دے اور تم تو اتنی حقیر ہو کہ اُن کے پاؤں کے نیچے مسلی جاؤ گی لیکن انہیں تمہاری خبر بھی نہیں ہو گی کہ نیچے کوئی چیز آئی ہے۔

اس سے ثابت ہے کہ جانوروں میں بھی شعور ہے اگرچہ ایسا کامل نہیں کہ وہ شریعت کے مکلف ٹھہرائے جاتے اور فطری علوم جو انہیں بخشے گئے ہیں جیسے گھر بنانا، غذا تلاش کرنا، بچے پالنا اپنا خاندان سنبھالنا، یہ سب کام وہ بخوبی انجام دیتے ہیں۔ اللہ کریم کا نظام ہے کہ چیونٹیوں میں بھی ایک ذمہ دار ہے اور آپس میں کلام بھی کرتی ہیں۔ نیز جو سردار یا ذمہ دار چیونٹی ہے وہ ذمہ داری ادا کر رہی ہے۔ اسے احساس ہے کہ اس رعیت کا تحفظ میری ذمہ داری ہے اور انہیں بروقت نقصان سے آگاہ کرنا یہ علم پہنچانا اور حکماً نقصان سے بچانا بھی میری ذمہ داری ہے۔

اب اس چیونٹی نے کتنی بلند آواز سے بات کی کہ وادی میں موجود ساری چیونٹیوں نے سن لی اور وہ اپنے بلوں میں چلی گئیں۔ ساری وادی چیونٹیوں سے بھری ہوئی تھی۔ سب نے آواز سنی جبکہ اور کسی نے محسوس نہیں کی، کوئی شور ہوا نہ ہی کوئی پتّا تک ہلا۔

اللہ کریم کا نظام:

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اللہ کریم کا یہ نظام ہے کسی کو حاکم بنایا ہے کسی کو رعیت کسی کو امیر بنایا کسی کو غریب لیکن سب کے حقوق بھی ہیں اور فرائض بھی اور اس نے ساری مخلوق میں یہ مزاج رکھا ہے، اسی انداز میں پیدا کیا ہے کہ کسی کو تابع بنایا ہے کسی کو سربراہ، جانوروں میں پرندوں اور چیونٹیوں تک میں یہ نظام ہے کہ کوئی اُن کا سربراہ سردار ہے۔ ہر ایک کے اپنے حقوق اور فرائض ہیں۔

انسان بھی محض بادشاہی پر ناز نہ کرے کہ یہ نظام تو ہر مخلوق میں رکھا گیا ہے اور کوئی بادشاہ بن کر فخر نہ کرے کہ وہ بہت بڑا ہے بلکہ بادشاہی کے فرائض نبھائے۔ بادشاہ کے ذمّے ہے کہ اپنی رعیت تک اُن کی بھلائی پہنچائے اور انہیں برائی سے بچائے۔ بادشاہ یا حکمران کو اپنی رعیت کے ساتھ میدانِ حشر میں کھڑے ہونا پڑے گا اور ایک ایک بندے کے حقوق سے متعلق جوابدہی ہوگی۔

آج تو عجیب رواج ہو گیا ہے کہ ہر بندہ صرف حقوق کا مطالبہ کرتا نظر آتا ہے لیکن اپنے فرائض کی فکر کوئی نہیں کرتا۔ آئے دن ہڑتال ہوتی ہے کبھی اساتذہ سڑک پر بیٹھے نظر آتے ہیں، کبھی ڈاکٹر بیٹھے ہیں، کبھی تاجر احتجاج کرتے نظر آتے ہیں اور حقوق کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ کوئی یہ سوچنے کا تکلف بھی نہیں کرتا کہ اس کے فرائض کیا ہیں۔ یہ جو حقوق ضائع ہوتے ہیں یا حقوق پامال ہوتے ہیں، کیوں ہوتے ہیں؟ جب کوئی شخص اپنا فرض ادا نہیں کرتا تو کچھ لوگوں کے حقوق اس میں ضائع ہو جاتے ہیں کہ ہر بندے کا جو فرض ہے وہ کسی نہ کسی کا حق ہے۔ جب لوگ ہڑتالیں کر کے کام چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں تو وہ کتنے لوگوں کے حقوق ضائع کر کے اپنے حق کا مطالبہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اپنے حق کا مطالبہ ضرور کیا جائے مگر یاد رکھا جائے کہ حق وہ ہے جسے انسان معاف بھی کر سکتا ہے لیکن فرض ہر حال میں پورا کرنا ہوتا ہے۔ فرائض کی ادائیگی میں پہلوتہی نہیں کی جا سکتی۔ یہ شعور تو جانوروں کیڑے مکوڑوں میں بھی اللہ کریم نے رکھا ہے کہ اس چیونٹی کو بھی یہ فکر تھی کہ چیونٹیاں کچلی نہ جائیں چنانچہ اس نے انہیں حکم دیا کہ اپنے اپنے بلوں میں چلی جاؤ۔

چیونٹیوں سے بچاؤ کے لیے:

بعض اوقات چیونٹیاں پریشانی کا باعث بن جاتی ہے، گھروں میں یا گوداموں میں، اپنے گھر بنا لیتی

ہیں۔ باورچی خانوں میں پریشانی کا باعث بن جاتی ہے تو اس آیہ کریمہ (النمل:18) کو طاق یعنی تین، پانچ، سات مرتبہ اوّل آخر طاق اعداد میں درود شریف پڑھ کر پھونک ماردی جائے تو چیونٹیاں وہاں سے نکل جاتی ہیں۔ یہ اس پریشانی کا ایک علاج ہے۔

ادائے شکر کا سلیقہ:

اللہ کریم کا احسان تھا اس نے اپنی نبیؑ کو یہ معجزہ عطا فرمایا کہ انہوں نے وادی سے باہر ہی چیونٹی کی آواز سن لی۔ فرمایا: فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّن قَوْلِهَا۔۔۔ تو وہ اس کی بات پر مسکراتے ہوئے ہنس پڑے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ بات سن بھی لی اور سمجھ بھی لی اور اس پر بہت خوش بھی ہوئے کہ اللہ نے مجھے یہ علم عطا فرمایا اور میری رعیت میں چیونٹی کو بھی احساسِ ذمہ داری بخشا ہے کہ ان کی سردار اُن کو بچانے کی فکر کر رہی ہے۔

انہوں نے دعا فرمائی: وَقَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِيٓ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَىٰهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ ﴿١٩﴾ اور عرض کرنے لگے اے میرے پروردگار! مجھے توفیق عنایت فرمایئے کہ جو احسان آپ نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائے ہیں ان کا شکر ادا کروں اور یہ کہ نیک کام کروں جس سے آپ خوش ہوں اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرمایئے۔

جب اللہ کریم کا احسان ہوتا ہے تو انبیائے کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا عمل اُمت کی تعلیم کے لیے ہوتا ہے۔ سو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کمال پر کہ وہ چیونٹی کی بات سن رہے ہیں، فخر نہیں کیا بلکہ اللہ کریم سے دعا کی۔ فرمایا کہ اے میرے پروردگار! یہ آپ کے احسانات ہیں سو مجھے توفیق عنایت فرمایئے کہ میں آپ کی نعمتوں اور احسانات کا شکر ادا کرسکوں اور ان انعامات کا بھی شکر ادا کروں جو میرے والدین پر کیے۔ میرے ربّ مجھے توفق عطا فرمایئے کہ میں زندگی بھر نیک کام ہی کروں، عمل صالح کرسکوں جو آپ کی رضامندی کا سبب بنیں۔

گویا عمل میں دو طرح کی قید ہے۔ پہلی قید ہے کہ عمل صالح ہو یعنی شریعت کے مطابق ہو، اس کے کرنے کا انداز شریعت کے مطابق ہو تو صالح ہوگا۔

دوسری قید یہ ہے کہ عمل رضائے باری کا سبب بنے۔ یاد رہے کہ عمل کرنا ایک بات ہے اور عمل کا مقبول ہونا دوسری بات ہے۔ عمل کرنے میں ظاہر مکلف ہے، اعضا و جوارح مکلف ہیں کہ اس عمل کو شریعت کے مطابق انجام دیں لیکن اس کی قبولیت کے لیے خلوص شرط ہے۔ خلوص یہ ہے کہ عمل خالص اللہ کی رضا کے لیے ہو اور دل سے باطن سے

محض اللہ کی رضا مطلوب ہو اسے قبول فرمانا اللہ کی رحمت اور پسند پر ہے۔

سو اللہ کے نبی علیہ السلام نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! مجھے توفیق دے کہ میں ان انعامات کا شکر ادا کر سکوں جو آپ نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائے ہیں اور میں ہمیشہ آپ کی اطاعت پر کاربند رہوں، نیکی کروں۔ گویا اس آیہء کریمہ میں ادائے شکر کا طریقہ بھی بتا دیا کہ ایسے اعمال کرنا جو صالح ہوں اور خلوص کے ساتھ ہوں جو اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہو سکیں۔ ان اعمال کا ظاہر، شریعت کے مطابق ہو اور باطن صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی کی طلب ہو۔ فرمایا: وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹﴾ اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرمایے۔

علمائے حق فرماتے ہیں کہ کسی بندے کے بارے آپ سمجھنا چاہیں کہ یہ کیسا آدمی ہے تو اس کے آس پاس لوگوں کو دیکھیں۔ اچھوں کے اردگرد اچھے لوگ ہوتے ہیں، نیکوں کے اردگرد نیک لوگ ہوتے ہیں جبکہ بدکاروں کے ساتھی بھی بدکار ہی ہوتے ہیں۔ یہ جو مجلس ہے یا لوگوں سے دوستی ہے یہ بندے کے مزاج اور کردار کی شناخت بن جاتی ہے۔ اس معاملے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے متنبہ فرمایا ہے کہ مجلس کی تاثیر ہوتی ہے اور جب بھی دو بندے ملتے ہیں تو دو میں سے ایک ضرور دوسرے کو متاثر کرتا ہے۔ ایک اثر پذیر ہوتا ہے دوسرا اسے متاثر کرتا ہے ہر بندہ ہر محفل میں کوئی نہ کوئی اثر ضرور لیتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حدیث کا مفہوم ہے کہ نیکوں کے ساتھ رہو کہ نیکوں کی محفل عطار کی دوکان ہے۔ اگر آپ وہاں بیٹھے رہیں تو ہو سکتا کہ کوئی خوشبو خرید لیں ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کو تحفتہً دے دے یا تھوڑی سی لگا دے اور کم از کم یہ فائدہ تو یقینی ہے کہ جتنی دیر وہاں بیٹھیں گے خوشبو سے معطر ہوتے رہیں گے برے لوگوں میں رہنا ایسے ہے جیسے آپ لوہار کی بھٹی پر بیٹھے ہیں۔ عین ممکن کوئی لوہے کا ٹکڑا اڑ کر آپ کو لگ جائے اور زخمی کر دے اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو جتنی دیر بیٹھے رہیں گے تپش اور دھواں برداشت کرتے رہیں گے۔ سو اپنی مجالس کو دیکھنا چاہیے کہ ہم کن لوگوں کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور کن لوگوں سے متاثر ہو رہے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام، اللہ کے محبوب نبیؑ اور محبوب نبیؐ کے بیٹے دعا کر رہے ہیں کہ یا اللہ! جو انعامات آپ نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائے ہیں مجھے توفیق دیں کہ میں اُن کا شکر ادا کر سکوں اور مجھے نیک اعمال کی توفیق دیجیے کہ میں ہمیشہ آپ کی اطاعت پر کاربند رہوں۔ انبیاؑ تو معصوم ہوتے ہیں اور ہمیشہ نیکی ہی کرتے ہیں لیکن اُن کا کردار تعلیم امت کے لیے ہوتا ہے۔ سو طریقہ شکر یہ ہے کہ شکر کی بھی توفیق مانگی جائے اور عمل کی بھی ہمہ وقت توفیق مانگی جائے۔ اگر اللہ کے نبیؐ توفیقِ عمل مانگتے ہیں تو غیر نبی کی کیا حیثیت ہے۔ سو شکر یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت خلوصِ دل

سے کی جائے۔ دل کی گہرائی سے کی جائے اور پھر دعا کی جائے کہ اللہ یہ بھی تو آپ ہی کا احسان ہے کہ مجھے شکر کرنے کی، اطاعت کرنے کی توفیق عطا فرمائی اس نعمت کو ہمیشہ قائم رکھیے اور مجھے ہمیشہ اپنے نیک بندوں میں شامل فرمائیں، اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں کے ساتھ رکھیے۔

لمحہ فکریہ:

آج ہمارا کردار بہت مختلف ہو چکا ہے اور ہمارے مزاج بھی عجیب ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم اپنا اندازہ ہی نہیں کرتے کہ جو میں کھا رہا ہوں کیا یہ حلال ہے بھی یا نہیں۔ جس انداز سے کما رہا ہوں کیا وہ کمانے کا انداز شرعاً جائز ہے یا نہیں۔ اگر توفیق مل جائے اور ہم نمازیں پڑھ لیں تو ہم پر ان کا بھی الٹا اثر ہوتا ہے۔ نماز پڑھنے کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے کہ عجز اور نیازمندی پیدا ہو اور مزید اطاعت کی توفیق مل جائے لیکن ہم پر اس کے برعکس اثر ہوتا ہے۔ ہم دو چار نمازیں پڑھ لیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ اب دنیا میں وہ ہونا چاہیے جو ہم چاہتے ہیں۔ یہ سوچ کہ وہ ہو جو ہم چاہیں تو یہ اللہ کی الوہیت میں شرکت ہے۔ کیا نمازیں پڑھنے سے کوئی اللہ کی الوہیت میں شریک بن جاتا ہے۔ نماز پڑھنے کی توفیق کس نے دی تھی؟ کیا خبر تمہاری نماز مقبول ہے بھی یا نہیں، اس میں خلوص ہے یا نہیں اور شریعت کی پوری پابندی ہے یا نہیں۔ اللہ کریم نے تو رزق کو بھی عبادات سے جوڑ دیا ہے اور اپنے پیغمبروں کی مقدس جماعت کو حکم دیا کہ اے پیغمبرو! (آپؑ اور آپؐ کی امتیں) پاکیزہ امتیں چیزیں کھائیں اور نیک کام کریں۔ يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۔۔۔(سورۃ المومنون:51)

یعنی کردار کی نیکی کا بہت سا مدار غذا کی حلت اور پاکیزگی پر ہے۔ سو اگر عبادت کی توفیق مل جائے تو یہ اللہ کا احسان ہے اور اس کا شکر ادا کرنا ضروری ہے۔ انسان کو کبھی اپنی پارسائی پر اترانا نہیں چاہیے کہ میں نے اتنے حج کیے، عمرے کیے یا نوافل پڑھے، یہ سب فضول باتیں ہیں نیکی کی جو توفیق ملے اس پر اللہ کا مزید شکر ادا کرنا چاہیے کہ یہ اس کا احسان ہے۔ وہ جو کہا گیا ہے:

منت منہ کہ خدمتِ سلطان می کنی
منت او بداں کہ بخدمت گزاشتن

اگر بادشاہ نے تجھے ملازم رکھا ہے تو یہ احسان نہ کر کہ میں بادشاہ کے محل کی حفاظت کرتا ہوں۔ یہ بادشاہ کی مہربانی ہے کہ اس نے مجھے یہ کام کی مہلت دی اور ملازم رکھ لیا۔ جو نیکی بھی ہم سے صادر ہو اس پر مزید شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ نے مجھے توفیق دی جس سے یہ نیک کام مجھ سے ہوا۔

مخلوق پر اللہ کی عطا:

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں انسانوں کے علاوہ جن، جانور اور پرندے بھی ہوتے تھے ہوائیں بھی ساتھ ہوتی تھیں کہ ہر چیز پر انؑ کی حکومت تھی۔ آپ علیہ السلام اپنے لشکر کے ساتھ ایک سمت کو چلے، وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ ۖ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ ﴿٢٠﴾ جب انہوں نے پرندوں کا جائزہ لیا تو فرمایا کیا وجہ ہے کہ ہُدہُد نظر نہیں آتا یا کہیں غائب ہو گیا ہے؟

مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ ہُدہُد میں ایک خصوصیت ہے کہ یہ زیر زمین پانی کے چینل دیکھ لیتا ہے۔ اللہ کی عطا ہے، جس مخلوق کو جو چاہے نعمت عطا کر دے، اللہ نے ہُدہُد کو اتنی تیز نگاہ عطا فرمائی ہے کہ زیر زمین پانی کا سراغ پا لیتا ہے۔ اسے علم غیب نہ سمجھا جائے بلکہ اللہ کی عطا کردہ خصوصیت ہے ورنہ وہی ہُدہُد جال میں تھوڑے سے دانے کے لیے پھنس جاتا ہے۔ جب اسے پکڑنے کے لیے کوئی جال بچھا کر دانہ ڈالتا ہے تو اسے جال نظر نہیں آتا اور پکڑا جاتا ہے۔ یعنی زیر زمین دیکھ لیتا ہے زمین کے اوپر نظر نہیں آتا۔ یہ اللہ کی عطا کردہ خصوصیات ہیں جو اس نے مختلف مخلوق کو عطا فرمائی ہیں۔

ایک دفعہ ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جو پانی تلاش کرنے کے بارے جانتا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ کہیں بھیڑوں کا گلہ پھر رہا ہو تو انہیں دیکھا کریں کہ وہ سخت گرمی میں اس جگہ جمع ہو جاتی ہیں جہاں زیر زمین پانی ہوتا ہے۔ دھوپ میں جس مقام پر بھیڑیں اکٹھی ہو کر کھڑی ہو جائیں تو سمجھ لیں کہ نیچے پانی ہے اس لیے کہ وہ پانی کی بھاپ لینے کے لیے وہاں جمع ہوتی ہیں۔

یہ اللہ کی شان ہے کہ اتنا علم بھیڑوں کو بھی عطا کر دیا کہ پانی کو تلاش کر لیں لیکن بھیڑیا کہاں سے آ جائے گا، گیدڑ یا کتا کہاں ہے؟ یہ انہیں پتا نہیں چلتا۔ ایسے ہی مختلف جانوروں کو اللہ نے عجیب و غریب خصوصیات بخشی ہیں۔ یہ سب اللہ کا بنایا ہوا نظام ہے جس میں ہر ایک اپنی استعداد کے مطابق کام کر رہا ہے۔

رعایا کی خبر گیری:

حضرت سلیمان علیہ السلام جب لشکر سمیت نکلے تو انہوں نے ہُدہُد کی غیر حاضری نوٹ کی، دورانِ سفر لشکر جہاں پہنچا تھا وہاں بظاہر پانی نہیں تھا اور لشکر کو پانی کی ضرورت تھی۔ ہُدہُد کی ذمہ داری یہ ہوتی تھی کہ وہ پانی کی نشاندہی کرتا تھا اور جنات پل بھر میں کھود کر نکال لیا کرتے تھے۔ اب جب ہُدہُد کی ضرورت پیش آئی تو وہ غائب تھا جبکہ لشکر میں سے بعض کا پیاس سے مرنے کا اندیشہ تھا سو حضرت سلیمان علیہ السلام بہت ناراض ہوئے، فرمایا: لَأُعَذِّبَنَّهُ

عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۱﴾ میں ضرور اُسے سخت سزا دوں گا یا اسے ذبح کر ڈالوں گا یا (اپنی بے قصوری کی) میرے سامنے صاف دلیل پیش کرے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام ہُدہُد کی غیر حاضری پر سخت برہم ہوئے کہ اس نے لوگوں کی جان خطرے میں ڈال دی تھی۔ فرمایا، میں اس کو سخت سزا دوں گا ہوسکتا ہے اسے ذبح ہی کر دیا جائے یعنی موت کی سزا وارد کر دی جائے۔

چونکہ پیاس سے لوگوں کے مرنے کا اندیشہ ہے اور ہُدہُد غائب ہے لہٰذا اسے قرار واقعی سزا دی جائے گی سوائے اس کے وہ اپنے غائب ہونے پر ایسی دلیل پیش کرے جس میں وزن ہو، صداقت ہو اور قابلِ قبول ہو محض بہانہ نہ ہو۔

گویا امورِ سلطنت میں خدام اور رعایا کی خبر گیری کرنا اور ذمہ دار لوگوں کو دیانتداری سے فرائض ادا کرنے کی پابندی کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔

ہُدہُد کی لائی ہوئی خبر:

فرمایا: فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۲﴾

سو تھوڑی ہی دیر میں وہ آ گیا اور کہنے لگا، میں ایسی خبر لایا ہوں جس کے بارے آپ کو علم نہیں ہے اور میں آپ کے پاس (شہر) سبا سے ایک یقینی خبر لایا ہوں۔

لشکر نے تھوڑا سا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ہُدہُد آ گیا اور آتے ہی عرض کی کہ حضرت، گستاخی معاف دورانِ پرواز مجھے دور سے ایک سرسبز و شاداب ملک نظر آیا تو میں اُدھر چلا گیا۔ وہاں سے میں ایسی خبر لایا ہوں جو آپ کے پاس ابھی نہیں ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ایک حقیر پرندہ اللہ کے نبیؑ سے کہہ رہا ہے کہ میرے پاس خبر ہے جو ابھی تک آپؑ کے پاس نہیں ہے۔ ہُدہُد کو اللہ نے وہ دکھا دی جبکہ آپؑ تک ابھی وہ خبر پہنچی نہیں تھی اور اللہ نے ہُدہُد کو اس کا سبب بنا دیا ہُدہُد کہنے لگا کہ میں 'سبا' کی طرف چلا گیا تھا اور وہاں سے ایک یقینی خبر لایا ہوں۔ 'سبا' یمن کا دارالخلافہ تھا۔ وہ خبر یہ ہے: اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ میں نے ایک عورت کو دیکھا ہے وہ اُن پر بادشاہی کر رہی ہے اور اس کو ہر چیز میسر ہے اور اس کا ایک بہت بڑا تخت ہے۔

ہُدہُد کہنے لگا کہ میں نے دیکھا اس ملک پر ایک خاتون حاکم ہے اور حکومت کے تمام وسائل اسے حاصل ہیں۔ اللہ نے اسے ہر نعمت دے رکھی ہے۔ لاؤ لشکر مال و دولت سب وسائل و ذرائع حاصل ہیں اور اس کا بہت عظیم

اور عجیب وغریب ساتخت ہے۔ کہنے لگا کہ یہ عجیب بات ہے: وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ۙ﴿۲۴﴾ اور میں نے پایا (دیکھا) کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال ان کو آراستہ کر کے دکھائے ہیں پھر اُن کو راستے سے روک رکھا ہے۔ سو وہ (سیدھے) راستے پر نہیں ہیں۔

کہنے لگا، اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۶﴾ سجدۃ کہ اُس اللہ کو سجدہ نہیں کرتے جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں (جیسے بارش ونباتات) کو باہر لاتے ہیں اور تمہارے پوشیدہ اور ظاہر اعمال سے باخبر ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہی عرشِ عظیم کا مالک ہے۔

ہُدہُد نے کہا کہ سجدہ تو صرف اس وحدہٗ لاشریک ذات کو زیبا ہے جو ہر بیج سے پودا نکالتا ہے جو بارش کے ہر قطرے کو وہاں پہنچاتا ہے جہاں اسے پہنچنا چاہیے۔

قدرت باری کے مظاہر:

اللہ کی شان نرالی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پیپل اور برگد دو بہت بڑے درخت ہیں۔ یہ بہت اونچے اور بہت پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کی عمر صدیوں پر محیط ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ برگد اور پیپل کے پودے ڈیڑھ، دوسو سال میں تو جوان ہوتے ہیں۔ ان پر چھوٹا سا پھل لگتا ہے اور اس پھل میں جو بیج ہوتا ہے وہ خشخاش کے دانے سے بھی چھوٹا دانہ ہے۔ اللہ کی شان ہے کہ وہ دانہ سیدھا زمین میں جذب ہوتا ہے لیکن اتنا سخت ہے کہ پھوٹتا نہیں ہے۔ یہ پرندوں کی غذا ہے کہ پرندے کھاتے ہیں اور جب پرندے کے معدے سے ہو کر نکلتا ہے تو اتنا نرم ہو جاتا ہے کہ پھر وہ پھوٹتا ہے۔ اس لیے اکثر یہ دیکھا گیا ہے برگد یا پیپل کے چھوٹے چھوٹے پودے کسی دیوار میں اُگے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات درختوں کی کھوہ میں اُگے نظر آئیں گے کہ وہاں پرندے نے بیٹ کی، بیج گرا جو نرم تھا سو وہاں پودا اُگ گیا۔ گویا خشخاش کے دانے سے بھی چھوٹے بیج میں ایک عظیم درخت سارا سمایا ہوا ہے اور اللہ کے حکم سے وہ پورا درخت اس میں سے نکل کر اتنا تناور بن جاتا ہے۔

ہُدہُد نے کہا سجدے کے لائق تو وہ ہے جو گھٹلیوں سے تنے نکالتا ہے، درخت نکالتا ہے۔ وہ ایسا قادر ہے کہ تمہارے ہر عمل سے اور ہر فکر سے واقف ہے جو چھپا کر کرتے ہو وہ بھی اس کے سامنے ہے اور جو سامنے کرتے ہو وہ جانتا ہے۔ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے، اس کے علاوہ کسی کو الوہیت زیب نہیں دیتی اور نہ ہی کوئی

سجدے کا مستحق ہے۔ زمین، آسمان، سورج، ستارے سب اس کی مخلوق ہے اور مخلوق خود سجدہ ریز ہے۔ وہ اکیلا خالق ہے اور وہ عرشِ عظیم کا مالک ہے۔

کائنات کے بارے میں یہ بات گزر چکی ہے کہ اس میں جو کچھ ہوتا ہے اس سارے کا انتظام کائنات کے سیکریٹریٹ یعنی عرش سے چلایا جاتا ہے۔ کہاں کس نے پیدا ہونا ہے، کسی نے مرنا ہے، کس کو کتنا رزق ملنا ہے کون سی ہوا کس کے نصیب میں ہے۔ الغرض ہر ذرّہ جو حرکت کرتا ہے اس کو عرش سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ خود عرشِ عظیم اس کی مخلوق ہے اس کے تابع ہے سو کسی دوسرے کو سجدہ کرنا زیب ہی نہیں دیتا۔

ہُدہُد کی لائی ہوئی یہ خبر بڑی دھماکا خیز خبر تھی۔ اللہ کے نبیؑ کے لیے تو بہت بڑی خبر تھی کہ ایک پوری ریاست حکمران سمیت شرک میں مبتلا ہے اور شیطان نے انہیں گمراہ کر رکھا ہے۔

عورت کی حکومت:

کچھ لوگوں نے ملکہ سبا کی حکمرانی سے عورت کی حکومت کا جواز لینے کی کوشش کی ہے لیکن یہ درست نہیں ہے کہ ملکہ سبا آتش پرستوں کی حکمران تھی۔ شریعتِ اسلامیہ میں عورت کی حکومت کا جواز نہیں ہے۔ عورت کو حکومت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس بات پر اجماع ہے کہ عورت حکومت کی اہل نہیں ہے بلکہ نماز میں امامت نہیں کر سکتی اذان نہیں کہہ سکتی تو امامتِ کبریٰ یعنی ملک کی حکومت کیسے کر سکتی ہے؟

اب عہد حاضر میں ہمارے ہاں جو خواتین کی حکومتیں بنتی ہیں تو اس میں جو علما اس کے حق میں ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ خود مختار حکومتیں نہیں ہیں، بادشاہتیں نہیں ہیں۔ اس کے پیچھے تو ہزاروں لوگ ہوتے ہیں جو مختلف ایوانوں میں بیٹھتے ہیں اور حکمران کو اُن کی محتاجی ہوتی ہے۔ یہ برائے نام حکومتیں ہوتی ہیں جس میں ایک شخص کو نمائندہ بنا دیا جاتا ہے لیکن درحقیقت یہ ملی جلی یعنی مخلوط حکومتیں ہوتی ہیں۔ بہرحال دونوں طرح کے دلائل عرض کر دیے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہء سبا سے شادی کر لی اور اسے حکومت پر برقرار رکھا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس بات کی تصدیق نہیں ہو سکی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سے نکاح کیا تھا یا نہیں، اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سے نکاح کیا اور اسے اقتدار پر بحال رکھا تو پھر حکومت تو سلیمان علیہ السلام کی ہوگئی اور وہ ان کی طرف سے نائب مقرر ہوگی۔

سب سے بڑی بات:

تیسری اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کرنا ہے، پہلی امتوں کا

نہیں۔پہلی امتوں میں جو کچھ ہوا اسے بطورِ عبرت تو اختیار کیا جاسکتا ہے۔اس سے سبق حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن ہمیں اتباع صرف آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلّم کا کرنا ہے۔

ایک مرتبہ کسی محفل میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں ایک شخص اعتراض لیے بیٹھا تھا۔ کہتا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اسماعیل علیہ السلام کی جگہ جنت سے آیا ہوا دنبہ ذبح کر دیا تو اس کا گوشت کہاں تقسیم کیا، کس کو کھلایا؟ آپ کہتے ہیں قربانی کا گوشت تقسیم کرو۔ میں اتفاقاً وہاں گیا تو یہ بحث چل رہی تھی۔ میں نے کہا کہ تمہیں ابراہیم علیہ السلام کے دُنبے سے کیا غرض ہے؟ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم قربانی نہ کرتے، قربانی کا حکم نہ دیتے تو ہم بھی قربانی نہ کرتے۔ ہم مکلف ہیں اتباعِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ قربانی کے جانور کے گلے میں جو رسی ہے وہ بھی صدقہ کر دو۔ قربانی کا گوشت خود بھی کھاؤ، عزیزوں میں بھی بانٹو اور غربا میں تقسیم کرو۔ ہم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے اتباع میں قربانی کرتے ہیں آپ شریعتِ ابراہیمیؑ کا سوال ہم سے کیوں کر رہے ہیں؟

ایک دفعہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کچھ دیکھ رہے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم مسجدِ نبوی میں تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے پوچھ لیا کہ کیا دیکھ رہے ہو؟ صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم یہ تورات کا ورق ہے ہمیں کہیں سے ملا ہے اسے دیکھ رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا رخِ انور سرخ ہو گیا فرمایا تمہیں تورات پڑھنے کی ضرورت کہاں سے پیش آ گئی؟ اور فرمایا: لَوْ كَانَ موسیٰ حَيّاً لَمَا وَسِعَهُ إلاّ إتّبَاعِي (احمد و بیہقی) حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی آ جائیں تو انہیں میرا اتباع ہی کرنا ہوگا۔ آج اگر خود موسیٰ علیہ السلام جن پر تورات نازل ہوئی اس دنیوی زندگی کے ساتھ موجود ہوتے تو میرے اتباع کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ تم آج تورات کیوں لیے بیٹھے ہو، قرآن پڑھو لہٰذا سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمیں صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کرنا ہے۔

خبر کی تصدیق کرنی چاہیے:

ہُدہُد واقعی بہت بڑی خبر لایا تھا لیکن کسی خبر کو سن کر یقین کر لینا یہ شرعی قاعدہ نہیں ہے بلکہ ہر خبر کی تصدیق کرنا قاعدہ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ انہوں نے فرمایا، اچھا دیکھیں گے تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹوں میں سے ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ خبر تو بہت بڑی ہے لیکن ہم پتا کرتے ہیں کہ تم سچ کہہ رہے

ہو یا جان بچانے کے لیے بہانہ تراشا ہے۔ اس کی تصدیق ضروری ہے۔ ہمارے معاشرے میں زیادہ جھوٹ وہ چلتا ہے جو ہم سن کر بغیر تحقیق و تصدیق آگے بیان کر دیتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ کسی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ جو سنے وہی آگے چلا دے بغیر تحقیق کیے کہ یہ صحیح ہے یا غلط ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ تصدیق کر لیتے ہیں کہ تو نے سچ کہا ہے یا جھوٹ بولا ہے۔ اللہ کے نبیؑ نے تحقیق کا یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ اسے حکم دیا فرمایا: اِذْهَبْ بِّكِتٰبِیْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَیْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا یَرْجِعُوْنَ﴿۲۸﴾ یہ میرا خط لے جا پھر اُن کی طرف ڈال دے پھر اُن کے پاس سے واپس آ تو دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ میرا یہ خط لے جاؤ اور ملکہ اور اس کی قوم کی طرف ڈال کر واپس آ جاؤ۔ اُن کی طرف خط ڈال کر الگ ہو جانا یعنی شاہی آداب کا لحاظ رکھنا۔ پھر دیکھتے ہیں کہ وہاں سے کیا جواب آتا ہے۔ چنانچہ ہُدہُد گیا اور ملکہ کے کمرہ خاص میں جہاں وہ اکیلی تھی خط ڈال کر آ گیا۔

خط کے آداب:

ملکہ نے خط پڑھا اور اپنے ساتھ دربار میں لے آئی۔ امرا کو جمع کیا اور کہنے لگی: قَالَتْ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّیْۤ اُلْقِیَ اِلَیَّ كِتٰبٌ كَرِیْمٌ﴿۲۹﴾ اُس عورت (ملکہ) نے کہا اے سردارو! بے شک میرے پاس ایک بہت باوقعت خط ڈالا گیا ہے۔

ملکہ نے بڑے سلیقے سے کہا کہ اے سردارانِ سلطنت، مجھ پر ایک خط گرایا گیا ہے لیکن یہ بہت عظیم اور خوبصورت خط ہے۔ یہ کسی بہت بڑے عالم، فاضل جاننے والے کا خط ہے۔ یہ کسی بہت بڑے شہنشاہ کی بات ہے عام آدمی اس طرح نہیں لکھ سکتے۔

اِنَّهٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴿۳۰﴾ بے شک وہ سلیمان (علیہ السلام) کی طرف سے ہے اور (مضمون) یہ ہے کہ شروع اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم کرنے والے ہیں۔

ملکہ نے بتایا یہ خط سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہے جو کہ کوئی بادشاہ یا حکمران ہیں۔ ان کے خط کا مضمون یہ ہے کہ شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان بہت رحم کرنے والے ہیں۔ غور کریں تو ساری تبلیغ اس ایک جملے میں سما گئی کہ وہ لوگ جس شرک میں مبتلا تھے سورج کو پوجتے تھے اس سارے کی تردید پہلے جملے میں ہی

آ گئی اور خط کی ابتدا ہو گئی۔

خط میں یا کتابت میں یہ کمال ہوتا ہے کہ مضمون زیادہ ہو اور الفاظ کم ہوں گویا چند جملوں میں وسیع مضمون کو سمیٹ لینا اور مقصد کی بات لکھنا۔

خط کسی کو بھی لکھا جائے اس میں لکھنے والے کا نام پہلے ہونا چاہیے تا کہ مکتوب الیہ جان لے کہ کس کا خط ہے۔ پھر اللہ کے نام سے شروع کیا جائے اور جامع مضمون ہو، طویل نہ کیا جائے۔ جیسے یہ خط ہے، فرمایا: اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ ﴿۳۱﴾ (بعد اس کے یہ) مجھ سے سرکشی نہ کرو اور میرے پاس مطیع ہو کر چلے آؤ۔

پورا خط ان چار الفاظ پر مشتمل ہے کہ مجھ سے سرکشی نہ کرو۔ اطاعت گزار بن کر میرے پاس چلے آؤ۔ یہ معاملہ صرف دو ریاستوں کا نہیں ہے بلکہ عقیدے کا بھی ہے۔ میرے سامنے اکڑنا یا سرکشی مت کرو اور ریاست کو بھی میرے تابع کرو عقیدہ بھی میرے جیسا اختیار کرو اور فرماں بردار بن کر میرے پاس چلے آؤ۔ یہ تھا سارا خط۔ ملکہء سبا نے کہا اس کے لکھنے والا کوئی بڑا عظیم انسان ہے کہ اس نے سارے معاملات دو جملوں میں کہہ دیے۔

سورۃ النمل رکوع 3 آیات 32 تا 44

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى
تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ
فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا
وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ
بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ
بِمَالٍ ۫ فَمَآ اٰتٰىنِيَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾
اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ
اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ
يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ
مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ
الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا
عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۡ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ
فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۰﴾ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا
عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾ فَلَمَّا جَآءَتْ
قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ۭ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا

مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ
كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ
عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ
نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۴﴾

کہنے لگی اے سردارو! میرے اس معاملہ میں مجھے مشورہ دو جب تک تم لوگ حاضر نہ ہو (مشورہ نہ دو) مَیں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرتی ﴿۳۲﴾ وہ بولے ہم بڑے زور آور اور سخت جنگجو ہیں۔ سو اختیار آپ کے پاس ہے، سو آپ ہی (مصلحت) دیکھ لیں جو حکم دینا ہو ﴿۳۳﴾ اس عورت نے کہا بے شک بادشاہ جب (فاتح ہو کر) کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں کے عزت والوں کو ذلیل کر دیا کرتے ہیں اور یہ لوگ بھی ایسا ہی کریں گے ﴿۳۴﴾ اور میں ان لوگوں کے پاس تحفہ بھیجتی ہوں پھر دیکھتی ہوں کہ قاصد کیا (جواب) لاتے ہیں ﴿۳۵﴾ جب وہ (تحفہ) سلیمان (علیہ السلام) کے پاس پہنچا تو انہوں نے فرمایا کیا تم مجھے مال و زر سے مدد دینا چاہتے ہو؟ پس اللہ نے جو کچھ مجھے عطا فرمایا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو تمہیں دیا ہے۔ بلکہ تم ہی اپنے تحفوں پر خوش ہوتے ہو گے ﴿۳۶﴾ ان کے پاس (تحفوں سمیت) لوٹ جاؤ سو ہم ان کے پاس ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کے مقابلے کی ان کو طاقت نہ ہو گی اور ہم اُن کو وہاں سے بے عزت کر کے نکال دیں گے اور وہ ذلیل ہوں گے ﴿۳۷﴾ (سلیمان علیہ السلام نے) فرمایا کہ اے سردارو! تم میں کوئی ایسا ہے کہ اُن کے فرمانبردار ہو کر آنے سے پہلے اس (ملکہ) کا تخت میرے پاس لے آئے ﴿۳۸﴾ تو ایک قوی ہیکل جن نے عرض کیا کہ مَیں پہلے اس کے کہ آپ اجلاس سے اٹھیں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا اور بے شک میں بہت طاقتور بھی ہوں اُسے لا سکتا ہوں اور امانتدار بھی ہوں ﴿۳۹﴾ جس کے پاس کتاب

(الٰہی) کا علم تھا اس نے کہا مَیں آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے اُسے آپ کے پاس حاضر کیے دیتا ہوں۔ پس جب انہوں نے اُس کو (تخت کو) اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو فرمایا یہ میرے پروردگار کا فضل ہے تا کہ مجھے آزمائے کہ مَیں شکر ادا کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں۔ اور جو شخص شکر ادا کرتا ہے تو وہ اپنے ہی نفع کے لیے کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو یقیناً میرا پروردگار بے نیاز اور کرم کرنے والا ہے ﴿۴۰﴾ انہوں (سلیمانؑ) نے فرمایا کہ اس (ملکہ) کے لیے اس کے تخت (کی صورت) کو بدل دو ہم دیکھیں کہ اُسے اس کا پتہ لگتا ہے یا وہ ایسے لوگوں میں سے ہے جن کو پتہ ہی نہیں چلتا ﴿۴۱﴾ سو جب (ملکہ ان کی خدمت میں) حاضر ہوئی تو (اسے اس کا تخت دکھا کر) فرمایا کیا آپ کا تخت بھی ایسا ہی ہے؟ اس نے کہا یہ گویا ہو بہو وہی ہے اور ہم کو اس کا پہلے ہی علم ہو چکا تھا (سلیمان علیہ السلام کی عظمت اور شان کا) اور ہم فرماں بردار ہیں ﴿۴۲﴾ اور وہ جو اللہ کے سوا (اوروں کی) پرستش کرتی تھی اس سے اس کو روکا گیا کہ بے شک (اس سے پہلے تو) وہ کافروں کی قوم میں سے تھی ﴿۴۳﴾ اس سے کہا گیا کہ محل میں چلیے پھر جب اس نے اس (فرش) کو دیکھا تو اس نے اسے پانی کا حوض سمجھا اور اپنی پنڈلیاں کھول دیں۔ کہا (سلیمان علیہ السلام نے) یہ تو ایک ایسا محل ہے جس میں (نیچے بھی) شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ تو وہ بولی اے میرے پروردگار! میں (پہلے بھی) اپنے آپ پر ظلم کرتی رہی تھی اور میں سلیمان (علیہ السلام) کے ساتھ اللہ پر جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے ایمان لاتی ہوں ﴿۴۴﴾

تفسیر ومعارف

ملکہءسبا کے حالات:

مفسرینِ کرام لکھتے ہیں کہ ملکہءسبا کا دادا بھی عظیم حکمران تھا سو سلطنت اُس کی وراثت میں آ رہی تھی۔ ملکہ

کے باپ نے کسی جنّی عورت سے شادی کی تھی اور ملکہ اس عورت کی بیٹی تھی۔ اسی لیے جنات بھی ملکہ کے ساتھ رہتے تھے۔ ملکہ کا قبیلہ بہت طاقتور لوگوں کا تھا۔

ایک مسئلہ جو یہاں زیر بحث آیا کہ کیا انسانوں اور جنات میں شادی ہونا ممکن ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا یہ جائز ہے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، یہ ممکن ہے۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ علما اس کو جائز نہیں کہتے۔ جنّوں کو جنّوں سے شادی کرنی چاہیے اور انسانوں کو انسانوں سے کرنی چاہیے۔

جہاں تک شادی کا ہو سکنا یا امکان ہے تو آج بھی ایسے واقعات ملتے ہیں کہ نسلِ انسانی کی خواتین سے جنّ بدکاری کرتے ہیں اور جنّی عورتیں بعض مردوں سے بدکاری کرتی ہیں۔ یہ آج بھی ثابت ہے اور وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس طرح کے بہت سے مریض یہاں بھی آتے ہیں۔ جنات اور انسانوں کی شادی کے شرعی جواز کے علما قائل نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی عورت ناجائز حاملہ ہو جائے اور عدالت اسے پوچھے اور وہ یہ کہہ دے کہ اس کی جن سے شادی ہوئی ہے تو اس کی تحقیق کیسے ہو سکتی ہے۔ اس طرح ہر ناجائز حمل رکھنے والی عورت کہہ سکتی ہے کہ اس نے جن سے شادی کی ہے۔ سو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ حالات 'احکام المرجان فی احکام جان' میں پڑھے جا سکتے ہیں۔ اس کتاب میں واقعات بھی نقل کیے گئے ہیں کہ کس کس زمانے میں کہاں کہاں انسانوں اور جنات میں رشتہ قائم ہوا۔ شریعت آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلّم میں اس کا کوئی جواز ملتا ہے نہ ہی کوئی ایسا واقعہ ملتا ہے کہ ایسا نکاح ہوا ہو۔ البتہ ناجائز تعلقات آج بھی ثابت ہیں۔

ملکہ کے پاس یہ قوت بھی تھی۔ اس کا اپنا لشکر تھا اور وہ بڑے جنگجو، جفاکش اور مضبوط لوگ تھے۔

مشورہ کی اہمیت:

فرمایا: قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾

کہنے لگی اے سردارو! میرے اس معاملے میں مجھے مشورہ دو جب تک تم لوگ حاضر نہ ہو (مشورہ نہ دو) میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرتی۔

ملکہ نے اپنے امرا کو جمع کر کے خط سنانے کے بعد رائے دریافت کی اور کہا کہ امورِ سلطنت ہمیشہ تمہارے مشورے سے طے کیے جاتے ہیں سو اس معاملے میں بھی مشورہ دو کہ کیا کیا جائے۔ اس سے ثابت ہے کہ قبلِ اسلام بھی بعض حکمران مشورہ کی اہمیت سے واقف تھے۔ اسلام نے مشورہ کی اہمیت پر اتنا زور دیا کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم خدام سے

مشورہ فرماتے تھے۔

امرا کہنے لگے: قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾ وہ بولے ہم بڑے زور آور اور سخت جنگجو ہیں۔ سو اختیار آپ کے پاس ہے، سو آپ ہی (مصلحت) دیکھ لیں جو حکم دینا ہو۔

ملکہ کے سرداروں نے کہا کہ آپ جانتی ہیں ہمارے پاس بہت بڑی فوجی قوت ہے اور ہم بڑے جنگجو لوگ ہیں لیکن فیصلہ تو آپ ہی کو کرنا ہے۔ آپ دیکھ لیں کہ مصلحت کس میں ہے، صلح میں یا جنگ میں ہے۔ آپ کی حکومت ہے تو یہ فیصلہ آپ کا ہوگا۔

ملکہ کا حکیمانہ جواب:

ملکہ نے امرائے سلطنت کو بڑی دانائی سے جواب دیا کہ جنگ میں ہار اور جیت کا امکان برابر ہوتا ہے۔ جنگ میں کسی کے پاس پہلے سے کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوتا کہ ایسا ہی ہوگا۔ ہر کوئی جیت کی امید پر ہی لڑتا ہے لیکن دو میں سے ایک کو ہارنا ہوتا ہے۔ سو ابھی جنگ مناسب نہیں ہے پہلے تحقیق کر لینا ضروری ہے کہ اگر شکست ہو تو: قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾ اس عورت نے کہا بے شک بادشاہ جب (فاتح ہو کر) کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اُسے تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں کے عزت والوں کو ذلیل کر دیا کرتے ہیں اور یہ لوگ بھی ایسا ہی کریں گے۔

ملکہ نے کہا کہ جنگ میں اگر شکست ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے لہٰذا جنگ کرنے سے پہلے یہ سارے امکانات دیکھ لینے چاہیں۔ یہ اندازہ لگانا چاہیے کہ کامیابی کے کیا امکان ہیں اور مخالف کی طاقت کیسی ہے ورنہ شکست ملکوں اور شہروں پر تباہی لاتی ہے۔ فاتح حکمران شہروں کو اجاڑ دیتے ہیں اور وہاں کے بااثر افراد کو رسوا کر دیتے ہیں۔

یہاں حکمرانوں کو یہ حکمت عملی تعلیم دی گئی ہے کہ ملکی مفاد میں جنگ لڑی جائے جب کوئی دوسرا راستہ باقی نہ ہو اور محض اپنی ہوس کی تکمیل کے لیے ملکوں اور قوموں کو جنگ میں نہ جھونکا جائے۔ نیز ملکہ سبا نے غیر مسلم فاتحین کے کردار کی صحیح تصویر پیش کر دی ہے۔ اسلام نے جنگ سے روک کر جہاد کا فلسفہ دیا ہے جس میں مقابل کو رسوا کرنا مقصود نہیں بلکہ برائی سے روکنا مقصود ہے۔ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ مسلمان فاتحین نے کفار مفتوحین سے بھی انصاف اور رواداری کا سلوک کیا۔

نیز ملکہء سبا یہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ یہ بات صرف بادشاہ کی نہیں ہے اس میں بات عقیدے کی ہے باطل مذہب کو چھوڑنے کی ہے اور اللہ کے ساتھ ایمان لانے کی ہے لہٰذا دیکھا جائے کہ یہ بندہ کیسا ہے۔ کہنے لگی، میرا ایک مشورہ ہے: وَاِنِّیۡ مُرۡسِلَۃٌ اِلَیۡہِمۡ بِہَدِیَّۃٍ فَنٰظِرَۃٌۢ بِمَ یَرۡجِعُ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۳۵﴾ اور میں ان لوگوں کے پاس تحفہ بھیجتی ہوں پھر دیکھتی ہوں کہ قاصد کیا (جواب) لاتے ہیں۔

ملکہ کہنے لگی کہ میں انہیں تحائف اور بہت سی دولت بھیجتی ہوں تو جیسا کہ انہوں نے کہا ہے کہ وہ اللہ کے نبیؑ ہیں تو پھر وہ دنیا کی لالچ میں نہیں آئیں گے بلکہ ہم سے اپنی بات منوائیں گے۔ پھر ہمیں عقیدہ بھی چھوڑنا ہوگا اور اطاعت بھی کرنی ہوگی۔ اگر وہ مذہب کا لبادہ اوڑھ کر ہم سے دنیا کے طالب ہیں تو پھر یا تو ان تحائف پر ہی خوش ہو جائیں گے یا مزید کا مطالبہ کریں گے۔ سو ہم یہ پہلے پتا کر لیں کہ یہ کوئی طالبِ دنیا ہے جو ہماری زمین، ہمارے وسائل اور دولت چھیننا چاہتا ہے یا واقعی اللہ کا رسولؑ ہے جو ہم میں مثبت تبدیلی چاہتا ہے۔ سو یہ تحفے بھیج کر دیکھ لیتے ہیں۔

مفسرینِ کرام نے لکھا ہے کہ ملکہ نے سونے چاندی کی بہت سی اینٹیں، بہت سے ہیرے، زر و جواہر اور بہت سی نعمتوں کا تحفہ بنا کر غلاموں اور کنیزوں سمیت حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف روانہ کیا۔ اللہ کریم نے اپنے نبی علیہ السلام کو اطلاع کر دی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے محلات نہایت عالی شان اور حیرت انگیز حد تک خوبصورت تھے جن کا آج کے دور میں بھی تصور محال ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے محل تک آنے والے راستے پر میلوں دور تک سونے چاندی کی اینٹوں کے فرش لگوا دیے اور راستے کے دونوں طرف اپنے لشکر جس میں جنات، انسان، چرند پرند، حیوان شامل تھے کھڑے کر دیے تا کہ مہمانوں کا استقبال کیا جائے اور انہیں اندازہ ہو جائے کہ اس حکومت کی فوجی قوت کتنی ہے اور اس کے وسائل کتنے ہیں۔ مفسرینِ کرام لکھتے ہیں کہ وہ قاصد پہلے تو بڑے نازاں اور لدے پھندے آ رہے تھے، جب انہیں سونے کی اینٹوں پر چلنا پڑا تو انہیں اپنے تحفے حقیر نظر آئے۔ وہ سوچنے لگے کہ جس شخص نے میلوں تک سونے کے فرش لگوا رکھے ہیں اس کے لیے ہماری لائی ہوئی یہ چند اینٹیں کیا اہمیت رکھیں گی اور جتنے لاؤ لشکر یہاں موجود ہیں یہاں ہماری طاقت کیا کرے گی۔ چنانچہ جب قاصد پہنچے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: فَلَمَّا جَآءَ سُلَیۡمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوۡنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَاۤ اٰتٰىنِۦَ اللّٰہُ خَیۡرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىکُمۡ ۚ بَلۡ اَنۡتُمۡ بِہَدِیَّتِکُمۡ تَفۡرَحُوۡنَ ﴿۳۶﴾ جب وہ (تحفہ) سلیمان (علیہ السلام کے پاس پہنچا تو انہوں نے فرمایا کیا تم مجھے مال و زر سے مدد دینا چاہتے ہو؟ پس اللہ نے جو کچھ مجھے عطا فرمایا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو تمہیں دیا

ہے۔ بلکہ تم ہی اپنے تحفوں پر خوش ہوتے رہو گے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا تم مجھے دولت دینا چاہتے ہو؟ دیکھ لو جو کچھ اللہ نے مجھے دیا ہے وہ تم سے کروڑوں گنا زیادہ ہے، بہت بہتر ہے جبکہ تمہارے پاس تو اس کا عُشرِ عشیر بھی نہیں تم اپنے ان تحائف پر فرحاں نازاں چلے آرہے تھے لیکن مجھے تمہاری دولت نہیں چاہیے۔ فرمایا: اِرۡجِعۡ اِلَیۡہِمۡ فَلَنَاۡتِیَنَّہُمۡ بِجُنُوۡدٍ لَّا قِبَلَ لَہُمۡ بِہَا وَلَنُخۡرِجَنَّہُمۡ مِّنۡہَاۤ اَذِلَّۃً وَّہُمۡ صٰغِرُوۡنَ﴿۳۷﴾ ان کے پاس (تحفوں سمیت) لوٹ جاؤ سو ہم ان کے پاس ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کے مقابلے کی ان کو طاقت نہ ہوگی اور ہم اُن کو وہاں سے بے عزت کر کے نکال دیں گے اور وہ ذلیل ہوں گے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے قاصدوں سے کہا کہ اپنی دولت اٹھاؤ اور واپس چلے جاؤ اور یہ دیکھ لو کہ میرے لشکروں کا اندازہ (تعداد) کیا ہے۔ یہ تم پر چڑھائی کریں گے تو تمہیں مقابلے کی تاب نہ ہوگی۔ تمہارے حکمران ذلیل اور رسوا کر کے ملک بدر کر دیے جائیں گے۔ ہم ان محلات سے اور فوجی چھاؤنیوں سے، ان شہروں سے تمہیں نکال دیں گے۔ چنانچہ قاصد مبہوت ہو کر واپس چلے گئے۔

انہیں واپس بھیج کر حضرت سلیمان علیہ السلام کو خیال آیا کہ انہیں واپس تو بھیج دیا ہے اور ملکہ کو پیغام بھی بھیجا ہے کہ ہماری فوج کا انتظار کرے جس کا مقابلہ وہ نہیں کر پائیں گے۔ آپ علیہ السلام نے اُن کے چہروں سے ان کی باتوں سے بھی اندازہ کر لیا تھا کہ جو کچھ یہ دیکھ کر جا رہے ہیں انہوں نے واپس آنا ہی ہے۔ انبیائے کرامؑ کو اللہ کریم بھی خبر دے دیتے ہیں۔ اُدھر قاصد جب واپس ملکہ کے دربار میں پہنچے اور جواب بھی لائے، دنیوی شان و شوکت اور فوجی قوت کا تذکرہ بھی کیا تو ملکہ نے اطاعت کرنے اور خود حاضر ہونے کا ارادہ کر لیا۔

جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو اطلاع ہوئی تو اپنے اہل دربار سے مخاطب ہوئے۔

معجزہ، کرامت، تصرّف:

فرمایا: قَالَ یٰۤاَیُّہَا الۡمَلَؤُا اَیُّکُمۡ یَاۡتِیۡنِیۡ بِعَرۡشِہَا قَبۡلَ اَنۡ یَّاۡتُوۡنِیۡ مُسۡلِمِیۡنَ﴿۳۸﴾ (سلیمان علیہ السلام نے) فرمایا کہ اے سردارو! تم میں کوئی ایسا ہے کہ اُن کے فرمانبردار ہو کر آنے سے پہلے اس (ملکہ) کا تخت میرے پاس لے آئے۔

ملکہ کا تخت بہت عظیم تھا، بہت بڑا تھا جو محلات کے اندر ہی بنایا گیا تھا کہ شاہی دربار میں کسی دروازے سے نہیں گزرتا تھا۔ قلعوں کے اندر محلات کے کمرہ خاص میں ہیرے جواہرات سونے اور چاندی سے مزین یہ خوبصورت

تخت موجود تھا جس کا وہاں سے نکلنا ہی محال تھا چہ جائیکہ کوئی پہریداروں کے سامنے اسے لے کر چل دے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ تم میں سے کون وہ تخت لائے گا ظاہر کرتا ہے کہ یہ کام تو آپؑ کے خادم بھی کر سکتے ہیں کہ خدام کی کرامت بھی آپؑ کا ہی معجزہ تھا۔ مفسرینِ کرام نے یہاں بڑی خوبصورت بات لکھی ہے کہ نبی علیہ السلام کو یہ معجزہ دکھانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ یہ کام تو آپؑ کے خدام بھی کر سکتے ہیں۔ یہ کام تو بطورِ کرامت بھی ہو سکتا ہے ورنہ تو آپؑ اپنی توجہ سے اٹھوا لیتے اور وہ نبیؑ کا معجزہ ہوتا۔

نبیؑ کا معجزہ اس کے متبعین میں بطور کرامت منتقل ہوتا ہے۔ معجزہ اللہ کا فعل ہوتا ہے اور نبیؑ کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے جو عقلی دلائل کو عاجز کر دیتا ہے۔ ایسے ہی نبیؑ کے ماننے والوں سے جب کوئی ایسی بات صادر ہوتی ہے جو عقل کی رسائی سے باہر ہو تو کرامت کہلاتی ہے اور اس سے دین کا حق ہونا ثابت ہوتا ہے، ولی کی کرامت بھی نبیؑ کا معجزہ ہوتی ہے کہ اس کی اطاعت و نسبت سے حاصل ہوتی ہے۔ تیسری قسم تصرف ہے اور یہ بھی کرامت کی ایک قسم ہے۔ کرامت میں ارادے کا دخل نہیں ہوتا مگر جہاں ارادہ کیا جائے اور وہ کام ہو جائے اُسے تصرف کہتے ہیں، جو یہاں ظاہر ہو رہا ہے۔ آپ علیہ السلام کے فرمان پر کہ تم میں سے کون ہے جو ملکہ کے آنے سے پہلے اس کا تخت یہاں لے آئے: قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾

تو ایک قوی ہیکل جن نے عرض کیا کہ میں، پہلے اس کے کہ آپؑ اجلاس سے اٹھیں آپؑ کی خدمت میں پیش کر دوں گا اور بے شک میں بہت طاقتور بھی ہوں اُسے لا سکتا ہوں اور امانتدار بھی ہوں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم پر ایک بہت بڑے جن نے، جنات میں سے ایک عفریت نے، بہت بڑے دیو نے عرض کی اے اللہ کے نبیؑ آپ کے دربار میں جلوہ افروز ہونے کا جو وقت مقرر ہے آپ کے اُٹھ کر جانے سے پہلے اس تخت کو لا سکتا ہوں۔ آپؑ مجھے حکم دیں میں جاتا ہوں اور آپؑ کا دربار ختم ہونے سے پہلے لے کر واپس آ جاؤں گا۔ مجھے اللہ نے اتنی طاقت بھی دی ہے اور میں امانت دار بھی ہوں پوری دیانت سے لے آؤں گا۔ تخت جیسا ہے ویسے ہی مِن و عَن یہاں پہنچا دوں گا کہ اللہ نے مجھے اتنی قوت دی ہے کہ میں اُسے اٹھا کر لانے پر غالب ہوں۔

کتاب اللہ کا علم:

حضرت سلیمان علیہ السلام کے صحابہ میں سے ایک آدمی نے عرض کی: قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۔۔۔ جس کے پاس کتاب (الٰہی) کا علم تھا اس نے کہا میں

آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے اُسے آپ کے پاس حاضر کیے دیتا ہوں۔

اب جن نے بنفسِ نفیس جانا تھا دیواریں وغیرہ توڑ کر نکال کر تخت اٹھا کر لانا تھا لیکن آپؑ کے صحابہ میں سے ایک آدمی نے عرض کیا کہ وہ یہ کام پلک جھپکنے میں کر سکتے ہیں۔ مفسرینِ کرام نے ان صحابی کا نام آصف بن برخیا نقل فرمایا ہے۔ کتاب اللہ کا علم کیا ہے؟ حق یہ ہے کہ کتاب میں محض الفاظ و معانی ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر لفظ اور ہر حرف میں انوارات و تجلیات اور کیفیات ہوتی ہیں جو ساری نبیؐ کے دل پر وارد ہوتی ہیں اور نبیؐ کے حقیقی متبعین کو سینہ بسینہ نصیب ہوئی ہیں۔ انہی کیفیات کے حامل ولی اللہ کہلاتے ہیں اور ایسے علما ہی انبیاؑ کے وارث ہوتے ہیں۔ ان کیفیات کے حامل لوگوں میں تصرف کی قوت بھی حسبِ استعداد ہوتی ہے جس کا اظہار مختلف مواقع پر ہوتا رہتا ہے۔

آصف بن برخیا کیفیات کے حامل تھے۔ یہ بات کسی کتاب میں تو نہیں دیکھی لیکن استاذ المکرم مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مجلس میں اسی موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ آپؒ نے ایک ساتھی کو حکم دیا کہ اس کی قلبی طور پر تحقیق کی جائے سو کہا کہ دیکھیں بھلا آصف بن برخیا تخت کیسے لایا۔ تو یہ سمجھ آیا کہ اس نے اپنے قلب کے انوارات تخت پر القا کیے، توجہ کی، تخت کو انوارات میں لپیٹا اور ایک بار اللہ کہا تو تخت سامنے پڑا تھا۔ یہ نبی علیہ السلام کے صحابی کی کرامت تھی جو باتباع نبیؐ انہیں حاصل تھی۔ اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی عظمت کی دلیل ہے کہ اُنؑ کے ایک خادم کو بھی اللہ نے یہ قوت دے رکھی تھی۔ یہ آپ علیہ السلام کا ہی معجزہ تھا یعنی آپ علیہ السلام نے دنیوی شوکت کے اظہار کے ساتھ اظہار معجزہ کو ملانا چاہا تا کہ انہیں محض بادشاہ نہ سمجھیں یہ بھی جان لیں کہ اللہ کے نبیؑ ہیں یہاں بھی ملکہء سبا کو دین کی قوت بتانا اور دین کو حق ثابت کرنا مقصود تھا۔ چونکہ ملک چھوڑنا، عقیدہ چھوڑنے سے نسبتاً آسان ہوتا ہے لیکن یہاں تو حضرت سلیمان علیہ السلام دونوں باتیں طلب کر رہے تھے۔ اُن کی بنیادی طور پر دعوت اسلام کی تھی، کفر کو چھوڑنے کی تھی اور یہ مشکل ترین کام ہوتا ہے کہ لوگ اپنے عقیدے پر خواہ کتنا ہی غلط ہو ڈٹے رہتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام دونوں باتوں کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ عقیدہ بھی وہ رکھو جو میں سکھاؤں اور ملک کو بھی میرے حکم کے مطابق چلاؤ۔

فرمایا: فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ ۔۔۔ پس جب انہوں نے اُس (تخت کو) اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا۔

فرمایا: قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ۔۔۔ یہ میرے پروردگار کا فضل ہے۔

نعمتیں امتحان بھی ہیں:

جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے تخت سامنے پڑا دیکھا تو فرمایا کہ یہ میرے پروردگار کا احسان ہے کہ مجھے ایسے کامل خادم عطا فرمائے اور اس قدر شوکت بخشی۔ آپ علیہ السلام کی زبان مبارک سے فوراً یہی نکلا کہ یہ اللہ کا انعام ہے۔ اللہ ہی نے یہ طاقت دی اور یہ کر دیا اور: لِيَبْلُوَنِيٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ تا کہ مجھے آزمائے کہ میں شکر ادا کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں۔ اللہ کریم کا یہ فضل اور انعام امتحان بھی ہے کہ ہم اپنی طاقت پر نازاں ہو جاتے ہیں یا اس کے احسان پر شکر کرتے ہیں۔ انہیں ہم اپنا کمال سمجھتے ہیں یا اس کی عطا سمجھتے ہیں۔ یہ ایک امتحان ہے کہ ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں یا ناشکری کرتے ہیں۔

اللہ بے نیاز ہے:

فرمایا: وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اور جو شخص شکر ادا کرتا ہے تو وہ اپنے ہی نفع کے لیے کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو یقیناً میرا پروردگار بے نیاز اور کرم کرنے والا ہے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ جو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے وہ اپنا بھلا کرتا ہے، اپنے لیے بہتر کرتا ہے اور اگر کوئی ناشکری کرے تو وہ اپنا نقصان کرتا ہے۔ اللہ کریم ان باتوں سے بالاتر اور بے نیاز ہے۔ اللہ کسی کا محتاج نہیں، کسی کے شکر گزار ہونے سے اس کی عظمت میں اضافہ نہیں ہوتا اور ناشکری سے اس کی شان میں فرق نہیں آتا۔ ہاں! وہ بہت کریم ہے۔ ناشکروں کو بھی مہلت دے دیتا ہے، برداشت کیے رکھتا ہے اور اگر توبہ کریں تو توبہ قبول کر لیتا ہے اور زندگی میں مہلت دیے رکھتا ہے۔ اللہ کریم ہے کہ بندوں کو کتنے عظیم کمالات عطا فرماتا ہے، اس کے کرم کی کوئی انتہا نہیں ہے لیکن وہ غنی ہے، کسی کا محتاج نہیں ہے۔ کوئی اسے سجدہ کرے نہ کرے اسے سجدوں کی احتیاج نہیں ہے کہ جو کرتا ہے اپنے لیے بہتر کرتا ہے جو نہیں کرتا اپنے لیے مصیبت پیدا کر رہا ہے۔

ملکہء سبا کی ذہانت:

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہء سبا کا تخت منگوا لیا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾ انہوں (سلیمان علیہ السلام) نے فرمایا کہ اس (ملکہ) کے لیے اس کے تخت (کی صورت) کو بدل دو، ہم دیکھیں کہ اسے اس کا پتا لگتا ہے یا وہ ایسے لوگوں میں ہے جن کو پتا ہی نہیں چلتا۔

اُدھر ملکہ ءسبا اپنے درباریوں سمیت حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے روانہ ہوئی وہ راستے میں تھی کہ آپ علیہ السلام نے اس کا تخت منگوالیا تھا۔ ملکہ ءسبا کا تخت سونے چاندی سے مرصع تھا، اس پر جواہرات جڑے ہوئے تھے اور خوبصورت نقش و نگار سے مزّین تھا۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس میں کچھ تبدیلیاں کردی جائیں تا کہ دیکھیں کہ ملکہ کتنی ذہین ہے آیا وہ اپنے تخت کو پہچان لیتی ہے یا اُسے سمجھ ہی نہیں آتی کہ یہ وہی تخت ہے۔

فرمایا: فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ۔۔۔سو جب (ملکہ ان کی خدمت میں) حاضر ہوئی تو (اسے اس کا تخت دکھا کر) فرمایا کیا آپ کا تخت بھی ایسا ہی ہے؟

حضرت سلیمان علیہ السلام نے سوال فرمایا کہ کیا آپ کا تخت بھی اس تخت جیسا ہے جو ہمارے پاس پڑا ہے؟ ملکہ نے عرض کی: قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ۔۔۔اس نے کہا یہ گویا ہو بہو وہی ہے ملکہ کہنے لگی کہ حضرت مجھے تو لگتا ہے وہی تخت ہے۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ میرے تخت کے مشابہ ہے بلکہ کہا کہ میں تو یہ سمجھ رہی ہوں کہ یہ وہی تخت ہے۔

فرمایا: وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾ اور ہم کو اس کا پہلے ہی علم ہو چکا تھا (سلیمان علیہ السلام کی عظمت اور شان کا) اور ہم فرمانبردار ہیں۔

ملکہ نے عرض کی کہ حضرت ہمیں آپ کے خط سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کسی عظیم انسان کی تحریر ہے۔ آپ کے پاس قاصد بھیج کر، مال وزر بھیج کر ہمیں اس بات کا ادراک ہو گیا ہے کہ آپ کوئی دنیوی بادشاہ نہیں ہیں بلکہ آپ اللہ کے نبیؑ ہیں۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آپ محض دنیوی بادشاہ ہیں تو ہم مقابلہ کرتے خواہ ہمیں شکست ہو جاتی کہ فتح و شکست ہوتی رہتی ہے۔ ہم جان گئے تھے کہ آپ اللہ کے رسولؑ ہیں اور بادشاہ بھی ہیں اور اس معجزے کی ضرورت تو نہ تھی کہ ہمیں اندازہ ہو چکا تھا۔ اب تو ہم آپ کی عظمت کا اقرار کر کے اطاعت گزار بن کر آئے ہیں۔

انبیاؑ کا اصل کام:

فرمایا: وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔۔۔اور وہ جو اللہ کے سوا (وروں کی) پرستش کرتی تھی اس سے اس کو روکا گیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ کو غیر اللہ کی پرستش سے منع فرمادیا یعنی عقیدہ تعلیم فرمایا۔ انبیاؑ کا اصل کام عقدیے کی ترویج ہی ہوتا ہے۔ سو آپ علیہ السلام نے توحید کا عقیدہ تعلیم فرمایا اور اللہ کے علاوہ سورج کی یا دوسری

موہوم ہستیوں کی دیوی دیوتاؤں جن کی بھی پوجا کرتی تھی اس سے اُسے روک دیا۔ فرمایا: اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾ کہ بے شک (اس سے پہلے تو) وہ کافروں کی قوم میں سے تھی۔

ملکہء سبا دانشمند خاتون تھی مگر پہلے ایمان اس لیے نہ لاسکی کہ قوم کی رسومات میں گرفتار ہو کر حق سے دور تھی کہ ساری قوم ہی غیر اللہ کی، سورج کی پرستش کرنے والے لوگ تھے۔ چونکہ قوم ہی کافر تھی اس نے بھی ان کی رسومات میں آنکھ کھولی تھی تو اس کا اثر بد یہ تھا کہ ذہین ہونے کے باوجود اندھیرے میں تھی شمسِ نبوت کو دیکھا تو آنکھیں روشن ہو گئیں۔

ملکہ کا قبولِ اسلام:

فرمایا: قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۔۔۔

اس سے کہا گیا کہ محل میں چلیے پھر جب اس نے اس (فرش) کو دیکھا تو اس نے اُسے پانی کا حوض سمجھا اور اپنی پنڈلیاں کھول دیں۔ جب ملکہء سبا سے محل کے اندر چلنے کو کہا گیا اور وہ صحن میں داخل ہونے لگیں تو اتنا خوبصورت محل تھا اس کے صحن کی خوبصورتی کا یہ عالم تھا کہ اس میں حوض بنے ہوئے تھے، نیچے پانی جاری تھا اور ان میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ اوپر خوبصورتی سے شیشہ جڑا ہوا تھا کہ سمجھ ہی نہیں آتا تھا کہ شیشہ ہے۔ یہ تو صحن کا عالم تھا محل کے اندر کیا کچھ ہوگا اور وہ کتنا خوبصورت ہوگا اس کا اندازہ تو مشکل ہے۔ سو ملکہء سبا نے سمجھا کہ پانی سے گزرنا ہوگا تو اپنے کپڑوں کو پنڈلیوں تک اونچا کیا تا کہ پانی میں سے گزر سکیں تو انہیں بتایا گیا فرمایا: قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ۔۔۔ کہا (سلیمان علیہ السلام نے) یہ تو ایک ایسا محل ہے جس میں (نیچے بھی) شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ ملکہ کو بتایا گیا کہ یہ تو ایسا محل ہے جس کے نیچے حوض ہیں اور ان پر شیشہ جڑا ہوا ہے اور آپ کو شیشے پر چل کر جانا ہے پانی میں سے نہیں گزرنا۔ ملکہ کہنے لگیں: قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۴﴾ تو وہ بولی اے میرے پروردگار! میں (پہلے بھی) اپنے آپ پر ظلم کرتی رہی تھی اور میں سلیمان (علیہ السلام) کے ساتھ اللہ پر جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے ایمان لاتی ہوں۔

ملکہ کہنے لگی کہ اے پروردگار! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا تیری عظمت کو نہ پہچانا اور سورج کی پوجا کرتے رہے، کفر میں بھٹکتے رہے اور عمریں ضائع کر دیں۔ ہم تو ایسے ہیں کہ زمین پر ایک محل میں نہیں جانچ سکے کہ پانی سے گزرنا ہے یا اس کے اوپر سے گزر جائیں گے۔ ہمیں اتنا بھی پتا نہیں چلا تو ہم کیسے جان سکتے تھے کہ کس کی عبادت

کی جائے، معبودِ برحق کون ہے۔ ہم سے بہت غلطی ہوئی اور ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اب بارگاہِ نبوتؐ میں آ کر ہمیں ایمان نصیب ہو گیا: وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ ۔۔۔ ہم اسی بات پر ایمان لائے، اسلام لائے جس پر اسلام لانے کا حکم سلیمان علیہ السلام دیتے ہیں۔ اللہ کے لیے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

اسلام کیا ہے:

یہاں یہ بات بھی طے ہو گئی کہ اسلام کیا ہے۔ جو عقیدہ اللہ کا رسولؐ، اللہ کا نبیؐ منوانا چاہتا ہے وہ اسلام ہے۔ اس سے باہر اسلام نہیں ہے۔ اگر کوئی اپنے طور پر مختلف نظریات مان کر خود کو مسلمان کہتا رہے تو وہ عنداللہ مقبول نہیں ہوگا۔ ایمانیات کی بنیاد ذات اور صفاتِ باری پر ایمان، انبیاؑ و رسلؑ، کتابیں، فرشتے، آخرت، عذاب و ثواب پر ایمان لانا ہے اور یہ ضروریاتِ دین ہیں لیکن ان سب کو ویسا ماننا ضروری ہے جیسا اللہ کے نبیؐ نے ماننے کا حکم دیا ہے۔ ورنہ اپنی رائے کے مطابق کوئی اللہ کو مانتا رہے، اپنی مرضی سے فرشتوں کو بھی مانتا رہے تو یہ تو مکہ کے مشرک بھی مانتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اللہ بھی ہے فرشتے بھی ہیں لیکن فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مانتے تھے۔ یہ ماننا تو نہ ماننا ہوا۔ اسی طرح دنیا کا ہر شخص کوئی نہ کوئی ایسی غیبی طاقت مانتا ہے جو اس کی حفاظت کرتی ہے، اسے بیماری میں شفا دیتی ہے اس کی مددگار ہوتی ہے لیکن ہر ماننے والا ضروری نہیں کہ اللہ کو وہ طاقت مانتا ہو۔ اللہ جل شانہ کا ماننا وہ ہے جیسا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ اس کی ذات کو ایسا مانا جائے، اس کی صفات ایسی مانی جائیں۔ اسی طرح دین اُن احکام کا نام ہے اور کام کو اس طرح کرنے کا نام ہے جس طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں۔

اصل دین زندگی کے امور ہیں:

یہاں ایک اور غلط فہمی کا بھی ازالہ ہو جائے۔ عمومی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ادا کر لی، قرآن کی تلاوت کر لی یہ سارا دین ہے اور یہ ادا کر کے دین کے تقاضے پورے ہو گئے۔ باقی زندگی ہماری ہے۔ اس میں ہماری مجبوریاں بھی ہیں، تعلقات اور رشتے بھی ہیں اور ہمیں لوگوں کا بھی لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں اپنی ضرورتیں بھی پوری کرنی ہیں پیسہ بھی کمانا ہے، گھر بنانا ہے بچے پالنے ہیں سو اس میں ہمیں اپنی مرضی کرنی ہے۔ یہ دین نہیں ہے۔ ساری عبادات کا حاصل یہ ہے کہ ہماری زندگی کے جتنے امور ہیں اُن میں اللہ کی مرضی آ جائے ہم اللہ کی نافرمانی چھوڑ دیں۔

دین یہی ہے کہ جو کام ہم دن بھر کرتے ہیں، کاروبار، تجارت، مزدوری، ملازمت، دوستی دشمنی، رشتے

داری، اولاد کی تربیت، والدین سے تعلقات، بہن بھائیوں سے لوگوں سے معاملات۔قومی اور بین الاقوامی سطح پر جتنے کام کرتے ہیں جب انہیں اللہ کی شریعت کے مطابق کیا جائے تو یہ اصل دین ہے۔عبادات دین کا ایک حصہ ہیں۔ عبادات کا حاصل یہ ہے:اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔۔۔(العنکبوت:45)بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔

اللہ کریم نے عبادات فرض کر کے ہمیں ایک قوت دی ہے جو ہمیں دنیوی کام کرنے میں نیکی پر قائم رکھتی ہے اور برائی سے روکتی ہے۔اگر کوئی دنیوی امور میں جائز و ناجائز کی پروا نہیں کرتا تو اس کو یہ سوچنا ہوگا کہ وہ عبادت کر بھی رہا ہے یا نہیں۔ بھلے نمازیں پڑھتا رہے، عمرے کرتا رہا، حج کرتا رہے۔بعض لوگ بڑے عجیب عجیب کھیل کھیلتے ہیں۔لاکھوں لوگوں کو لوٹ کر چند لوگوں کو پیسے خیرات میں دے کر سمجھتے ہیں نیکی ہوگئی۔سارا دن جھوٹ بولا، دھوکا دیا، دولت کمائی اور عمرہ کر آئے کہ کفارہ ہو گیا۔ یہ درست نہیں ہے۔اصل دین ہمارے معاملات ہیں جو ہم انجام دیتے ہیں۔ہم کماتے کیسے ہیں حلال کماتے ہیں یا حرام، خرچ کیسے کرتے ہیں جائز یا ناجائز کاموں پر، تعلقات کیسے نبھاتے ہیں۔والدین کا حق ادا کرتے ہیں یا نہیں، اولاد کا حق ادا کرتے ہیں یا نہیں، کاروبار یا لین دین میں ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھتے ہیں یا نہیں۔قومی سطح پر اور بین الاقوامی سطح پر ہمیں انسانیت کی بہتری کی فکر ہے یا نہیں۔یہ سارا اسلام ہے، یہ سارا دین ہے۔نماز روزہ اس لیے ہے کہ اللہ کا قرب حاصل ہو۔اللہ کی بارگاہ میں پانچ بار حاضری نصیب ہو جس سے اللہ کی اطاعت کی توفیق ارزاں ہو اور ان امورِ دنیا میں ہم اللہ کی اطاعت کر سکیں۔سو اصل دین یہ زندگی اور اس کے امور ہیں اور ان سے ہی پتا چلتا ہے کہ بندے میں دین ہے یا نہیں ہے۔عبادات دین کا اہم حصّہ ضرور ہیں لیکن صرف عبادات ہی دین نہیں اصل دین عملی زندگی ہے۔جب بندہ دین سے ہٹتا ہے تو اس کا سارا کردار غلط ہو جاتا ہے۔اس میں خواہش اور نفس پرستی آ جاتی ہے، وہ دوسروں کے حقوق پامال کرتا ہے۔جب دوسروں پر ظلم کرتا ہے تو وہ اپنے آپ پر ظلم کے مترادف ہے۔اس بات پر خوش نہیں ہونا چاہیے کہ میں نے فلاں کو دھوکا دے کر پیسے لے لیے فلاں سے جھوٹ بول کر کام نکلوا لیا۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دوسرے کے ساتھ تو شاید کم ظلم ہے اپنے ساتھ زیادہ ظلم ہے۔اس لیے کہ دوسرے کے ساتھ زیادتی کرنے کی جو سزا ملے گی وہ تو خود بھگتنی ہوگی۔سو یہ اپنے ساتھ ظلم ہے۔عبادات کا حاصل یہ ہے کہ ہم اپنے آپ پر ظلم کرنے سے رک جائیں۔

اسرائیلیات:

ملکہء سبا اور اس کی پوری قوم کے مسلمان ہو جانے کی خبر تو قرآن نے دے دی ہے۔ اس واقعہ میں نزولِ قرآن سے پہلے بنی اسرائیل نے بے شمار حکایتیں، طویل داستانیں شامل کر دی تھیں۔ اسی طرح یوسف علیہ السلام اور پہلے انبیاؑ اور رسولوں کے واقعات میں بڑے بڑے افسانے تراشتے، تو ان سب باتوں کو اسرائیلیات کہا جاتا ہے یعنی بنی اسرائیل کی بنائی ہوئی کہانیاں۔ ان اسرائیلیات میں ملتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہء سبا سے نکاح کر لیا اور اُنہیں حکومت پر بحال رکھا۔ اگر کر لیا تو اچھی بات ہے کہ انہیں ایک اعلیٰ منصب عطا کر دیا اور ازواجِ نبیؐ میں شامل فرما لیا لیکن اس کی کوئی سند کسی حدیث شریف میں نہیں ملتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی۔ کچھ لوگ اس واقعہ سے عورت کی حکمرانی کی دلیل لیتے ہیں کہ جائز ہے۔ یہ بات پہلے بھی گزر چکی ہے کہ ہمیں اتباع، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا کرنا ہے سلیمان علیہ السلام کا نہیں، یہ قطعی بات ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر آپ علیہ السلام نے نکاح کر لیا اور حکومت پر بحال رکھا تو پھر وہ بادشاہ نہ رہی بلکہ بادشاہ کا نمائندہ ہوگئی، اس کی مطلق العنان بادشاہی نہ رہی۔ بہر حال ان دلیلوں سے اُمتِ مسلمہ کا کوئی سروکار نہیں۔ ہم تمام انبیاؑ پر ایمان لاتے ہیں۔ سب کی کتابوں کو حق مانتے ہیں اور سب کی عظمت کے قائل ہیں لیکن اتباع صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ہوگا۔ عمل صرف قرآنِ کریم پر ہوگا، تورات، زبور، انجیل پر آج عمل نہیں ہوگا اگرچہ ہم انہیں اللہ کی کتابیں مانتے ہیں۔

سورۃ النمل رکوع 4 آیات 45 تا 59

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ
يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا
تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ
طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَكَانَ فِى الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ
رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ
لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا
لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَانْظُرْ
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتِلْكَ
بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً ۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاَنْجَيْنَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ
وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ
بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ (20) فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا
اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ
وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ
فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۵۸﴾ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ

اصْطَفٰی ؕ آٰللّٰهُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾

اور بے شک ہم نے ثمود کے پاس ان کے (قومی) بھائی صالح (علیہ السلام) کو بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو تو وہ دو فریق ہو کر آپس میں جھگڑا کرنے لگے ﴿۴۵﴾ انہوں نے فرمایا اے قوم! تم بھلائی سے پہلے بُرائی کے لیے کیوں جلدی کرتے ہو (اور) اللہ سے بخشش کیوں نہیں مانگتے تا کہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۴۶﴾ وہ کہنے لگے تم اور تمہارے ساتھیوں کو ہم نے بدشگون پایا انہوں نے فرمایا تمہاری بدشگونی اللہ کی طرف سے ہے بلکہ تم ایسے لوگ ہو کہ (کفر کے باعث) عذاب میں مبتلا ہو گے ﴿۴۷﴾ اور شہر میں نو شخص تھے جو ملک میں فساد کرتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے ﴿۴۸﴾ کہنے لگے کہ اللہ کی قسمیں کھاؤ کہ ہم ضرور اس پر اور اس کے گھر والوں پر شب خون ماریں گے پھر ان کے وارثوں سے کہہ دیں گے کہ ہم تو ان کے گھر والوں کی ہلاکت کے موقع پر موجود ہی نہ تھے اور بے شک ہم سچ کہتے ہیں ﴿۴۹﴾ اور انہوں نے ایک تدبیر کی اور ہم نے بھی تدبیر فرمائی اور ان کو کچھ خبر نہ ہوئی ﴿۵۰﴾ تو دیکھ لیجیے ان کی چال کا کیا انجام ہوا ہم نے ان کو اور ان کی تمام قوم کو تباہ کر دیا ﴿۵۱﴾ پس یہ ان کے گھر ان کے ظلم کے سبب ویران پڑے ہیں بے شک اس (واقعہ) میں اہلِ علم کے لیے بڑی عبرت ہے ﴿۵۲﴾ اور ہم نے ایمان والوں اور پرہیزگاروں کو نجات بخشی ﴿۵۳﴾ اور لُوط (علیہ السلام) کو جب انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم دیکھتی آنکھوں بے حیائی کے کام کیوں کرتے ہو؟ ﴿۵۴﴾ کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو بلکہ تم حماقت کرنے والی قوم ہو ﴿۵۵﴾ تو اُن کی قوم کے پاس کوئی جواب نہ تھا سوائے اس کے کہ کہنے لگے کہ لُوط (علیہ السلام) کے لوگوں کو اپنی بستی سے نکال دو کیونکہ یہ بڑے پاک باز لوگ (بنتے ہیں) ﴿۵۶﴾ سو ہم نے ان کو اور ان کے پیروکاروں کو بچا لیا سوائے ان کی بیوی کے کہ اس کو ہم نے ان لوگوں میں مقرر فرما رکھا تھا جو پیچھے

رہ گئے ﴿۵۷﴾ اور ہم نے ان پر مینہ برسایا جوان پر برسا سو جن لوگوں کو (انجام بد سے) ڈرایا گیا تھا ان پر جو مینہ برسا وہ بہت بُرا تھا ﴿۵۸﴾ فرما دیجیے سب خوبیاں اللہ ہی کو سزاوار ہیں اور اس کے بندوں پر سلام ہو جن کو اس نے چُن لیا ہے بھلا اللہ بہتر ہے یا جن کو یہ (اس کا) شریک ٹھہراتے ہیں ﴿۵۹﴾

تفسیر ومعارف

حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت پر قوم کا جواب:

فرمایا: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِیْقٰنِ یَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ اور بے شک ہم نے ثمود کے پاس ان کے (قومی) بھائی صالح (علیہ السلام) کو بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو تو وہ دو فریق ہو کر آپس میں جھگڑنے لگے۔

اللہ کریم نے قوم ثمود کی طرف اُنہی کے ایک فرد حضرت صالح علیہ السلام کو نبوت کے لیے منتخب فرمایا اور اُن کی طرف مبعوث فرمایا۔ ہر نبیؑ کی طرح حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت بھی یہی تھی: اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ ۔۔۔ اللہ کی عبادت کرو۔ سارے دین کی بنیاد اسی بات پر ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے اس کی عبادت کرو عبادت یہ ہے کہ اپنی ساری توقعات اس ایک ہستی سے وابستہ کر لو اور اس کی اطاعت کرو۔ عبادت صرف نماز، روزے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ تو آسان کام ہیں۔ مشکل کام وہ معاملات ہیں جو ہم معاشرے میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ کاروبارِ حیات میں لوگوں سے لین دین وغیرہ کرتے ہیں عبادت یہ ہے کہ ہر جگہ اللہ کی اطاعت کی جائے اپنی مرضی نہ چلائی جائے۔ حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت پر قوم دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک فریق نے نبیؑ کی بات کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہم میں نبیؑ مبعوث فرمایا ہے اور ہمیں زندگی کا نظامِ حیات دے دیا ہے۔

دوسرے فریق نے کہا کہ یہ مصیبت کہاں سے تم نے مول لے لی ہے۔ کیا ہم اپنا بھلا بُرا نہیں جانتے، کیا اب یہ ہمیں بتائے گا کہ ہمارا فائدہ کس میں ہے اور نقصان کس میں ہے؟ کیا ہم بے وقوف ہیں، ہم نہیں جانتے؟ سو وہ لوگ دو فریق بن گئے، دو طبقے بن گئے اور آپس میں جھگڑا کرنے لگ گئے۔

جو طبقہ مخالفین کا تھا وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم تو نہیں مانتے لہٰذا انکار پر جو عذاب آتے ہیں انہیں تم لے آؤ کہ ہم بھی دیکھیں عذاب کیا آتا ہے؟ یہ جو آپ (علیہ السلام) کہتے ہیں کہ جو نہیں مانے گا اس پر اللہ کی گرفت ہو گی، ناراضگی

ہوگی اور اسے عذاب ہوگا تو پھر کہاں ہے عذاب؟ لے آؤ۔

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا: قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ۔۔۔ انہوں نے فرمایا اے قوم! تم بھلائی سے پہلے برائی کے لیے کیوں جلدی کرتے ہو۔

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا اے میری قوم! تم کیسے بے وقوف ہو کہ تمہارے سامنے دو باتیں ہیں جن میں ایک طرف بہتری ہے، بھلائی ہے اور کامیابی ہے۔ اگر میری اطاعت کرو گے تو تمہارا بھلا ہوگا۔ دوسری طرف عذابِ الٰہی ہے۔ اگر تمہیں انتخاب ہی کرنا ہے، آزمانا ہے تو اطاعت کر کے آزمائش کرو کہ دیکھیں کیا بھلا ہوتا ہے۔ اگر انتخاب کرنا ہے تو یہ کیا انتخاب ہے کہ تم مخالفت کر کے عذاب کو دعوت دے رہے ہو۔ تم بھلائی کو چھوڑ کر مصیبت پہلے چاہتے ہو۔ عذاب الٰہی کی طرف جانے کی تمہیں جلدی ہے کہ عذاب لا دو۔ فرمایا: لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴿۴۶﴾ (اور) اللہ سے بخشش کیوں نہیں مانگتے تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے قوم سے فرمایا کہ تم نے آج تک کفر و شرک میں زندگی بسر کی، اللہ کی نافرمانی میں زندگی گزاری جبکہ تمہارا اللہ تمہیں نعمتیں دیتا رہا۔ آج تمہیں اللہ نے ایک ایسا موقع دیا ہے کہ اپنی بارگاہ کا ایک دروازہ کھول دیا ہے تمہارے پاس اپنا ایک نبیؑ بھیجا ہے تو تم اللہ کی بارگاہ میں توبہ کیوں نہیں کر لیتے؟ آج توتو بہ سے ہی ساری پچھلی خطائیں معاف ہو جائیں گی اور آئندہ کے لیے نبیؑ کا اتباع کر لو تو اللہ کی رضا حاصل ہو جائے گی۔ یہ کام آسان ہے اور اس میں بھلائی ہے لیکن تم یہ آسان راستہ اختیار کرنے کی بجائے عذاب مانگ رہے ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے؟ تم اللہ کی بارگاہ میں توبہ کیوں نہیں کر لیتے، وہ تم پر رحم فرمائے گا۔

برائی پر اتفاق تباہ کن ہے:

حضرت صالح علیہ السلام کی نصیحت پر اُن کے مخالفین بولے: قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ۔۔۔ وہ کہنے لگے تم اور تمہارے ساتھیوں کو ہم نے بدشگون پایا۔

وہ کہنے لگے کہ ساری بدبختی تو آپ کی وجہ سے ہے کہ ہم سب تو بڑے مزے میں خوشی سے رہ رہے تھے۔ ہم سب میں بہت اتفاق تھا، ہم بالکل یکجان تھے آپؑ نے آ کر ہم میں فساد پیدا کر دیا دراڑ ڈال دی۔ یہ جو ہم میں اب جھگڑے ہو رہے ہیں اس کا سبب آپ کی آمد ہے۔ آپ نے کہہ دیا کہ میں اللہ کا نبی علیہ السلام ہوں لہٰذا اب یہ کام کرو اور یہ نہ کرو۔ یوں ایک نیا لائحہ عمل، ایک نیا نظام دے دیا جس سے ہم میں نا اتفاقی ہو گئی۔ یعنی ہم تو مزے سے رہ رہے تھے۔ شرک بھی کرتے تھے، کفر بھی کرتے تھے۔ ساری قوم ایک روش پر تھی۔ غریب اور کمزور کو لوٹتے تھے، ان کا مال،

آبرو اور جان تک لوٹتے تھے اور کوئی چوں نہیں کر سکتا تھا۔ مظلوم شکایت نہیں کرتا تھا کسی عدالت میں نہیں جاتا تھا بلکہ وہ بھی اپنے سے کمزور کو لوٹ لیتا تھا تو سب ہی ایک روش پر متفق تھے اور خوب مزے سے گزارا ہو رہا تھا۔ آپ علیہ السلام کے آنے سے یہ ساری بدبختی اور نااتفاقی آ گئی۔

ہر گمراہ ایک طرح سوچتا ہے:

ایسے دانشور تو ہر عہد میں ہوتے ہیں اور آج بھی بہت سے ہیں جنہیں اسلام کے بہت سے احکام پر اعتراض ہے۔ آج بھی دانشور یہی کہتے ہیں کہ مدارس میں فساد پیدا ہو رہا ہے۔ یہ جو نمازی داڑھیوں والے اور مولوی ہیں انہوں نے فساد پیدا کر رکھا ہے مدرسوں میں تو دہشت گرد پیدا ہو رہے ہیں جبکہ دانشور تو صلح سے رہنا چاہتے ہیں۔ یہ صلح صفائی یوں رہے گی کہ حرام کاروں کے ساتھ حرام کاری کر لی نیکوں کے ساتھ مسجد چلے گئے۔ یہی دانش ہر عہد میں رہی ہے۔ سو آج بھی اگر دین کی بات کی جائے برائی سے روکا جائے تو معاشرے میں نااتفاقی کا طعنہ دیا جاتا ہے مگر یاد رہے برائی پر اتفاق اجتماعی خودکشی کا نام ہے جبکہ نیکی پر قائم رہنا ہی اصل اتفاق ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے اُن کی بات سن کر فرمایا: قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾ انہوں نے فرمایا تمہاری بدشگونی اللہ کی طرف سے ہے بلکہ تم ایسے لوگ ہو کہ (کفر کے باعث) عذاب میں مبتلا ہو گئے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا بدبختی تو تمہاری ہے اور اللہ کی بارگاہ میں تمہاری بدنصیبی لکھی جا چکی ہے۔ تمہارا عقیدہ اور کردار ہی بدنصیبی اور بدبختی تھا اور اللہ کریم کی عظمت ہے کہ وہ تمہیں برداشت کرتا رہا اور اب تمہارے لیے نبیؑ مبعوث فرما کر توبہ کا بہت بڑا دروازہ کھول دیا ہے۔ تمہیں تو چاہیے تھا کہ اس سے فائدہ اٹھاتے لیکن اپنے نبیؑ کی بعثت کے بعد بھی تم کفر پر ڈٹے ہوئے ہو۔ بدبخت تو تم خود ہو۔

فساد کرنے والوں کی تدبیر:

فرمایا: وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ اور شہر میں نو شخص تھے جو ملک میں فساد کرتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔

حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے نو سرکردہ لوگ تھے۔ اُن کے شہر میں ممکن ہے نو قبیلے ہوں اور اُن کے سردار یہ نو لوگ ہوں جو اثر و رسوخ والے تھے۔ ان سرداروں کا کام ہمیشہ فساد پھیلانا ہی ہوتا تھا، کبھی اصلاح کی بات نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے مشورہ کیا: قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا

شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ کہنے لگے کہ اللہ کی قسمیں کھاؤ کہ ہم ضرور اس پر اور اس کے گھر والوں پر شب خون ماریں گے پھر ان کے وارثوں سے کہہ دیں گے کہ ہم تو ان کے گھر والوں کی ہلاکت کے موقع پر موجود ہی نہ تھے اور بے شک ہم سچ کہتے ہیں۔

اُن نو سرداروں نے جو سب کے سب فسادی تھے، نہ صرف اپنی قوم میں بلکہ گردونواح میں بھی فساد ڈال رکھا تھا اور کبھی بھلائی کا کام نہ کرتے تھے جب لاجواب ہو گئے تو آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ کہنے لگے کہ ایسا کرتے ہیں رات کو شب خون مارتے ہیں، حضرت صالح علیہ السلام اور اُن کے خاندان کو تہ تیغ کر دیتے ہیں۔ ایسا کرنے سے دو تین دن پہلے کہیں چلے جاتے ہیں۔ روپوش ہو جاتے ہیں پھر رات کو آ کر ان سب کا صفایا کر کے پھر غائب ہو جائیں گے۔ بعد میں آ کر ان کے قبیلے سے کہہ دیں گے کہ یہ سب تو ہمارے پیٹھ پیچھے ہوا۔ ہم تو موجود ہی نہیں تھے سو ہم نہیں جانتے کہ کس نے کیا ہے۔

کہنے لگے کہ اس پر اللہ کی قسمیں کھاؤ کہ ہم شب خون ماریں گے اور حضرت صالح علیہ السلام اور اُن کے خاندان کو تہ تیغ کر دیں گے۔ اُن کے ورثا سے کہیں گے کہ ہم تو قتل کے وقت شہر میں ہی نہیں تھے اور ہم سچ کہہ رہے ہیں۔

ایک قابلِ غور بات:

یہ بات بڑی قابلِ غور ہے کہ کفار بھی اللہ کی قسم اٹھا رہے ہیں۔ صالح علیہ السلام کے منکر بھی کہہ رہے ہیں کہ اللہ کی قسم، گویا وہ اللہ کو مانتے تھے لیکن مانتے اپنی پسند سے تھے۔ اس لیے اسے اسلام نہیں کہا گیا کہ یہ تو انسان کی مجبوری ہے اسے ماننا پڑتا ہے کہ کوئی ایسی ہستی ہے جس نے کائنات کو بنایا ہے اور جسے کسی نے نہیں بنایا۔ اس ہستی کا نام وہ جو بھی رکھ لیں۔ اب یہ لوگ جو انکار کر رہے ہیں نبیؑ کے قتل کا منصوبہ بنا رہے ہیں اور اس پر کہہ رہے ہیں اللہ کی قسمیں کھاؤ۔ کیسی عجیب بات ہے!

ہم خوش ہیں کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ کو ماننے کا پتا ہمارے کردار سے چلتا ہے۔ ہم اگر کردار میں اپنی مرضی کرتے ہیں تو پھر اللہ کو کس وقت مانتے ہیں؟

دنیا میں دو کام سب سے مشکل ہیں۔ پہلا ہے اللہ کو ویسا ماننا جیسا وہ ہے اور دوسرا ہے قیامت کے دن جوابدہی کا یقین رکھنا۔ یہ دو مشکل ترین کام ہیں اور ان پر عمریں لگتی ہیں، محنتیں لگتی اور تب جا کر کوئی ذرّہ یقین کا نصیب ہوتا ہے۔ ورنہ دن بھر جو کام ہم کرتے ہیں کیا ہمیں یہ احساس ہے کہ اس کا جواب دینا ہے؟ ہم بندوں سے چھپ کر

کام کر لیتے ہیں اگر یقین ہو کہ اللہ کریم ہمیں دیکھ رہے ہیں تو پھر چھپ تو نہیں سکتے۔ یہ یقین ہو کہ ایک دن اللہ کریم کی بارگاہ میں جوابدہ ہونا پڑے گا تو کیا کوئی بندہ برائی کر سکتا ہے؟ یہ دونوں مشکل کام ہیں۔

اللہ کی تدبیر:

فرمایا: وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ اور انہوں نے ایک تدبیر کی اور ہم نے بھی تدبیر فرمائی اور اُن کو کچھ خبر نہ ہوئی۔

انہوں نے اپنے دماغ کو استعمال کر کے تدبیر بنائی۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ہم نے بھی ایک تجویز کی۔ انہوں نے حق کو مٹانے کی کوشش کی ہم نے انہیں مٹا دینے کی تجویز کر دی۔ ان کی تجویز، تجویز ہی رہی جبکہ ہماری تجویز پر عمل ہو گیا اور وہ اس بات کو سمجھ نہ سکے کہ اللہ کے مقابلے میں اُن کی تجویزیں کیا کریں گی۔ ایسے بے شعور لوگ تھے، عظمتِ الٰہی سے بیگانہ تھے۔ پھر فرمایا: فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾ تو دیکھ لیجیے اُن کی چال کا کیا انجام ہوا ہم نے اُن کو اور اُن کی تمام قوم کو تباہ کر دیا۔

اللہ کریم فرماتے ہیں، میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم! دیکھیے اُن کی تجویز کا کیا انجام ہوا؟ مفسرینِ کرام فرماتے ہیں کہ وہ نو سردار جو قتل کے ارادے سے نکلے تھے، رات کے اندھیرے میں پہاڑ کے دامن میں جا رہے تھے کہ ایک بڑا سا پتھر لڑھک کر آیا اور سب اس کے نیچے دفن ہو گئے۔ جو قوم رہ گئی اسے عذاب کی وعید سنا دی گئی کہ پہلے دن اُن کے چہرے زرد ہو جائیں گے۔ دوسرے دن سرخ ہو جائیں گے۔ تیسرے دن سیاہ ہو جائیں گے اور چوتھے دن اُن پر عذاب آ جائے گا۔ اب جب چہرے بدلے تو چیخنے لگے، پیٹنے لگے، سردار بھی نہ ملے تو پھر بھاگے کہ اب ہمیں بچایئے۔ فرمایا جب عذاب کا ظہور ہو جائے، سامنے آ جائے پھر ٹلتا نہیں ہے۔ اگر اس کے ظہور سے پہلے توبہ کر لیتے تو بچ جاتے۔ چنانچہ روتے پیٹتے طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہوتے رہے آخر تیز چنگھاڑ آئی جس سے سب کے دل پھٹ گئے اور سب مر کر تباہ ہو گئے۔

فرمایا: فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً ۔۔۔ یہ دیکھ لو اب اُن کے محلات اور مکانات ویران پڑے ہیں۔

عذاب اور نجات کا سبب:

فرمایا: فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾ پس یہ ان کے گھر ان کے ظلم کے سبب ویران پڑے ہیں بے شک اس (واقعہ) میں اہلِ علم کے لیے بڑی عبرت ہے۔

اُن کی قوم تباہ و برباد ہو گئی اور اُن کے مکانات ویران پڑے ہیں جن میں کوئی بسنے والا نہیں ہے۔ کوئی

انسان باقی نہیں کہ ان میں آباد ہو۔ جنگل کے جانور اور حشرات الارض اُن میں بس رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ بِمَا ظَلَمُوْا ۔۔۔ انہوں نے اپنے ساتھ خود ظلم کیا کہ اللہ کے نبیؑ کو، اللہ کے دین کو مٹانے کے درپے ہو گئے۔ سو اللہ نے انہیں مِٹا دیا۔ سادہ سی بات ہے۔ اگر کوئی باشعور ہو، جس نے کبھی کردار اور نتائج کا مطالعہ کیا ہو تو اُس کے لیے اس میں بہت بڑا درسِ عبرت ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ جہاں ساری قوم تباہ ہو گئی وہاں: وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾ اور ہم نے ایمان والوں اور پرہیزگاروں کو نجات بخشی۔ جن لوگوں نے حضرت صالح علیہ السلام کا دامن تھام لیا اور اُن کا اتباع کیا، اُن سب کو اللہ کریم نے بچا لیا۔ اسی فضا میں، اسی ہوا میں تھے مگر انہیں اللہ تعالیٰ نے اُن بیماریوں سے بھی بچا لیا اور عذاب سے بھی جو اُن نافرمانوں پر وارد ہوا۔ اس لیے کہ یہ ایمان والے وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾ یہ پرہیزگار لوگ تھے، اللہ کے اطاعت گزار تھے۔ وہ اللہ کو وحدہٗ لاشریک سمجھنے والے، اللہ کو حاضر و ناظر سمجھنے والے تھے۔ انہوں نے اللہ کے نبیؑ کا دامن تھاما ہوا تھا اور اللہ کی اطاعت کرتے تھے یعنی جس بات پر ایمان لائے تھے اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ اس لیے ہم نے انہیں بچا لیا اور اہلِ ایمان کا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ اس واقعہ میں ہر باشعور انسان کے لیے بڑی عبرت ہے۔

قومِ لوط کی بے حیائی اور آج کا مغربی معاشرہ:

فرمایا: وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ اور لوط (علیہ السلام) کو جب انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم دیکھتی آنکھوں بے حیائی کے کام کیوں کرتے ہو؟ کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو بلکہ تم حماقت کرنے والی قوم ہو یہ واقعہ حضرت لوط علیہ السلام کا ہے کہ وہ جس قوم کی طرف مبعوث ہوئے وہ نہ صرف بے حیا تھی بلکہ عام انسانی اخلاق بھی نہیں جانتی تھی اور ایسی بدبخت قوم تھی کہ وہ مردوں کے ساتھ برائی کرتے تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو بہت روکا۔ اُن کی قوم اس قبیح فعل کی موجد تھی، اس فعل کی بنیاد اسی قوم نے رکھی۔ آج مغرب کی دانش اسی سطح پر پہنچ گئی ہے اور یہی تصویر مغربی معاشرے کی ہے۔ اب مغرب میں اللہ کا دین نہیں ہے بلکہ کلیسا کا ہے کہ وہ بات نہیں مانی جاتی جو اللہ یا اللہ کا نبیؑ کہے بلکہ مذہب وہ ہے جو کلیسا کہے۔

جب یہ بیماری مغرب میں عام ہوئی اور اس کے حوالے سے شور اُٹھا تو لوگ اس کے حق میں کھڑے ہو گئے۔ اندازہ کیجیے کہ ظلم کو حق کہا جانے لگا اور یہ نعرے لگے کہ یہ لوگوں کا حق ہے۔ یہ بات کلیسا تک پہنچی اور اس نے

بڑی مہربانی کرتے ہوئے مردوں کو مردوں سے شادی کی اجازت دے دی اور وہاں مرد آپس میں شادی کرتے ہیں۔

یہ ہے وہ مغربی معاشرہ جہاں ہم جانے کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں۔ اپنے گھر اور زمینیں بیچنے کو تیار رہتے ہیں کہ وہاں کا ویزا لے سکیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اُس معاشرے پر کتنی لعنتیں نازل ہوتی ہوں گی اور کتنے مختلف پہلو ہوں گے غضبِ الٰہی کے۔ اس جرم کی سزا میں اللہ نے ان پر مختلف امراض بھیج دیے جیسے ایڈز کا مرض اور مغرب کی اپنی تحقیق ہے کہ یہ لواطت سے ہوتا ہے۔ یہ ایسا موذی مرض ہے جو مریض کے استعمال شدہ لباس پہننے سے بھی منتقل ہو جاتا ہے۔ یعنی ایسے عذاب جو اُن کے لباس میں بھی آگے منتقل ہو رہے ہیں وطنِ عزیز میں لوگ لنڈے بازار سے انگریزوں کی اترن خرید کر انگریز بننے کے لیے پہنتے ہیں انہیں بھی یہ مرض چمٹ جاتا ہے۔ اب جو اُن جیسا بننا چاہتا ہے اُسے بھی حصّہ مل جاتا ہے لیکن ہم ہیں کہ مغرب جانے کے لیے، مغربیوں جیسا بننے کے لیے ہماری جان نکلی جا رہی ہے۔ اُن جیسا حلیہ اور معاشرت اپنانا چاہتے ہیں، انہی کی طرح کا کھانا پینا بھی شروع ہو گیا ہے جسے فاسٹ فوڈ کہا جاتا ہے۔ یعنی جانوروں کی طرح گزرتے ہوئے کوئی چیز پکڑی اور کھاتے کھاتے چلے گئے۔ یہی طور طریقہ اب ہم مسلمان اپنا رہے ہیں اور بہت خوش ہیں کہ ہم مہذب ہیں۔ ہمیں کوئی تمیز نہیں کہ اس کھانے میں حلال ہے یا حرام ہے۔ اس میں جو گوشت ہے وہ ذبیحہ ہے یا غیر ذبیحہ ہے اس میں جو تیل استعمال ہو رہا ہے وہ حلال کا ہے یا حرام کا ہے۔ بس کھائے چلے جا رہے ہیں کوئی پروا ہی نہیں کرتے۔ بلکہ ہم تو اُن سے آگے نکل گئے کہ مغرب والے حلال حرام کی پروا نہیں کرتے لیکن صحت کے انداز سے بہت تحقیق کرتے ہیں کہ کھانا مضرِ صحت نہ ہو۔ ہمارے ہاں حرام حلال کی پروا ہے نہ ہی صحت کی پروا ہے۔ جیسا ملے کھاتے جاؤ۔

قومِ لوط کا جواب:

حضرت لوط علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو برائی سے روکا اور فرمایا کہ تم لوگ کتنے بے حیا اور جاہل ہو کہ انسانی اخلاق بھی نہیں جانتے کہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو۔ اس پر قوم بھڑک اٹھی اور کہنے لگی:

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۵۶﴾ تو ان کی قوم کے پاس کوئی جواب نہ تھا سوائے اس کے کہ کہنے لگے کہ لوط (علیہ السلام) کے لوگوں کو اپنی بستی سے نکال دو کیونکہ یہ بڑے پاکباز لوگ (بنتے) ہیں۔

حضرت لوط علیہ السلام نے قوم کو سمجھانا چاہا کہ تمہارا یہ فعل غیر انسانی ہے، جہالت ہے یہ ظلم ہے تم کیا کر رہے ہو! قوم کا جواب بس یہ تھا کہ لوط (علیہ السلام) اور ان کے خاندان کو، ماننے والوں کو اپنے شہروں سے نکال دو۔ یہ

بڑے نیک پاک لوگ ہیں انہیں الگ کردو، ہمیں رہنے دو۔قوم کے پاس کوئی جواب تو تھا نہیں۔کوئی عقلی یا نقلی دلیل بھی نہیں تھی کہ جواز پیش کر سکتے۔کہیں عقل میں یہ بات آتی ہو کہ ایسا کیا جائے یا کسی پرانی کتابوں سے نقل ہوئی ہو یا تاریخ میں ملتی ہو سوان کے پاس اپنے قبیح فعل کا کوئی جواز نہ تھا۔سو کہنے لگے کہ لوط علیہ السلام اور اُن کے سارے متبعین کو یعنی اُن کے ہم عقیدہ، ہم خیال اور اتباع کرنے والوں کو اپنے شہروں سے نکال دو۔یہ بڑے پاکباز بنتے ہیں بڑے پارسا بنتے ہیں اور ہمیں کہتے ہیں ہم غلط کر رہے ہیں۔

آج بھی یہی جواب دہرایا جاتا ہے:

یہی جواب آج بھی لوگ دہراتے ہیں۔کسی کو آپ برائی سے منع کریں، اُسے کہیں کہ اللہ کی عبادت کیا کرو، نماز پڑھو، روزہ رکھو، حلال کماؤ تو وہ کہتے ہیں کہ تم بڑے نیک ہو تم کہیں اور چلے جاؤ ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو۔یا کہتے ہیں ہم نے بڑے نمازی پارسا دیکھے ہیں۔

یہ شیطان کا ایک عجیب طریقہء واردات ہے۔اگر غور کیا جائے تو یہ لوگ جو جواب دیتے ہیں وہ وہی الفاظ ہوتے ہیں جو کبھی مشرکین مکہ کے منہ سے نکلے تھے اور کبھی وہی الفاظ ہوتے ہیں جو پہلی قوموں نے اپنے انبیاؑ کو جواب دیے تھے۔

شیطان یہ چاہتا ہے کہ بندے سے وہ گناہ ہو جو بہت بڑا ہو اس کے منہ سے وہ جواب نکلے جو ابوجہل نے دیا تھا۔بعینہٖ وہی الفاظ اس بندے کے منہ سے نکلتے ہیں۔

نازک مقام:

فرمایا: فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ سو ہم نے اُن کو اور اُن کے پیروکاروں کو بچا لیا سوائے اُن کی بیوی کے کہ اس کو ہم نے ان لوگوں میں مقرر فرما رکھا تھا جو پیچھے رہ گئے۔

یہ بڑا نازک مقام ہے اور بڑی عجیب بات ہے کہ اللہ کے نبیؑ کی اہلیہ جس نے نبیؑ کے ساتھ عمر بسر کی، ان کے گھر میں رہی خدمت کی لیکن تباہ کفار کے ساتھ ہوگئی۔اس لیے کہ وہ بظاہر نبیؑ کی اہلیہ تھی، لیکن ذہنی اعتبار سے اور قلبی طور پر اس کی محبت اُدھر تھی۔ظاہراً نبیؑ کے ساتھ تھی لیکن دل سے کافروں کے ساتھ تھی، ان کی طرفداری کرتی تھی۔اگر غور کریں تو ہم میں سے بھی بہت سے ایسے ہیں جو ذہن سے مسلمان ہیں لیکن دل مغرب میں اٹکے ہوئے ہیں۔جن سے محبت ہے اُن جیسا ہی نظر آنا چاہتے ہیں۔اُن جیسے ہی معاشرتی آداب اپنانا چاہتے ہیں۔جہاں ہماری دلی محبت ہے ویسا ہم ہونا چاہتے ہیں ویسا ہی حلیہ بناتے ہیں۔اللہ کریم سے معافی مانگنی چاہیے اور ڈرنا چاہیے۔یہ حلیہ ہمیں کہیں

لے نہ ڈوبے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ عالی ہے: عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ'' (مشکوٰۃ۔ کتاب اللباس الفصل الثانی)۔ ابن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں شمار ہوگا۔

اللہ کریم ہمیں معاف فرمائیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں قیامت کے دن انہی لوگوں کے ساتھ کھڑا کر دیا جائے جن کی مشابہت آج ہم بڑے شوق سے اختیار کرتے ہیں۔

قومِ لوط کا انجام:

فرمایا: وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۵۸﴾ اور ہم نے ان پر مینہ برسایا جو ان پر برسا سو جن لوگوں کو (انجامِ بد سے) ڈرایا گیا تھا ان پر جو مینہ برسا وہ بہت برا تھا۔

جب وہ قوم اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی تو اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ہم نے ان پر بارش برسائی اور وہ کیا ہی بُری بارش تھی جو اُن پر برسی جنہیں عذاب سے ڈرایا گیا تھا۔

مفسرین کے مطابق ان کے چار بڑے شہر تھے جن کو تباہ کر دیا گیا۔ جس طرح خلافِ فطرت برائی کا ارتکاب کرتے تھے اسی قسم کا ان پر عذاب نازل ہوا کہ سزا از قسم اعمال ہوتی ہے۔ جیسا کردار ہو ویسی سزا ہوتی ہے۔ یہ الٹا کام کرتے تھے اللہ کریم نے ساری زمینوں کو الٹ دیا۔ آسمانوں سے ان پر پتھر برسے یہ کام بھی الٹ ہی ہوا کہ بارش میں پانی نہیں برسا بلکہ پتھر برسے۔ تفاسیر میں ملتا ہے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ان کے شہروں کو ساتویں زمین تک یعنی اس تختہ ءزمین کو تہہ تک اکھیڑ لیا اور آسمان کے بہت قریب لے گئے پھر وہاں سے ان لوگوں سمیت اسے الٹ دیا۔ اوپر کا حصّہ نیچے اور نیچے کا حصّہ اوپر کر کے گڑھے میں پھینک دیا پھر اس پر پتھروں کی بارش برسی اور اتنی برسی کہ اس کے نشان بھی مٹا دیے۔ اب تک وہ گڑھا باقی ہے جو ایک بہت بڑی جھیل ہے جسے بحیرۂ مردار کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بحیرہ اس وسیع جھیل کو کہتے ہیں جو سمندر کی طرح ہو۔ بحیرۂ مردار میں زندگی کا کوئی نشان نہیں ہے۔ اس کا پانی سیاہ ہے اور اس میں کوئی آبی جانور مینڈک یا مچھلی بھی نہیں زندہ رہ سکتی اس میں کئی چھوٹے چھوٹے دریا بھی گرتے ہیں جو اسے بھرتے رہتے ہیں۔ دریاؤں سے زندہ مچھلیاں آجاتی ہیں لیکن اس میں گر کر مر جاتی ہیں۔ اس لیے اسے بحیرۂ مردار کہا جاتا ہے یعنی مُردوں کا سمندر اور اسے عبرت بنا دیا گیا ہے۔ آج بھی اس میں کوئی زندگی کے آثار نہیں ہیں۔ اس کے پانی میں اللہ کریم نے اتنے نمکیات پیدا کر دیے جس سے پانی بھاری بن گیا اور اس وجہ سے اب اس پر تیرنا آسان ہو گیا ہے۔

آج کل یہودی اس سے بڑا پیسہ کمار ہے ہیں۔ انہوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ اس میں تیرنے سے ہر قسم کی بیماری ٹھیک ہو جاتی ہے۔ لوگ انہیں پیسے دیتے ہیں اور یہ لوگ کپڑے اتار کر پہلے اس کیچڑ میں جو کناروں پر ہے خود کو لت پت کر لیتے ہیں۔ پھر اس جھیل میں کود جاتے ہیں تیر کر واپس آتے ہیں اور سمجھتے ہیں ٹھیک ہو جائیں گے۔ اس تیراکی پر یہودیوں نے ٹیکس لگا رکھا ہے اور خوب پیسہ کمار ہے ہیں۔ حیرت ہے کہ جہاں غضبِ الٰہی ہے وہاں لوگ صحت حاصل کرنے کی آرزو لے کر جاتے ہیں۔

حاصلِ کلام:

ان سارے قصوں کا حاصل یہ ہے کہ ارشاد ہے: قُلِ الْحَمْدُ ۔۔۔ فرما دیجیے سب خوبیاں اللہ ہی کو سزاوار ہیں۔

یہ جتنے قصے بیان کیے گئے اس کا حاصل یہی ہے کہ سب تعریفیں سب کمالات اللہ ہی کو زیبا ہیں۔ سب کا ماویٰ وملجا وہ واحد ولاشریک ہی ہے۔ اللہ کے علاوہ کوئی حمد کا مستحق نہیں ہے اس لیے کہ جس میں جو کمال ہے وہ اللہ ہی کا عطا کردہ ہے۔ کہیں کوئی کمال نظر آئے تو الحمد للہ ہی نکلے گا اور فرمایا: وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی ۔۔۔ اور اس کے بندوں پر سلام ہو۔

ان لوگوں کے لیے سلامتی ہے جن بندوں کو اللہ نے پسند کر لیا ہے۔ ان کے لیے سلامتی ہے جن کا کردار اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہے۔ جن کے عقائد اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمائے ہوئے عقائد کے مطابق ہیں جو تعلیمات نبوی پر یقین رکھتے ہیں اور پوری کوشش کرتے ہیں کہ اُن پر عمل پیرا بھی ہوں۔ ان لوگوں کے لیے سلامتی ہے۔ اس کے باہر سلامتی نہیں ہے۔ سلامتی اتباعِ رسالت میں ہے۔ اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ ہونے میں ہے۔

اللہ کا کوئی ہمسر نہیں:

فرمایا: آٰللّٰهُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ بھلا اللہ بہتر ہے یا جن کو یہ (اس کا) شریک ٹھہراتے ہیں۔

اللہ کریم کا کوئی ہمسر ہو ہی نہیں سکتا اور کوئی ہے ہی نہیں۔ کوئی کتنا بھی شرک کرتا رہے جتنے بھی معبودانِ باطلہ کی پوجا کرتا رہے وہ اللہ کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔ جن چیزوں یا ہستیوں کو لوگ اپنا مشکل کشا یا حاجت روا فرض کر لیتے ہیں اور جن پر تکیہ کر لیتے ہیں وہ خود سب محتاج ہیں۔

ساری مخلوق اپنی بقا کے لیے اپنے وجود کی سلامتی کے لیے محتاج رہتی ہے چہ جائیکہ کسی اور کی مدد کرے۔ سب محتاج ہیں۔ اللہ کا کوئی ہمسر نہیں اس کا کوئی شریک نہیں۔

بے شمار لوگوں کی اصلاح کا سبب بننے والی قرآن تفسیر

حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کی

اردو تفسیر آڈیو، وڈیو اور لکھی ہوئی تینوں طرح کی دیکھیں، سنیں یا ڈاؤن لوڈ کریں۔

پنجابی تفسیر وڈیوز دیکھیں ڈاؤن لوڈ کریں۔ قرآن کا اردو ترجمہ اور کتابیں ڈاؤن لوڈ کریں۔

قرآنِ کریم کی تلاوت اور حضرت صاحب کا اردو ترجمہ آڈیو۔ کمپیوٹر اور موبائل پر سننے کے

لیے ڈاؤن لوڈ کریں۔ حضرت جی کا کلام حمد اور نعتیں آڈیو وڈیو سنیں اور ڈاؤن لوڈ کریں۔

دلچسپ سوال جواب پر مشتمل ٹی وی پروگرام اَلمرشد کی تمام 125 اقساط کی وڈیوز دیکھیں

www.QuranTafseer.net

حضور نبی پاکؐ کے حضور آج بھی روحانی طور پر حاضری ممکن ہے اور ہزاروں مرد و خواتین یہ سعادت رکھتے ہیں۔ لیکن کیسے؟

تصوف تزکیہ روحانیت ، ذکر، روحانی سلسلہ، روح، کشف، بیعت ان تمام موضوعات کو سمجھنے

کے لیے حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کے وڈیو بیانات اور کتابیں موجود۔

طریقہِ ذکر جس سے دل سے لے کر جسم کا ہر باڈی سیل اللہ اللہ ذکر کرنے لگ جائے۔

حضور نبی پاک ﷺ کے حضور روحانی طور پر حاضری کی سعادت۔

یہ سب کچھ سمجھنے کے لیے اور مکمل رہنمائی کے لیے ویب سائیٹ وزٹ کریں۔

اس پوسٹ کو زیادہ سے زیادہ شیئر کر کے آپ بھی اس نیک کام کا حصہ بنیں۔